وما آتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا
(سورۃ الحشر ۷)
فتاویٰ
نواب محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ
القنوجی البخاری
ترتیب وحواشی
محمد اشرف جاوید
تسہیل
حبیب الرحمٰن خلیق
مکتبہ محمدیہ
www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فتاویٰ

نواب محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

القنوجی البخاری

۱۲۴۸ھ — ۱۳۰۷ھ

ترتیب وحواشی

محمد اشرف جاوید

تسہیل

مولانا حبیب الرحمن خلیق

ناشر

مکتبہ محمدیہ قذافی سٹریٹ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

Mob:0300- 4826023, Ph: 042-37114650

نام کتاب: **فتاویٰ**

نواب السید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

باہتمام ---------- عبدالرحمان عابد

طبع اول ---------- مئی 2013ء

تعداد ---------- 1100

قیمت ---------- 400/-

اسٹاکسٹ

طیبہ قرآن محل

مکہ سنٹر منشی محلہ گلی 5 امین پور بازار فیصل آباد

041-2629292,2624007

مکتبہ عائشہ صدیقہ اقبال مارکیٹ کمیٹی چوک راولپنڈی

051-5551014, 0321-5075075

اسلامی کتب خانہ ڈاکخانہ بازار چیچہ وطنی ضلع ساہیوال

0346-7467125,0301-4085081

مکتبہ محمدیہ قذافی سٹریٹ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

Mob.: 0300- 4826023,042-37114650

E:mail;maktabah_muhammadia@yahoo.com

&maktabah_m@hotmail.com

عرض مرتب

نواب صدیق حسن خاں عالم اسلام کی علمی شخصیات میں سے ایک تھے۔
ان کے علم وفضل کو عرب دنیا کے ساتھ ساتھ دوسرے اہل علم نے بھی خراج تحسین پیش کیا ہے، بلکہ برصغیر پاک وہند سے یہ وہ عالم دین ہیں جن کی عربیت کی تعریف علماء عرب نے بھی کی ہے۔

حضرت نواب والا جاہ شیخ الامام حسین محسن رحمہ اللہ یمانی سے فیض یافتہ اور مفتی ہند مولانا صدرالدین ازدہ کے تلمیذ خاص اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی جماعت کے نامور سپاہی تھے۔

حضرت نواب صاحب کوئی 230 کے قریب مختلف علوم وفنون (کتب) کے مصنف و مؤلف تھے۔علوم قرآنیہ کی مہارت ان کی تفسیر فتح البیان (عربی)، تفسیر لطائف البیان (اردو) واکسیر سے واضح ہوتی ہے، اور نشر حدیث، تراجم حدیث، حفظ حدیث کا شرف آپ ہی کے حصے میں آیا ہے آپ فکر سلف کے گل سرسبد تھے۔

فقہی بصیرت انتہائی پختہ تھی، بدور الاھلہ من ربط المسائل بالا دلۃ، ودلیل الطالب علی ارجع المطالب، روضۃ الندیہ، ان کا منہ بولتا ثبوت ہے، مذکورہ فتاویٰ بھی ان سے اخذ ہے۔

بلاخوف لومۃ لائم کہا جا سکتا ہے کہ آپ اس وقت کے فقید المثال بلکہ مجدد دین تھے ہم نے اس فتاویٰ کے شروع میں نواب صاحب کے مختصر حالات اور علم فتاویٰ اور فتاویٰ کا ذکر کر دیا ہے اس فتاویٰ کی تحقیق، حواشی راقم نے مرتب کیے اور فاضل دوست مولانا حبیب الرحمٰن خلیق نے تسہیل کا فریضہ سرانجام دیا۔

اس فتاویٰ کی اشاعت اول بہت پہلے لاہور سے ہوئی اب اشاعت ثانی مکتبہ محمدیہ کی طرف سے ہو رہی ہے امید ہے کہ یہ فتاویٰ اہل علم وعوام الناس کے لیے رحیق، عنبر ثابت ہوگا اور ہمارے وناشر کے لیے نجات کا سبب ہوگا۔ ان شاء اللہ

خادم دین اسلام

محمد اشرف جاوید بن محمد صدیق آل عبدالرحمٰن

08-04-2013

فہرست

- نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ (تعارف و حالات) 15
- کچھ فتاویٰ جات کے بارے میں 41
- لغوی معنی 41
- اصطلاح 41
- فتویٰ نویسی 42
- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور فتویٰ 44
- عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے مفتی 45
- مدینہ کے مفتی 46
- مکہ کے مفتی 46
- کوفہ کے مفتی 46
- بصرہ کے مفتی 46
- شام کے مفتی 46
- مصر کے مفتی 47
- دوسری صدی 47
- دوسرا گروہ اہل الرائے 47
- احناف کے مشہور فتاویٰ 53
- فتاویٰ عالمگیری اور فتاویٰ تاتارخانیہ 53
- غیر مطبوع 54
- امام العز بن عبد السلام رحمہ اللہ 55
- تقی الدین سبکی رحمہ اللہ 55
- الفتاویٰ الحدیثیة اور الفتاویٰ الفقهية 56
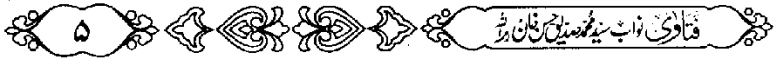
❀ علمائے شافعی کے فتاویٰ 56
❀ علمائے مالکی کے فتاویٰ 57
❀ حنبلی علماء کے فتاویٰ 59
❀ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا فتاویٰ 61
❀ برصغیر پاک و ہند کے مطبوع و غیر مطبوع فتاویٰ 65
❀ الفتاویٰ السراجیہ 66
❀ فتاویٰ قاری الہدایہ 66
❀ الفتاویٰ التاتارخانیہ 66
❀ فتاویٰ ابراہیم شاہیۃ 67
❀ حسب المفتی 67
❀ فتاویٰ اکبر شاہی 67
❀ الفتاویٰ النقشبندیہ 67
❀ جنگِ مسائل 67
❀ الفتاویٰ الشرفیہ 67
❀ فتاویٰ الشرفیہ 67
❀ فتاویٰ مختصر شافعی 68
❀ فتاویٰ تاتارخانیہ 68
❀ فتاویٰ حمادیہ 69
❀ فتاویٰ عالمگیری 69
❀ فتاویٰ ابراہیم شاہی 72
❀ فتاویٰ امینیہ 73
❀ فتاویٰ بابری 73
❀ مطبوعہ فارسی کتب فتاویٰ 74

❀ دیوبندی حنفی فتاویٰ 75
❀ فتاویٰ عبدالحیٔ 75
❀ مولانا خلیل احمد سہارنپوری 75
❀ مولانا عبدالرحمٰن دیوبندی 77
❀ مفتی کفایت اللہ دہلوی 78
❀ اہل حدیث کے فتاویٰ 80
❀ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ 81
❀ شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ 81
❀ مولانا سعید بنارسی 84
❀ مولانا امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ 84
❀ امام حافظ مولانا عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ 85
❀ فاتح قادیان شیخ الاسلام ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ 85
❀ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ 86
❀ امام انقلاب مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ 86
❀ محقق زماں امام العصر مولانا شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ 88
❀ چند ایک فتاویٰ کا مختصر تعارف 94
✱ احکام قربانی 99
❀ مسافر کی قربانی 101
❀ حجامت 102
❀ قربانی کا وقت 102
❀ قربانی کے جانور کی عمر 104
❀ مسنہ 104
❀ جذعہ 105

❀ قربانی کے جانور کی صفات 106
❀ قربانی کا جانور خریدنے کے بعد عیب کے پیدا ہو جانے کا حکم 109
❀ خصی جانور کا حکم 110
❀ قربانی کا گوشت کھانا اور دوسروں کو کھلانا 111
❀ قربانی کی کھال کا مصرف 111
❀ اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام 113
* **احکام عقیقہ** 114
❀ عقیقہ کا حکم 114
❀ احناف کے نزدیک عقیقہ کا حکم 115
❀ عقیقہ کا وقت 116
❀ عقیقہ کے گوشت کا حکم 121
❀ اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام 123
❀ قربانی وعقیقہ کی کھال کے تصرف واستعمال کا حکم 126
* **احکام ومسائل صدقۃ الفطر** 129
* **صدقۃ الفطر کا حکم** 129
❀ صدقہ فطر کس پر فرض 132
❀ غلام کا صدقہ فطر 133
❀ صدقہ فطر کی ادائیگی کا وقت 134
❀ صدقہ فطر میں کون سی چیزیں ادا کی جائیں 136
❀ صدقہ فطر کی مقدار 136
* **احکام صاع (یعنی پیمانہ)** 139
* **جماعت کھڑی ہونے کی صورت میں سنتِ فجر ادا کرنے کا طریقہ** 144
❀ آثار صحابہ رضی اللہ عنہم 145

- سنت فجر کے بعد لیٹنا 149
- سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا انکار 151

لڑکے اور نابینا کے پیچھے نماز پڑھنا 153

- نابینا کی امامت شرعاً درست ہے 153
- فقہ حنفی سے دلیل 155
- لڑکے کی امامت 157

ولد الزنا کے پیچھے نماز پڑھنا 159

- کیا ولد الزنا اسلام سے خارج ہے؟ 159
- ولد الزنا جنتی یا دوزخی 161
- ولد الزنا کی امامت کیسی ہے؟ 162
- امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک 162
- اس کی امامت کو مکروہ کہنے والے اور ان پر ردّ 162

مفقود الخبر کے بارے میں 167

- اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام 170

مساجد میں جگہ مخصوص کرنا 171

- مسجد میں جگہ روکنے کا عدم جواز 171
- پہلے سے بیٹھنے والے کو اٹھانا ناجائز ہے 172
- خلاصہ کلام 173

محفل میلاد و فاتحہ خوانی 177

- محفل میلاد وغیرہ کا انعقاد بدعت ہے 177
- اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام 178

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کی شرعی حیثیت 181

- علم غیب صرف اللہ کی صفت ہے 181

❀ رسول اللہ ﷺ عالم غیب نہیں 183

❀ یارسول اللہ ﷺ کہنے والوں کے دلائل اوران کا رد 184

✱ انگوٹھے چوم کرآنکھوں سے لگانا 187

❀ انگوٹھے چومنا بدعت ہے 188

❀ شاہ عبدالعزیز اور دوسرے کبائر علماء رحمہم اللہ کے اقوال 188

❀ اذان کے بعد ''محمد رسول اللہ'' (ﷺ) کا اضافہ کرنا 190

❀ اذان کے جواب کا مسنون طریقہ 191

❀ اقامت کے جواب کا مسنون طریقہ 192

✱ نابالغہ کی ولایت کا حکم 195

❀ ولی کی تعریف اوراس کی صفات 197

❀ خلاصہ کلام 198

✱ رفع الیدین کرنے والے اور جوتا پہن کر نماز پڑھنے والے کو مسجد سے نکال دینا ثواب ہے یا گناہ! 201

❀ مسجد میں نماز پڑھنے سے روکنا چوری وغیرہ سے بھی بڑا جرم ہے 201

❀ مسلمان سے ترکِ کلام پر وعید 202

❀ اللہ اور رسول ﷺ کے کسی حکم کو مکروہ جاننے والا کافر ہے 203

❀ ثبوت رفع الیدین 206

❀ نبی کریم ﷺ کا حکم، اللہ کا حکم 207

❀ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کو برا جاننے سے کفر کا لازم آنا اور اعمال کا ضیاع 207

❀ جوتے پہن کر نماز پڑھنے کی دلیل 207

❀ عمرو نے قسم کھائی کہ اگر میں زید سے کلام کروں تو میری بیوی کو طلاق 208

❀ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قبروں سے پکارنے والے شخص سے مکالمہ 210

❀ کیا شہید اور ولی ایک حکم میں ہیں؟ 210

❀ شہداء کی زندگی کیسی ہے؟ 211
✱ **جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے کے کفر سے متعلق** 212
❀ نماز کی فرضیت، اہمیت اور وعید 213
✱ **استفتاء** 214
❀ عمداً نماز چھوڑنے والے کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم ومحدثین وفقہاء رحمہم اللہ کی آراء 214
❀ بے نماز کی نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے 215
❀ اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام 215
✱ **شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا وِرد، بغداد کی طرف رخ کر کے گیارہ قدم چلنا اور پیرانِ پیر کی گیارھویں دینے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم** 217
❀ آیات مبارکہ 218
❀ احادیث شریفہ 219
❀ فقہی روایات 220
✱ **ایک امام کی تقلید کرنے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم** 228
❀ عقائد 229
❀ عملیات 230
✱ **جماعت کھڑی ہو جانے کے بعد سنتوں کے پڑھنے کا حکم** 233
❀ جماعت قائم ہونے کے بعد سنتیں پڑھنے کا عدم جواز (فقہاء کی نظر میں) 233
❀ جماعت کھڑی ہونے کے بعد سنتوں کی ممانعت احادیث کے تناظر میں 237
❀ فقہاء کے اقوال 241
❀ سنت فجر کا استثنیٰ اور حدیث کے طرق 243
❀ گوشۂ مسجد میں سنتیں پڑھنے کی دلیل اور اس کا جواب 246
❀ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے عمل کا جواب 247
❀ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا عمل 248

❀ احناف کا نہی کی تاویل اور ان کا ردّ 248

❀ جماعت کھڑی ہونے کی صورت میں سنتیں نہ پڑھنے میں حکمت 251

❀ فجر کی سنتیں رہ جانے کی صورت میں ان کی ادائیگی کا وقت 252

❀ طلوع آفتاب کے بعد 252

❀ سنتوں کی ادائیگی فرضوں کے بعد 253

❀ مرسل حدیث احناف کے ہاں حجت ہے 254

✱ عورتوں کے لیے سونا چاندی پہننا 259

❀ عورتوں کے لیے سونا و چاندی پہننے کے جواز میں کتاب وسنت سے دلائل 259

❀ زیور کے معاملہ میں نبی کریم ﷺ کا اپنے تئیں ابوزرع سے تشبیہ دینا 265

❀ قرط، شنف اور بالی کی وضاحت 267

❀ حلی سونے چاندی کے لیے عام ہے 267

❀ عورتوں کے لیے ریشم کا باب 270

❀ سونے کا زیور عورت کے لیے بوجوہ یقیناً جائز ہے 274

❀ رسول اللہ ﷺ کا ازواجِ مطہرات کو زیور پہننے سے روکنا 279

❀ لباس، زیبائش اور برتن وغیرہ 287

❀ ابوداوٗد کی وعید نازوالی احادیث کی اسنادی حیثیت 290

❀ نسائی کی حدیث کی اسنادی حیثیت 292

❀ امام نسائی کا سند سے وہم کا ازالہ 293

❀ عدم جواز پر استدلال اور اس کا جواب 295

✱ دوزخیوں کا ہمیشہ دوزخ میں رہنا 305

❀ دوزخیوں کے لیے لامتناہی عذاب 305

❀ کفار سے انقطاع عذاب کی توجیہات 307

❀ ایک شبہ اور اس کا ازالہ 310

❀ دوزخ کا دوزخیوں سے خالی ہو جانا 311
✱ **فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا** 314
❀ دعا میں مطلق ہاتھ اٹھانے کے دلائل 314
❀ دعا کے بعد ہاتھوں کا چہرے پر پھیرنا 315
❀ دعا میں ہاتھ اٹھانے کے خاص مقامات 316
❀ فرض نماز کے بعد دعا کرنا 318
❀ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی رائے 320
❀ فرض نماز کے بعد دعا کا واقعہ 322
✱ **نماز جمعہ کی شرائط** 323
❀ جمعہ کے لیے مخصوص عدد اور جامع وغیرہ کی شرط 323
❀ راجح مذہب اور اس کے دلائل 325
✱ **ربا (سود) کی تخصیص چھ اشیاء میں** 327
✱ **ھنڈوی کا حکم** 330
✱ **"نسخ السنۃ بالقرآن" کا مفہوم** 333
✱ **قرآن سے سنت کا منسوخ ہو جانا** 333
✱ **بلا عذر فوت شدہ نماز کی عدم قضا** 335
✱ **امام غزالی رحمہ اللہ کا انتہائے عمر میں فلسفہ چھوڑ کر قرآن وحدیث سے لگاؤ رکھنا** 336
❀ امام غزالی رحمہ اللہ کے متعلق ابن تیمیہ اور ابن عربی رحمہما اللہ کی آراء 336
❀ احیاء میں چار فاسد مواد 337
❀ امام غزالی کے حق میں بعض مفکرین کی آراء 338
✱ **جادو سیکھنے کا حکم** 340
❀ جادوگر کی سزا 341

* علم نجوم سیکھنے کا شرعی حکم 343
  - ستاروں کی پیدائش کا مقصد 344
  - علم نجوم سیکھنے والے کا حکم 345
* بھائی کو قتل کر کے اس کی بیوی سے نکاح کرنا 347
* بیع وفا رہن ہے بیع نہیں 348
* وصیت میں ورثاء کو نقصان پہنچانا 349
  - وصیت میں ضرر کی شکلیں 350
* حائضہ کی اس نماز کا حکم جس کے آخر وقت میں پاک ہو 351
* ''خلق اللہ آدم علی صورتہ'' کا مفہوم 352
* بیعت کا حکم 355
* مرض میں ضرر کا اندیشہ نہ ہو تو تیمّم ناجائز ہے 356
  - کیا سفر اور مرض میں تیمّم جائز ہے 357
* طاعون و وبا میں ہر نماز میں دعائے قنوت پڑھنے کا جواز 360
  - طاعون کی لغوی تحقیق 360
  - طاعون کی تفسیر میں اطباء کے اقوال 361
  - طاعون کے متعلق اہل شرع کے اقوال 361
  - طاعون کی وبا کی حقیقت 363
  - جنون کا نیزہ ہونے سے متعلق ابن الجوزی رحمہ اللہ کی رائے 365
  - ''ہوا کے جوہر کے فساد سے طاعون'' کہنے والوں کا رد 365
  - امام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا اطباء پر ردّ 366
  - امام ابن القیم رحمہ اللہ کا ردّ اور طاعون سے محفوظ رہنے کا طریقہ 367
  - طاعون سے محفوظ رہنے کا طریقہ 367
* غنیۃ الطالبین میں اصحاب ابوحنیفہ کو فرقہ مرجیہ میں ذکر کرنے کا مفہوم 369

* حضر میں جمع بین الصلوٰتین کا حکم 376
  * جمع بین الصلوٰتین والی حدیث کی اسنادی حیثیت 378
  * حدیث جمع کی توجیہات 378
  * راجح مذہب 379
  * حاصل کلام 384
* زمان ومکان اور حال کے اختلاف کے باعث فتویٰ میں تبدیلی کرنا 385
  * نص شرعی کے خلاف فتویٰ دینا حرام ہے 385
  * نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ جات میں اختیار ہے 386
* زمین کے طبقات اور ہر طبقہ میں نوع انسانی اور انبیاء کی بعثت کی حقیقت 388
  * زمین کے سات طبقات کی دلیل 389
  * طبقات ارض کی کیفیت 390
  * زمین کے طبقات میں نوع بشر اور انبیاء علیہم السلام کا عدم وجود 391
  * سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب روایات کے دس جوابات 393
  * قسطلانی کی رائے 396
  * خبرِ احادیث سے آیت کی تخصیص کا مفہوم 399

نواب محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

(تعارف وحالات)

محی السنۃ نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ اٹھارہویں صدی کے ایک نامور عالم، شہرہ آفاق مصنف، عادل و بے مثال حاکم اور جید محدث ہیں۔ آپ نے اپنی تمام زندگی قرآن و سنت کے اتباع اور احیاء سنت کی جدوجہد میں گزاری۔

آپ ایسی نابغہ روزگار شخصیت اور متبحر عالم روز روز پیدا نہیں ہوتے بلکہ تاریخ صدیوں ایسی عبقری شخصیتوں کا انتظار کرتی ہے اور ان کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے کہ دنیا کئی صدیاں اس غم میں گزار دیتی ہے۔ بلاشبہ آپ ایسی صلاحیتوں اور اعلیٰ قابلیت کے حامل انسان کو جو علم وعمل کا منبع، فکر و دانش کا محور، بیک وقت عالی شان خطیب، بے مثال ادیب، فصیح اللسان شاعر، کہنہ مشق استاد، نامور محدث، مایہ ناز مفسر، عظیم فقیہ، مثالی حکمران اور فقید المثال مصنف ومؤلف کو پیدا کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔

حالاتِ زندگی اور تعلیمی اسفار

پیدائش:

آپ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ ہجری بمطابق ۱۴- اکتوبر ۱۸۳۲ء بروز اتوار بوقت چاشت، بانس بریلی میں سید اولاد حسن کے گھر پیدا ہوئے۔ بانس بریلی آپ کا ننھیالی شہر تھا۔ جب کہ آبائی وطن قنوج ہے۔ اسی بنا پر آپ قنوجی بھی کہلاتے ہیں۔ پیدائش کے چند روز بعد آپ کو آپ کی والدہ محترمہ قنوج لے آئیں۔ آپ اپنی جائے پیدائش کے بارے میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؏

بلاد بها حل الزمان تمامی
و اول ارض مس جلدی ترابها

نام ونسب:

آپ کا نام نامی صدیق حسن بن اولاد بن علی بن لطف اللہ حسینی بخاری قنوجی

آپ کی کتب میں موجود ہے۔ بعض معاصرین نے آپ کے نام سے پہلے محمد کا اضافہ کیا ہے۔ وہ ''محمد صدیق حسن خان'' لکھتے ہیں۔

آپ نجیب الطرفین تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب تینتیس (۳۳) واسطوں سے سرورِ کونین جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ اسی لحاظ سے آپ کا شمار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد و احفاد میں ہوتا ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔

''صدیق بن حسن بن علی بن لطف اللہ بن عزیز اللہ بن لطف علی بن علی اصغر بن سید کبیر بن تاج الدین بن جلال رابع بن سید راجو شہید بن سید جلال ثالث بن حامد کبیر بن ناصر الدین محمود بن جلال الدین بخاری معروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت بن احمد کبیر بن جلال اعظم گل سرخ بن علی موید بن جعفر بن احمد بن محمد بن عبداللہ بن علی اشقر بن جعفر زکی بن علی نقی بن محمد تقی بن علی رضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن محمد باقر بن علی زین العابدین بن حسین سبط رسول بن فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔''

آپ کے آباء واجداد دینی و دنیوی اعتبار سے بلند مقام پر فائز تھے۔ ان میں سے بعض کا شمار اہل علم اور صلحائے امت میں ہوتا ہے جب کہ بعض مال و دولت اور دنیوی جاہ وجلال سے مالا مال تھے۔ اس کا تذکرہ آپ اس طرح فرماتے ہیں:

''میرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین تینتیس نفوس کا واسطہ ہے اور ان میں سے آٹھ ائمہ اہل بیت ہیں، جن کا شمار ائمہ اثنا عشریہ میں ہوتا ہے۔ پھر جعفر زکی سے لے کر جناب مخدوم جہانیاں بلکہ جلال رابع تک غالباً تمام اولیاء وصلحاء تھے اور سید تاج الدین سے لے کر جد امجد علی بن لطف اللہ تک تمام اہل دولت ہوئے ہیں۔ میرے دادا جو سید اولاد علی خان کے نام سے مشہور ہیں، انہیں ریاست حیدر آباد دکن سے نواب انور جنگ بہادر کا خطاب ملتا تھا اور وہ پانچ لاکھ روپیہ سالانہ کا علاقہ اور ایک ہزار سوار اور پیادہ رکھتے تھے۔ میرے نانا مفتی محمد عوض ساکن بانس بریلی عالم عارف باللہ، صحیح النسب قریشی اور خلیفہ سوم سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا اپنی جگہ مضبوط نسب نامہ ہے۔ آصف الدولہ والی اودھ ان

کو نذر دکھلاتے تھے۔ میرے والد سید اولاد حسن رحمہ اللہ نے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہما سے علم حاصل کیا اور شاہ عبدالقادر صاحب موضح القرآن کو دیکھا اور شاہ عبدالعزیز کے خلیفہ حضرت سید احمد ساکن رائے بریلی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ عالم باعمل تھے۔ کلکتہ سے لاہور شمال سے دکن تک کے اکثر علماء و امراء آپ سے واقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے نصائح میں نہایت اثر ودیعت فرمایا ہوا تھا، چنانچہ قنوج و اطراف قنوج کے دس ہزار سے زیادہ آدمی ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔"

کنیت و لقب:

نواب صدیق حسن رحمہ اللہ اپنے حالاتِ زندگی لکھتے ہوئے اپنی کنیت ابوالطیب لکھتے ہیں اور اس کنیت کی وجہ بتاتے ہیں کہ حج کا سفر تھا، میں بیت اللہ کے قریب کھڑا تھا اور میں نے حطیم کی مٹی کی خوشبو سے اپنے آپ کو معطر کیا تھا اور اسی جگہ کو ٹھہرنے کے لیے منتخب کیا تھا تو اس بنا پر میں اپنے آپ کو ابوالطیب کہتا ہوں۔ اور پھر آپ نے آخری زندگی میں اپنی کنیت ابوالوفاء رکھی۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی یہ دو کنیتیں ہیں لیکن آپ کی پوری حیات مبارکہ میں آپ کی کوئی کنیت معروف نہیں ہوئی۔

جہاں تک لقب کا تعلق ہے تو آپ نے پہلے پہلے "روحی" کا لقب اختیار کیا۔ لیکن دوسرے لوگوں نے آپ کو مجدد کا لقب دیا۔ جب آپ ایوانِ حکومت میں داخل ہوئے تو آپ کو خان کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ بعد ازاں آپ حکومتی القاب میں سے اہم ترین لقب نواب اور والا جاہ کے سزاوار ٹھہرے۔ یہ لقب حکومتی القاب میں سب سے اہم، بڑا اور ریاستی عظمت کا نشان تھا۔ جو مسلمانوں کے رہنما کے لیے چنا گیا اور اس کے بعد آپ کو ارضِ ہندوستان میں انتہائی عظمت کا نشان سمجھا گیا اور آپ کا لقب رتبے کے اعتبار سے برطانیہ کے استعماری عہد میں امیر ہندوستان کے لیے وضع کیے گئے لقب "مہاراجہ" کے مساوی تھا۔

بعد ازاں ملکہ بھوپال شاہ جہاں بیگم نے آپ کو یہ لقب دیئے "نواب صاحب، والا جاہ، امیر الملک، سید محمد صدیق حسن خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ۔"

لیکن نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ ان فخریہ القاب اور حکومتی خطابات کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ آپ دنیا اور اہل دنیا کی صحبت سے نفرت کرتے تھے اور آپ کی طبیعت میں انتہائی زیادہ انکساری تھی۔ آپ انبیاء علیہم السلام کی وراثت پر فخر کرتے تھے اور علم کی نسبت سے منسوب ہونے کو پسند کرتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ نواب کا لقب، رب کائنات کی طرف سے عتاب کا باعث اور میدانِ محشر میں ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے اور یہ حکومت و ولایت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی آزمائش ہے۔

ابتدائی حالات:

ابھی آپ نے اپنی عمر کی پانچ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ آپ کے والد محترم سید اولاد حسن داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ان معصومانہ ایامِ طفولیت میں شفیق اور نامور عالم، باپ کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا اور پُرحسرت و اندوہ یتیمانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ والد گرامی کی وفات کے باوجود آپ نے عمدہ اور نفیس ماحول میں پرورش پائی اور والدہ محترمہ جو کہ عظیم عالم، مفتی عوض علی (بانس بریلی) کی نہایت نیک، اعلیٰ عادات و اطوار کی مالک، اخلاق حسنہ کی پیکر اور اتباع سنت کی حامل خاتون تھیں، کی سرپرستی اور گود میں پرورش پائی۔ جنہوں نے اپنی کسمپرسی اور عسر و تنگدستی کی حالت کے باوجود آپ کی اعلیٰ تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور اپنی ہمت سے بڑھ کر آپ کی تعلیم و تربیت اور آپ کے اخلاق و کردار سازی پر توجہ دی۔ وہ آپ کی دینی تربیت اور بالخصوص نماز اور ذکر و اذکار پر خصوصی توجہ دیتی تھیں۔ نواب صاحب فرماتے ہیں:

> ”میں سات برس کا تھا، میرے گھر کے دروازے پر مسجد تھی، مجھے خوب یاد ہے کہ صبح کے وقت اذان ہوتے ہی والدہ محترمہ مجھے بیدار کر دیتیں اور وضو کرا کر مسجد میں بھیج دیتی تھیں اور گھر میں نماز کبھی نہ پڑھنے دیتی تھیں، اگر نیند کی سستی کی وجہ سے نہ اٹھتا تو منہ پر پانی ڈال دیتی تھیں۔ اس وجہ سے بچپن ہی سے نماز کی عادت پڑ گئی، شاید دس برس کی عمر میں والدہ نے روزہ رکھوایا اور اس وقت سے روزہ رکھنے کی عادت پڑ گئی۔“

والدین کا ادب واحترام:

نواب صاحب کے والد محترم چونکہ آپ کے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے اور آپ نے سن شعور میں اپنی والدہ محترمہ کو پایا۔ اس لیے آپ اپنی والدہ محترمہ کی بڑی خدمت کرتے اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے اور آپ اولاد پر والدہ کی خدمت وتعظیم کو والد کے حق پر تین گنا زیادہ کی نسبت سے خیال کرتے ہوئے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کرتے تھے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

''میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری والدہ۔ اس نے کہا: پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار فرمایا: تیری والدہ۔ اس نے کہا: پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری والدہ۔ اس نے کہا: پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرا والد۔''

ایسے ہی ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

((أُمَّكَ ثُمَّ أُمَّكَ ثُمَّ أُمَّكَ ثُمَّ أَبَاكَ ثُمَّ أَدْنَاكَ ثُمَّ أَدْنَاكَ))

''تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیرا باپ، پھر تیرا اقربی، پھر تیرا اقربی۔''

نواب صاحب ہمیشہ اپنی والدہ کی خدمت واطاعت اور ان کی رضا جوئی کے لیے کوشاں رہتے تھے، فرماتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو مجھے اس قدر بکثرت مال عطا فرمایا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ میں نے حتی الامکان اپنی والدہ ماجدہ کو خوش رکھنے کی کوشش کی ہے اور میں ان کے سامنے اس طرح رہا ہوں جیسے کوئی کنیز یا غلام اپنے آقا کے سامنے رہتا ہے۔''

آپ اپنے والد مرحوم کے بارے میں بھی والدہ محترمہ کی طرح خدمت بجا لانے اور اطاعت شعار ہونے کے ارادہ کا تذکرہ کرتے ہیں اور اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے محبت کے عملی اظہار اور انہیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنے کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا ورنہ حتی المقدور ان کی خدمت بجا لانے میں

بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا...... میں نے والدہ محترمہ سے سنا ہے کہ والد مرحوم مجھ سے بہت محبت کیا کرتے تھے بلکہ ساری اولاد میں سے میرے ساتھ زیادہ محبت کرتے تھے اور میرے لیے علم اور نیکی کی بکثرت دعائیں فرمایا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ان کی دعاؤں کا اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے علم وافر اور رزق واسع سے نوازا ہے۔ میں نے اپنے والدین، بھائی اور بہنوں کی طرف سے حج کرادیا ہے......نفقات اور دیگر نیکیوں کا اجر انہیں ان شاء اللہ ضرور ملے گا۔''

آپ کی والدہ محترمہ کا انتقال ۲۴ محرم ۱۲۸۵ ہجری بروز پیر نماز مغرب کے بعد بھوپال میں ہوا۔ آپ لکھتے ہیں:

''مجھے خوب یاد ہے کہ اس دن انہوں نے مغرب کی نماز لیٹ کر پڑھی اور حالت مرض میں سورۃ اخلاص پڑھتی رہتی تھی، زندگی بھر صرف اس دن عشاء کی نماز وقت اجل کے آجانے کے باعث فوت ہوئی۔ غسل اور تکفین کے بعد جب میں نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا تو ان کے چہرہ کا رنگ زرد تھا۔ اہل علم کی صراحت کے مطابق یہ حسن خاتمہ کی علامت ہے۔ آپ کی قبر میرے خسر مدار المہام صاحب بہادر کے باغ کے متصل ہے۔ اللهم اغفرلي ولها مغفرة ظاهرة و باطنة لا تغادر ذنبا۔''

نواب صاحب کی والدہ محترمہ زندگی بھر آپ سے خوش رہیں اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی خوش تھیں۔ آپ نے اپنی والدہ مرحومہ کی طرف سے ایک سرائے، ایک کنواں اور ایک مسجد تعمیر کروائی۔

خَلقی و خُلقی اوصاف:

نواب صاحب مرحوم درمیانے قد، سفید رنگت، بھرے بھرے گال، تیکھی ناک، چوڑا چہرہ و پیشانی، خوبصورت داڑھی اور خوشنما و دلکش شکل وصورت کے مالک تھے۔ آپ کے کندھوں کے درمیان نسبتاً زیادہ چوڑائی تھی اور داڑھی لمبی نہ تھی۔ آپ بلند آواز رکھنے کے ساتھ ساتھ شیریں بیان اور وجیہہ و بارعب شخصیت کے حامل تھے۔ نیز ذہین وفطین، منفرد حافظہ وفہم

اور اعلیٰ بصیرت و کامل استعداد کے ساتھ ساتھ فیاض طبیعت، راسخ عزم، اعلیٰ اخلاق، وافر علم، عمدہ تحریر، باصلاحیت اور حکمت سے آشنا منتظم و مدبر، مسلسل جدو جہد کے خوگر اور خالص عقیدہ سے متصف تھے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر حسن عطا کیا تھا کہ دیکھنے والے آپ کو دیکھتے ہی رہ جاتے۔ آپ کی خوبصورتی کے حوالے سے صاحب مآثر نے یہ واقعہ درج کیا ہے کہ آپ کے زمانہ قیام بلگرام میں آپ دریائے گنگا پر نہار ہے تھے کہ سکھوں کا ایک قافلہ یہاں آ گیا، انہوں نے آپ کی سفید سرخی مائل رنگت دیکھ کر انگریز کا گمان کیا اور مارنے کے لیے بندوق کی نالی سیدھی کر لی۔ ایک کسان دوڑا اور اس نے چلا کر کہا یہ انگریز نہیں حضرت اولاد حسن صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ میں انہیں کئی سالوں سے جانتا ہوں۔

تعلیم وتربیت اور تعلیمی اسفار:

آپ نے اپنی والدہ محترمہ کی آغوش میں نہایت عمدہ اور نفیس ماحول میں پرورش پائی۔ آپ کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ آپ کے پاس والد محترم کی وفات کے وقت کل پونجی چند قطعات زمین و باغات تھے اور ان کے علاوہ گھر میں موجود کتب خانہ تھا۔ کتب خانہ کی کتابوں کو دھوپ دینے کے لیے جب آپ کا خاندانی ملازم شیخ حسینی انہیں دھوپ میں رکھتا تھا تو آپ ان کتابوں کو الٹ پلٹ کرتے اور ان کی ورق گردانی کرتے اور شوق سے انہیں پڑھنے کی کوشش کرتے حالانکہ اس وقت آپ کو کتابیں پڑھنا نہیں آتی تھیں اور نہ ہی آپ علم اور کتابوں کی اہمیت سے آشنا تھے۔

کتابوں کی ورق گردانی سے آپ کے اندر پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور آپ کی علم وعمل سے مزین والدہ محترمہ آپ کے شوق علم کو پروان چڑھاتی رہیں اور آپ کے لئے ایک استاد مقرر کر دیا۔ آپ نے ان سے ایک دو پارے قرآن مجید کے پڑھے، قرآن کی باقی تعلیم آپ نے اپنی بلوغت کی عمر میں حاصل کی، فارسی میں شیخ سعدی کی ''کریما'' چند اوراق ''بوستان'' کے اور دو باب ''گلستان'' کے پڑھے۔ اس تعلیم سے آپ میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ آپ اس وقت کی کتابیں پڑھنے کے قابل ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے خود ہی فارسی کی مختلف کتب کا

مطالعہ کیا اور ان کتب سے اچھے فقرے اور جملے یاد کر لیے۔ ان کتب کی ورق گردانی اور فقرات کے یاد کرنے سے علم کا ایک ایسا شوق دامن گیر ہوا کہ جو کتاب، قصہ، داستان خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں ہاتھ لگا اول سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ یہاں تک کہ فسانہ عجائب، مثنوی میر تقی میر، یوسف زلیخا، سکندر نامہ اور دیگر مشہور دواوین فارسی و اردو سب کا مطالعہ کیا اور ان سب کتابوں سے "خذ ماصفاع ودع ماکدر" کے تحت اچھی اور کار آمد باتیں اخذ کیں اور انہیں یاد کر لیا۔ اس طرح آپ میں ابتدائے عمر میں ہی کافی استعداد و صلاحیت پیدا ہو گئی۔

آپ نے خوشخطی کی تعلیم با قاعدہ کسی خطاط یا استاد سے حاصل نہیں کی اور نہ کبھی کسی خوش نویس سے اصلاح لی تھی۔ آپ کا خط محض طبعی تھا۔ ابتداء میں جلی قلم سے لکھا کرتے تھے لیکن عمر کے آخری حصہ میں باریک قلم سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ گویا زود نویسی آپ کو ورثہ میں ملی تھی لیکن اس کو جلا بخشنے اور نکھارنے کے لیے آٹھ ورق روزانہ لکھنا آپ کا زندگی بھر کا معمول تھا۔

نواب مرحوم نے میزان منشعب، میزان الصرف، تصریف زیدہ شرح تہذیب اور مختصر معانی وغیرہ اپنے بھائی سید احمد حسن عرشی سے پڑھیں، اس کے بعد آپ کے والد مرحوم کے ایک عقیدت مند سید احمد علی اپنے ساتھ آپ کو فرخ آباد لے گئے۔ آپ وہاں چند ماہ رہے اور مولانا محمد حسین اور دیگر اساتذہ سے کافیہ، شرح جامی، قطبی، میر قطبی، افق المبین، درمختار اور مشکوۃ المصابیح پڑھیں، بعد ازاں آپ کو آپ کے والد محترم کے مرید کانپور لے گئے اور آپ نے کانپور میں ملا محمد مراد بخاری اور مولوی محمد محب اللہ پانی پتی سے کسب فیض کیا۔

سفر دہلی:

آپ فرخ آباد اور کانپور کی اعلیٰ علمی مجالس میں شریک ہوتے رہے جس سے آپ کی علمی صلاحیتیں مزید نکھرتی رہیں۔ بالآخر آپ قاضی کلو کے مشورے سے ان کے ہمراہ دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی کو برصغیر میں دارالحکومت ہونے کے علاوہ ایک بلند علمی مقام بھی حاصل تھا اور دہلی ہمیشہ سے علوم وفنون اور ادباء وشعراء، واعظین وخطباء اور فقہاء ومحدثین کا مرکز ومرجع رہا ہے۔ آپ نے دہلی میں مولانا بشیر الدین قنوجی مرحوم کے ہاں کئی روز تک قیام کیا پھر آپ نواب مصطفیٰ خان بہادر کے محل میں دو سال قیام پذیر رہے، نواب مصطفیٰ صاحب ثروت و

دولت ہونے کے باوجود نہایت صابر و شاکر، عابد و زاہد اور درویش و قانع انسان تھے، اس بنا پر آپ کو یہاں انتہائی سکون و اطمینان حاصل ہوا۔

آپ نے اس قیام کے دوران شہرہ آفاق محدث مفتی محمد صدر الدین خان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے اور ان سے تمام علوم و فنون کی کتب سبقاً پڑھیں اور سند فراغت حاصل کی۔ دوران تعلیم آپ نے بعض کتب اور حواشی اپنے ہاتھ سے نقل کیے۔ مثلاً اردو ترجمہ منہیات ابن حجر مکی، حبل المتین، اربعین فی اصول الدین، علاوہ ازیں آپ نے تالیف و تصنیف کا کام بھی شروع کر دیا اور مختصر المیز ان کی ایک مختصر شرح عربی زبان میں تحریر کی۔ نیز آپ نے دوران تعلیم، درس و تدریس کا بھی آغاز کر دیا اور طلبہ کو بعض درسی کتابیں بھی پڑھائیں اور علوم متداولہ سے فراغت پائی۔

نواب صاحب نے قیام دہلی کے ان دو برسوں میں اہل علم و محدثین کی ملاقاتوں سے بھی خوب استفادہ کیا اور امراء سلطنت کی مجالس میں بھی شریک ہوئے۔ جن سے آپ کو آداب مجالس اور آئین دربار سے شناسائی ہوئی اور سلطنت مغلیہ کے آخری فرماں روا کے جاہ و جلال اور ان کی تباہی کا زمانہ دیکھنے کا موقع ملا، آپ نے ان متضاد واقعات و مشاہدات سے کئی قسم کی عبرتیں اور تجربات حاصل کیے جن سے لطائف و انعام ربانی کے رموز اور قہر و غضب ربانی کے اسرار و غوامض آپ پر آشکارا ہوئے اور علمی جدوجہد کی راہیں، آپ پر وسیع و کشادہ ہوئیں اور ہر طرح کی دنیوی و اخروی بلندی حاصل کرنے کے لیے حوصلہ مندی کے جذبات آپ کی ذات میں پیدا ہوئے۔

والا جاہ مرحوم کے ہاں دہلی میں دو برس قیام کے بعد مفتی صدر الدین اور دیگر اساتذہ سے سند اجازت لے کر واپس آئے۔

سفر بھوپال:

سید صدیق حسن خاں اکیس برس کی عمر میں واپس قنوج تشریف لائے تو آپ کو فکر معاش دامن گیر ہوا کیونکہ آپ کے علاوہ والدہ محترمہ اور ہمشیرگان کے لیے کوئی کفالت کا بندوبست نہ تھا۔ آپ کے بھائی مولانا احمد حسن عرشی وفات پا چکے تھے لہٰذا چند ماہ بڑی تنگی و کسمپرسی کے

گزارنے کے بعد تلاش معاش کے لیے ریاست ٹونک گئے اور بعد ازاں مشہور اسلامی ریاست بھوپال کا رخ کیا۔ جب آپ بھوپال تشریف لے گئے تو آپ نے ایک روایت کے مطابق موتی مسجد کے ایک حجرہ میں قیام کیا۔

اس وقت بھوپال میں سکندر بیگم کی حکومت تھی۔ آپ روزگار کے لیے ریاست بھوپال کے مدارالمہام نائب اول منشی جمال الدین خاں کی خدمت میں پیش ہوئے۔ چنانچہ آپ کو تیس روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازم رکھ لیا گیا۔ آپ نہایت جانفشانی، مستعدی اور نیک نیتی سے اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے، آپ نے اس ذمہ داری کے ساتھ ساتھ وعظ و تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور مسجد ابراہیم خاں میں ہر جمعۃ المبارک کو خطاب کرتے رہے۔ بعد ازاں ریاست بھوپال میں میر دبیری خالصہ کی جگہ خالی ہوئی تو آپ کا تقرر چالیس روپے ماہانہ مشاہرے پر کر دیا گیا جسے بعد میں پچاس روپے کر دیا گیا۔

وطن واپسی:

نواب مرحوم بڑی محنت سے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو رہے تھے کہ آپ کو ملازمت دلوانے کا باعث بننے والے مولانا علی عباس مرحوم چڑیا کوٹی سے حقہ کی اباحت پر مناظرہ ہو گیا، نواب مرحوم حقہ کی اباحت کے قائل تھے جب کہ مولانا علی عباس اس کی حرمت پر زور دیتے تھے۔ اسی طرح آپ کو ۱۸۵۵ء میں سرکار کی طرف سے میر دبیری کا جو سرکاری خلعت عطا ہوا تھا وہ کوئی چرا کر لے گیا اور سابق میر دبیر منشی عبدالعلی خاں اپنے سابقہ عہدہ میر دبیری پر بحال ہو گئے۔ چنانچہ ان اسباب و وجوہ کی بنا پر آپ کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ آپ اس سلسلے میں کہتے ہیں: ”میں نے اس عزیز دوست (شیخ علی عباس) سے بلا وجہ جھگڑا کیا جو میرا پرانا دوست اور ملازمت کا باعث تھا اور اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ملازمت سے معزول ہو کر بے کار ہو گیا۔“

چنانچہ آپ چار و ناچار اپنے وطن قنوج واپس آ گئے۔ ابھی فکر معاش میں تھے کہ ۶ جون ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ بپا ہو گیا اور تحریک آزادی کے نام سے ملک میں بدامنی اور بے چینی پھیل گئی

جسے غدر ۱۸۵۷ء کا نام دیا گیا۔قنوج بھی اس ہنگامہ کی لپیٹ میں آیا جس سے آپ کو بھی کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ آپ کے والد گرامی کے عقیدت مند آپ کو والدہ اور بہنوں سمیت بلگرام لے گئے۔ بلگرام اودھ کا ایک مشہور قصبہ ہے اور اسے قدیم زمانہ سے دار العلم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ آپ اس کے ایک محلہ میدان پورہ میں کرائے کے مکان میں قیام پذیر ہو گئے۔ یہاں آپ مع اہل خانہ نہایت کسمپرسی میں رہے ان حالات کی عکاسی آپ کے صاحبزادے علی حسن اس طرح کرتے ہیں:

”والا جاہ کو کئی مہینہ تک صرف ایک سیاہ جامہ خشن اور نان خشک شبینہ پر وقت گزاری کرنا پڑی، جب کپڑا پھٹ جاتا اپنے ہاتھ سے سی لیتے جب میلا ہو جاتا تو خود دریا پر جا کر دھلاتے۔“

اس تنگ دستی کے عالم میں بھی آپ نے اپنی خودی نہ بیچی اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا بلکہ صبر وقناعت کے ساتھ ساتھ آپ نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا اور اسی زمانہ میں آپ نے سکھوں سے جان بچ جانے (جس کا تذکرہ پیچھے کیا جا چکا ہے) کی خوشی میں رسول اکرم ﷺ کی شان اقدس میں ایک طویل قصیدہ لکھا جس کے ستر اشعار ہیں، اس کا عنوان ”قصیدہ العنبریہ فی مدح خیر البریہ“ ہے۔آپ نے اس میں خواب میں رسول اکرم ﷺ کے دیدار مبارک کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

سفر ٹونک:

جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ختم ہوا تو آپ دوبارہ قنوج واپس تشریف لے آئے اور بعد ازاں سکندر بیگم والیۂ بھوپال کی طلبی پر دوبارہ عازم بھوپال ہوئے۔ جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ حاسدین نے سکندر بیگم کے کان بھر دیئے ہیں، چنانچہ آپ کو ملازمت نہ مل سکی اور آپ ناکام لوٹے۔ بھوپال سے واپسی پر آپ ٹونک چلے گئے۔ٹونک میں آپ کی ملاقات سید اسماعیل امیر کے ساتھ ہوئی اور تقریباً دو ماہ ان کے پاس قیام پذیر رہے اور اس کے بعد نواب وزیر الدولہ نے آپ کو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر اپنے پاس رکھ لیا۔لیکن یہاں آپ کا دل نہ لگ سکا اور آپ وہاں کی طرزِ معاشرت سے بیزار ہو گئے اور نواب وزیر الدولہ کے پرزور اصرار کے

باوجود وہاں ٹھہرنے پر تیار نہ ہوئے اور چار ماہ کی رخصت لے کر بھوپال آ گئے۔ کیونکہ اسی دوران آپ کو دوبارہ بھوپال طلب کرلیا گیا تھا۔

بھوپال واپسی:

آپ ٹونک سے بھوپال ۱۸۵۹ء میں پہنچے، اب سکندر بیگم بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئیں، گزشتہ انکار پر اظہار افسوس کیا اور آپ کو ریاست کی تاریخ نگاری کی ذمہ داری سونپی اور پچھتر روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ اس پر آپ نے اپنا استعفاء نواب امیر الملک وزیر الدولہ کی خدمت میں بھیج دیا اور اس کے ساتھ اپنی نئی کتاب ''تحفہ فقیر'' بطور تحفہ بھیجی۔ بھوپال اب وہ بھوپال نہیں رہا تھا کہ جہاں آپ کی قدم قدم پر مخالفت ہوتی تھی بلکہ اب سرزمین بھوپال آپ کے قدموں میں پھول بچھا رہی تھی اور سربلندی وعروج آپ کی قدم بوسی کو تیار تھے۔

نکاح:

ابھی تک نواب مرحوم کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اب بھوپال میں آپ کی شہرت کا سورج جگمگانے لگا تھا۔ مدار المہام منشی جمال الدین خان نائب اول ریاست بھوپال آپ کی اعلیٰ قابلیت اور آپ کی صلاحیتوں کے پہلے ہی معترف تھے۔ انہوں نے اپنی سلیقہ شعار اور نیک بخت بیوہ دختر ذکیہ بیگم کا نکاح ثانی آپ سے کر دیا۔ آپ کا نکاح ۲۵ شعبان ۱۲۷۷ ہجری کو ماجی مسجد میں ہوا اور نکاح کا خطبہ مسنونہ مولانا عبدالقیوم بن مولانا عبدالحی نے پڑھا۔ اس رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد آپ کا مقام مزید بلند ہو گیا اور آپ کو ریاست میں ایک اہم رکن کی حیثیت حاصل ہو گئی اور آپ کا مشاہرہ ایک سو روپے کر دیا گیا۔ اب آپ نے اپنی والدہ محترمہ اور بہنوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ذکیہ بیگم سے دو بیٹے (سید نور الحسن خان طیب، سید علی حسن خان طاہر) اور ایک بیٹی (صفیہ بیگم) عطا کی۔

سفر حج:

آپ ۱۸۸۵ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے گئے، حج کرنے اور مدینہ منورہ کی زیارت سے فارغ ہو کر آپ آٹھ ماہ بعد واپس تشریف لے آئے۔ آپ اس سفر کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اس سفر میں بھی آتے جاتے اور اقامت کے وقت مطالعہ ونقل کتب کا شغل جاری رہا۔ روانگی کے وقت جہاز میں کتاب ''صارم منکی'' اپنے ہاتھ سے لکھی۔ پھر حدیدہ پہنچ کر جب اٹھارہ دن قیام ہوا تو سید محمد اسماعیل امیر وغیرہ کے بیس پچیس رسائل اپنے ہاتھ سے نقل کیے۔ منیٰ اور عرفات میں بھی فرصت کے اوقات میں کتابت کی، واپسی کے وقت جہاز میں ''سنن دارمی'' لکھی۔ یہ نسخہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کا تھا اور میں نے مرزا امیر بیگ سلمہ، داماد مولوی محمد یعقوب مرحوم مہاجر مکی سے نقل کرنے کے لیے مستعار لیا تھا۔ بھوپال آ کر انہیں واپس کر دیا۔ اس نسخہ پر جابجا شاہ صاحب رحمہ اللہ کے قلم مبارک سے تصحیح ثبت تھی۔ اسی نسخہ کی نقل ہندوستان میں ''مطبع نظامی'' نے طبع کی ہے۔ اس سفر میں میں نے حدیدہ وحرمین شریفین کے بہت سے سلف وخلف صالحین کی بہت سی نفیس کتابیں بھی خریدیں "السياسة الشرعية" کو مکہ معظمہ میں نقل کیا۔ یہ قلمی رسائل ابھی تک کتب خانہ میں موجود ہیں، سفر حج کا رسالہ "رحلة الصديق الى البيت العتيق" اور "اتحاف النبلاء" میں تفصیل کے ساتھ مرقوم ہے۔

سفر حجاز سے واپسی پر مجھے ریاست کے مدارس کا مہتمم بنا دیا گیا۔ پھر میر منشی بنا دیا گیا۔ میں اس شغل کو اپنے لیے پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ مدرسہ میں تو علمی شغل تھا اور تمام وقت مطالعہ اور تالیف کتب میں بسر ہوتا تھا۔ چنانچہ "مسك الختام شرح بلوغ المرام" انہی ایام میں تالیف کی تھی۔ اور سارا کتب خانہ فروخت کر کے اس کتاب کی طباعت کا انتظام کیا۔ اب اس موجودہ خدمت میں فرصت جاتی رہی۔ انا للہ!

لیکن آئندہ سال سے پھر ایسی صورت پیدا ہوئی کہ پہلے سے بھی زیادہ مشغلہ علم کی فرصت ہاتھ آ گئی۔'' وللہ الحمد!

نواب شاہ جہاں بیگم سے نکاح:

رئیسہ بھوپال نواب سکندر جہاں بیگم ۱۳ رجب ۱۲۸۵ ہجری بمطابق نومبر ۱۸۶۸ء کو

انتقال فرما گئیں اور ان کی صاحبزادی نواب شاہجہاں بیگم تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئیں۔ ان کا نکاح نواب باقی محمد خاں مرحوم سے ہوا تھا اور وہ ان کی تخت نشینی سے پہلے ۲۱ صفر ۱۲۸۴ ہجری کو انتقال کر چکے تھے۔ اب نواب شاہجہاں بیگم کو اپنے امور سلطنت کو چلانے کے لیے ایسے رفیق حیات کی ضرورت تھی جو محبت و پیار کا خوگر، علم وعمل کا مجسمہ، باصلاحیت و منتظم اور والیۂ ریاست کا خیر خواہ ہونے کے ساتھ ساتھ رعایا کا مددگار اور آداب شاہانہ سے بھی آراستہ و پیراستہ ہو۔ چنانچہ ان کی نظر انتخاب نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ پر پڑی اور بڑی شان وشوکت سے آپ کا نکاح رئیسہ بھوپال سے ۱۷ صفر ۱۲۸۸ء بمطابق ۸ مئی ۱۸۷۱ء کو منعقد ہوا۔ اس پرشکوہ تقریب سعید میں عمائدین حکومت، ارکان ریاست، فوجی افسران اور علمائے کرام شریک ہوئے۔ پچیس ہزار روپے حق مہر مقرر رہوا۔

نواب شاہجہاں بیگم زوجہ نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف ''تاج الاقبال'' میں سید صدیق حسن خان کے انتخابات کی وجوہات بیان کی ہیں جس میں ان کی والدہ نواب سکندر بیگم کے اظہار پسندیدگی، آپ کی سترہ سالہ خدمات جلیلہ کا تذکرہ اور آپ کی وفاداری، خلوص، جانفشانی، اعلیٰ قابلیت اور دیانت داری کے ذکر کے ساتھ ساتھ آپ کی دینی خدمات اور آپ کے حسب ونسب کو بھی شاندار طریقے سے بیان کیا ہے۔

نواب شاہ جہاں بیگم کے اخلاق واطوار:

نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کی پہلی بیوی ذکیہ بیگم نہایت پاکباز، صالحہ، وفا شعار اور فرمانبردار بیوی تھی۔ نواب شاہجہاں بیگم کو ان صفات یعنی پاکیزگی وتقویٰ اور وفا شعاری و اطاعت گزاری کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے بہت سی اور خوبیوں سے بھی نوازا تھا۔ آپ ایک شان دار اور مدبرہ حکمران، اخلاق حسنہ سے متصف، تحریر وتقریر کی خوبی سے مزین اور اپنے خاوند پر مر مٹنے کا جذبہ رکھنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے خاوند صدیق حسن خان سے قرآن وسنت کی تعلیمات حاصل کیں اور ان کے مطابق عمل پیرا ہوئیں، ریاست میں نواب صاحب کے اصلاحی احکامات کو نافذ کیا اور آپ کی ہدایات اور کتب سے استفادہ کرتی رہیں اور خود بھی کئی ایک کتب تالیف کیں۔

نواب صاحب مرحوم اپنی بیوی کے فضل واحسان اور حسن سلوک کا تذکرہ فرماتے ہوئے ''ابقاء المنن'' میں لکھتے ہیں:

''وہ انتہائی اعلیٰ اخلاق، لطیف طبع، شریفانہ عادات، عالی ہمت، حاضر جواب، بہادر، کتاب وسنت کے علماء سے محبت کرنے والی، فصیح اللسان اور فہم وادراک اور عقل وشعور کی حامل عورت تھی۔''

اعزازات وخطابات:

نواب مرحوم کی رئیسہ بھوپال سے شادی کے بعد آپ کو مملکت میں اہم مقام حاصل ہوگیا اور آپ وزیر اعظم کے منصب تک جا پہنچے، سالانہ جاگیر پچیس ہزار سے شروع ہوکر پچھتر ہزار روپے سالانہ تک مرحمت کی گئی۔ علاوہ ازیں سول حکومت کے عہدیداروں اور فوجی افسران وغیرہ کی طرف سے نذریں پیش کی جانے لگیں اور علاقہ بھوپال میں سترہ توپوں کی سلامی پیش ہونے لگی نیز آپ کو نواب، والا جاہ اور امیر الملک ایسے خطابات سے سرفراز کیا گیا۔

سیر وسیاحت:

اب نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ جلوت وخلوت میں نواب شاہجہاں کے دست راست تھیں وہ اپنے تمام نجی اور سرکاری دوروں اور اجلاسوں میں آپ کو ساتھ رکھتیں۔ اس سلسلے میں بمبئی، کلکتہ اور دہلی وغیرہ کے سفر اور حکومت برطانیہ اور ان کے وائسراؤں کے ساتھ میٹنگوں اور سرکاری تقریبات میں آپ کی شرکت اور آپ کو پیش کیا گیا مقام ومرتبہ ایک بڑی دلچسپ اور پرشکوہ داستان ہے جس کی تفصیلات مآثر صدیقی حصہ دوم میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

معزولی:

نواب صدیق حسن خان مرحوم اور ان کی اعلیٰ صفات کی حامل زوجہ نواب شاہ جہاں بیگم ریاست بھوپال کو نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے تھے اور ریاست کو دینی ودنیوی اعتبار سے آسمان رفعت وعظمت پر لے گئے تھے نیز بھوپال علمی مرکز کی حیثیت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی مراعات وسہولیات سے ہمکنار ہوکر امن وامان کا منبع ومحور بن گیا تھا۔ لیکن یہ عظیم ترقی وعروج حاسدین اور سازشی عناصر کو گوارا نہ ہوا اور انہوں نے حکومت برطانیہ کو مختلف من

گھڑت الزامات اور شکایات لگانا شروع کر دیں اور ان الزامات کے ثبوت کے لیے آپ کی ہدایت السائل، اقتراب الساعۃ، ترجمان وہابیہ، وغیرہ ایسی تصنیفات و تالیفات اور آپ کے توحید وسنت سے مزین مواعظ حسنہ وغیرہ کو پیش کیا جن کی روشنی میں انگریزی حکومت نے ۲۱ مارچ ۱۸۸۱ء کو آپ پر ترغیب جہاد اور وہابیت کے پرچار کا الزام لگا کر آپ پر پابندیاں عائد کر دیں اور بعدازاں ۱۸۸۵ء میں آپ پر باغیانہ تقریر و تحریر کے الزامات عائد کر کے آپ کو ۲۸۔ اگست ۱۸۸۵ء کو تمام مناصب اور خطابات سے معزول و برخاست کر دیا۔ اس صورت حال کو امام ابویحییٰ خاں نوشہروی ان الفاظ کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں:

''آخر جناب، والا جاہ نواب صدیق حسن خاں صاحب کی علمی سرگرمیوں پر برادرانِ دین نے حسد کیا، جاہ و مرتبہ، خویش و اقارب کو ناپسند آیا، عام مسلمانوں میں حضرت کا یہ وقار گورنمنٹ عالیہ کی نظر میں خار ہوتا گیا۔'' ؏

گرا جو دامن گل چیں میں گل نے رو کے کہا
کہ میری جان کا دشمن تھا رنگ و بو میرا

اوران سب کا ردعمل خطابات و اختیارات سے علیحدگی تجویز ہوئی، مگر قرارداد جرم مرتب کرنے کے لیے ابھی کسی بہانہ کی ضرورت تھی۔

ادھر قصہ فرہاد و داستان قیس یعنی مجاہدین کا وہ خونی افسانہ ابھی زبان زد عام تھا، جس نے کوہستان کشمیر و کابل کو اپنے خون شہادت سے لالہ زار بنا دیا تھا، انبالہ کا وہابی کیس ابھی ابھی ختم ہوا تھا، جس میں حضرات صادق پور و بہار۔ (مولوی احمد اللہ و مولانا یحییٰ علی و حضرت عبدالرحمٰن وسیدنا عبدالغفار منشی، مولانا جعفر علی تھانیسری وغیرہم) کالے پانیوں کو بحر نور سے بدلنے کے لیے بھیج دیئے گئے تھے، ان احوال میں سید صدیق حسن خاں جیسے مجدد الوقت پر الزامات لگانے کیا مشکل تھے، پس یہ روئدادِ جرم یوں مرتب کی گئی۔

الزامات:

(۱) ترغیب جہاد اور گورنمنٹ کی مخالفت

(۲) مذہب وہابیت کی ترغیب اور ان دونوں دفعات کو مجلّا کرنے کے لیے یعنی

(۳) رئیسہ عالیہ کو پردہ نشین بنا کر مدد دہی رئیسہ کے نام سے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لینا۔

(۴) جاگیرات کی ضبطی (۵) سختی بندوبست

(۶) نواب قدسیہ بیگم صاحبہ کو رئیسہ عالیہ کا مخالف کرنا۔

(۷) رئیسہ عالیہ اور نواب ولی عہد میں ناموافقت پیدا کرنا۔ اور یہ رسم انتزاع ۱۷ ذیقعدہ ۱۳۰۲ ہجری۔ ۲۸۔ اگست ۱۸۸۵ء کو عمل میں آئی۔

شیوخ واساتذہ

نواب صدیق حسن رحمہ اللہ نے اپنے زمانہ کے نامور اہل علم سے تعلیم حاصل کی اور ان سے متداول علوم صرف ونحو، لغت وادب اور علوم قرآن وسنت حاصل کیے۔ ان اساتذہ میں سے چند چیدہ اور مشہور ترین درج ذیل ہیں۔

مفتی محمد صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور:

آپ کا اصل وطن کشمیر تھا، دہلی میں ۱۲۰۴ ہجری میں پیدا ہوئے آزردہ کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ ابتدائی علوم اپنے والد سے پڑھے اور ادب عربی، بیان، فقہ، اصول فقہ، تفسیر وغیرہ شاہ عبدالعزیز دہلوی سے اور علوم حدیث، کتب رجال، منطق اور فلسفہ وغیرہ دیگر اساتذہ سے حاصل کیے۔ صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

> ''یہ اپنے زمانہ کے ہر علم کے ماہر اور خصوصاً ادبی فنون میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ جب ان سے کسی بھی فن کے بارے میں سوال کیا جاتا تو دیکھنے اور سننے والا یوں سمجھتا کہ اس فن کو ان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ اس بنا پر علماء کے خیال میں یہ علمی طور پر منفرد عالم تھے۔ شعراء کا خیال ہے کہ شاعری کے علم کے یہی علمبردار ہیں۔ امراء فیصلے کے لیے انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ نواب صدیق حسن نے ان سے بعض کتب میں استفادہ کیا اور حکومت برطانیہ نے ۱۸۲۷ء میں ہندوستانی حکومت میں ان کو دہلی کا مفتی عام اور صدر الصدور کا منصب عطا کیا۔''

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کے فتویٰ سے انگریز کے خلاف جہاد میں تیزی آئی

جس کی بنا پر انہیں پابند سلاسل کیا گیا اور ان کی املاک لوٹ لی گئیں اور ان کے موروثی مکتبہ کو جس کی کتابوں کی قیمت کئی لاکھ روپے تھی جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ آپ ۱۲۸۵ھ کو فوت ہوئے۔

شیخ حسین بن محسن السبیعی الانصاری:

آپ کا نام الشیخ الامام العلامۃ المحدث القاضی حسین بن محسن السبیعی الانصاری ہے۔ آپ کی نسبت آپ کے جد اعلیٰ تقی الدین ابن سبیعی الانصاری کی طرف ہے۔ حدیدہ شہر میں ۱۲۴۵ ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ نے قرآن مجید اپنے والد کی زندگی میں پڑھ لیا تھا پھر علم نحو و صرف، فقہ پڑھی اور علوم حدیث میں امتیاز حاصل کیا۔

علامہ سلیمان بن محمد نے ان کو خصوصی اجازت تفویض کی پھر آپ مکہ مکرمہ چلے گئے۔ وہاں حافظ محمد بن ناصر الحازمی کی شاگردی اختیار کی، وہاں سے بھی علمی اجازت حاصل کی پھر آپ چار سال تک ملک یمن کے ایک شہر میں جج کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ قرآن و سنت کے ساتھ شدید تمسک کی وجہ سے اور بعض امراء کے خلاف فتویٰ دینے کی وجہ سے آپ کو معزول کر کے ترک وطن پر مجبور کر دیا گیا۔ لہٰذا آپ سکندر بیگم کے دور میں بھوپال واپس آ گئے۔ ان کے متعلق ان کے شاگرد عزیز نواب صدیق حسن لکھتے ہیں کہ: ''یہ ہمارے جدید علوم کے استاذ تھے، میں نے ان سے چھ معتبر کتابیں اور کچھ دیگر کتابیں پڑھی ہیں اور آپ نے مجھے ان کے متعلق کامل اور عمومی اجازت عنایت فرمائی۔ ان کی اجازت کی تحریر اب بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ آپ ۱۳۲۶ ہجری کو فوت ہوئے۔

شیخ عبدالحق بنارسی:

عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی اپنے دور کے مشہور عالم ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ حج بیت اللہ کے بعد یمن گئے اور صنعاء میں قاضی محمد بن علی الشوکانی اور دیگر علماء سے تحصیل علم کیا اور ان سے علمی اجازت لے کر ۱۲۳۸ ہجری کو واپس آئے، سات بار حجاز کا سفر کیا اور ۱۲۸۷ ہجری کو منیٰ میں حالت احرام میں وفات پائی اور مسجد خیف کے دروازے کے سامنے دفن ہوئے۔

شیخ محمد یعقوب دہلوی مہاجر مکی:

آپ نے اپنے بھائی محمد اسحاق کے ساتھ مکہ ہجرت کی، آپ علم وفضل کا نمونہ تھے، بیمثال اخلاقِ جمیلہ اور مکارم حمیدہ سے متصف تھے اور قناعت واستغناء کا نمونہ تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور اپنے دادا شیخ عبدالعزیز دہلوی سے علم حاصل کیا، انہیں کے زیر سایہ تربیت حاصل کی اور انہیں سے علم حاصل کر کے وہیں درس وتدریس شروع کر دی، آپ نے ایک مدت تک دہلی میں قیام کیا۔ پھر ۱۲۵۸ھ میں مکہ کا سفر کیا اور وہیں سکونت اختیار کر لی، نواب صدیق حسن وغیرہ نے ان سے علمی استفادہ کیا۔ آپ جمعہ کے روز ۱۲۸۲ ہجری میں مکہ المکرمہ میں فوت ہوئے۔

شیخ احمد حسن عرشی:

آپ عرشی تخلص رکھتے تھے، احمد بن حسن بن علی نام تھا، نواب صدیق حسن خاں کے حقیقی بھائی تھے اور دو سال بڑے تھے۔ ۱۹ رمضان ۱۲۴۶ ہجری کو پیدا ہوئے۔ قنوج میں پرورش پائی، مختلف علاقوں کا سفر اور مشہور علماء سے علم حاصل کیا اور ان کے مشہور ترین استاد محدث عبدالغنی بن ابوسعید دہلوی ہیں جو کہ انتہائی ذہین تھے، ان کے متعلق نواب صدیق حسن ''ابجد العلوم'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ ذہانت وفطانت اور قوت حافظہ میں تمام ساتھیوں سے فوقیت رکھتے تھے اور فرماتے تھے میرا خیال ہے کہ ان کا گوشت ہڈیاں اور اعصاب تمام کے تمام علم سے بھرپور ہیں اور میری آنکھوں نے ان جیسا ذہین، وسعت علم کا حامل اور مسائل وعلوم کا حافظ نہیں دیکھا۔''

آپ ۱۲۷۶ ہجری میں فوت ہوئے۔ تیس سال کی عمر میں حجاز میں دفن ہوئے۔

اوصاف حمیدہ اور حسن کردار

محی السنۃ نواب صدیق حسن خاں مرحوم بہت سے اوصاف حمیدہ کے حامل اور اخلاق حسنہ کے پیکر تھے، ہر چھوٹے بڑے سے اس طرح ملتے کہ ملنے والا آپ کا ہی ہو کر رہ جاتا۔ کسی

سے بھی تلخ روئی، اکڑ اور غیظ وغضب سے پیش نہیں آتے تھے بلکہ میٹھی زبان، خوبصورت مسکراہٹ اور نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مخالفین و حاسدین سے بھی کبھی آپ کی تو تکار نہیں ہوئی اور آپ کو اپنے خلاف ہونے والی ان کی سازشوں اور شرارتوں کا علم ہونے کے باوجود آپ نے ان کے خلاف زبان سے کبھی ایک لفظ تک نہیں نکالا اور کتابوں میں بھی ان کا نام تک درج کرنے سے احتراز کیا بلکہ آپ نے ان کی بھی اصلاح کی کوششیں کیں اور ان سے اپنے معاملات وتعلقات کو برقرار رکھا۔

عاجزی وانکساری:

آپ کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ عاجزی وانکساری کا پیکر تھے اور آپ نے اعلیٰ حکومتی مناصب پر فائز ہونے کے باوجود بھی کبھی تکبر وغرور سے کام نہیں لیا بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو عاجز ومنکسر بنائے رکھا اور ہر کسی سے عاجزی وخاکساری کے ساتھ پیش آتے رہے۔ بعض اوقات آپ اس قدر عاجزی وانکساری سے کام لیتے کہ بعض لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے۔

آپ کی علمی قابلیت، اعلیٰ صلاحیتوں اور تبحر علمی کا زمانہ معترف ہے اور اس پر آپ کی تالیفات وتصنیفات شاہد ہیں لیکن آپ اپنے آپ کو نہایت کم درجہ پر سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ”ہم جیسے لوگوں کو طالب علم ہونا ہی کفایت کرتا ہے: مرتبہ علم تک رسائی ہمارے سلف صلحاء کا کام تھا، خلف میں نہ وہ ہمت ہے نہ اشتیاق، سلف وخلف کے علوم میں بہت زیادہ تفاوت ہے۔..... علاوہ ازیں ہم لوگ علماء نہیں ہیں بلکہ محض حمال (علم اٹھانے والے) نقال (نقل کرنے والے) اور قوال (زبان سے بیان کرنے والے) ہیں پھر یہ حمل علم، عدم عمل کی وجہ سے بے اثر ہے۔“

آپ کی تالیفات میں ایک کتاب ”نزل الابرار“ بھی ہے جو دعاؤں اور ذکر واذکار کے بارے میں بہت عمدہ کتاب ہے۔ آپ اس کتاب اور امام نووی کی کتاب کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علم ادعیہ واذکار میں امام نووی رحمہ اللہ کی کتاب معروف ومقبول ہے۔ بعض اہل علم

نے کہا ہے: ''بع الدار و اشتر الاذکار'' لیکن میری کتاب ''نزل الابرار'' اذکار کی نسبت زیادہ نفع بخش اور زیادہ جامع ہے۔ یہ بات محض تحدیث کے طور پر کہہ رہا ہوں اس لیے نہیں کہ میرا علم وفضل نووی سے زیادہ یا مساوی ہے کیونکہ میں نووی کے خاک پا کے برابر بھی نہیں ہوں، کجا ذرہ کجا آفتاب۔''

آپ لوگوں سے معاملات کرتے وقت انتہائی نرمی او مسامحت اختیار کرتے اور خیال کرتے تھے کہ میرا حق کسی پر رہ جائے اور کسی کا حق مجھ پر نہ ہو۔

بری صحبت اور برے کاموں سے نفرت:

نواب سید صدیق حسن رحمہ اللہ بچپن سے ہی برے کاموں اور بری صحبت سے احتراز کرتے اور ان سے حد امکان بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ نے کبھی آوارہ اور بدقماش نوجوانوں کی مجلس اور صحبت اختیار نہیں کی اور کبھی ایسے کھیلوں میں شریک نہیں ہوئے جو معیوب سمجھے جاتے تھے، آپ اپنی سوانح میں لکھتے ہیں:

''مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی پتنگ اڑائی ہو، مرغ لڑایا ہو، بٹیر پالا ہو، شطرنج گنجفہ، نرد شیر یا کوئی سا کھیل کھیلا ہو یا کبھی شہدوں کی صحبت میں بیٹھا ہوں۔ حالانکہ کوئی بزرگ سر پر نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا کہ مجھے کبھی بھی مکروہ امور کا شوق پیدا نہ ہوا اور میں ہمیشہ اچھے لوگوں کی صحبت کا طالب رہا اور اگر اتفاقاً کسی صحبت بد میں پھنس گیا تو جلد متنبہ ہو کر باز آ گیا۔'' وللہ الحمد

علاوہ ازیں آپ جاہلوں کی صحبت سے بچتے تھے اور ان کی صحبت کو غیبت، طعن وتشنیع، مکرو فریب، جھوٹ اور مخاصمت کا سبب قرار دیتے تھے۔

ذکرواذکار اور دیگر عبادات:

محی السنۃ نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ عبادات کی ادائیگی بڑی توجہ وانہماک سے کرتے تھے۔ نماز اول وقت میں اور باجماعت ادا کرتے تھے۔ اگرچہ حکومتی معاملات اور گھریلو مصروفیات کی وجہ سے بعد میں مسجد کا التزام نہ رہ سکا۔ رمضان المبارک میں عبادت الٰہی کے لیے کمربستہ ہو جایا کرتے تھے، زکوٰۃ باقاعدہ حساب واہتمام سے دیا کرتے تھے، صبح وشام کی

ادعیہ مسنونہ کے سختی سے پابند تھے۔ نماز تہجد کے وقت بیدار ہوتے۔ خصوصاً رمضان المبارک میں ضرور بارہ رکعت نماز تہجد ادا کرتے، دن رات کے معمولات میں بھی مسنون دعاؤں کا ورد کرتے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، گھر داخل ہونے، نکلنے، بیت الخلاء آنے جانے اور کپڑے پہننے تک کی دعائیں پڑھا کرتے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے تسبیح فاطمہ، آیت الکرسی، سورۃ فاتحہ، چار قل، سید الاستغفار، کلمہ توحید و تمجید پڑھتے اور اپنی خطاؤں سے توبہ و تائب ہو کر سوتے تھے اور یہ تصور رکھتے تھے کہ نیند میں روح، جسم سے آسمان کی طرف چڑھتی ہے۔ اگر ظاہری و باطنی طہارت پر نیند آئی ہو تو اسے اللہ کے سامنے سجدہ کی اجازت ملتی ہے اور اگر ظاہری و باطنی طہارت کے بغیر خواب استراحت میں چلے گئے تو نیند کو دربار الٰہی میں داخل ہونے سے روک لیا جاتا ہے اور اسے سجدہ کی اجازت نہیں ملتی اور گنہگار ٹھہرتی ہے۔

گناہ سے نفرت اور توبہ و استغفار کی کثرت:

آپ گناہ سے بڑے نفور تھے اور گناہ صغیرہ و کبیرہ، دونوں سے بچنے کی کوشش کرتے تھے اور اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے کسی فقیہ کے قول یا ضعیف روایت یا کسی حیلہ و تاویل کو ڈھونڈنے اور اسے پیش کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ اس عمل کو نہایت ناپسندیدگی سے دیکھتے اور اسے عذر گناہ بدتر از گناہ سمجھتے تھے۔

گنا ہونے کے بعد استغفار کرنا آپ کا معمول تھا بلکہ اکثر توبہ و استغفار کے الفاظ ماثورہ آپ کی زبان پر رہتے کیونکہ آپ کے نزدیک گناہ کے بعد توبہ فی الفور واجب ہو جاتی ہے اور گناہ کے بعد توبہ نہ کرنا ایک دوسرا گناہ ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ایک انسان ایک گناہ بار بار کرتا ہے تو اسے ہر بار گناہ سے توبہ کرنی چاہیے کیونکہ ہر گناہ کے ساتھ توبہ و استغفار کی توفیق ملنا ﴿ان الحسنت یذھبن السیات﴾ کی مصداق ہے۔ اسی طرح آپ کے خیال میں زیادہ استغفار کرنے سے گناہ کم ہو جاتے ہیں اور انسان گناہ ترک کر دیتا ہے۔

نواب مرحوم اپنے گناہوں پر بہت روتے تھے اور خوف الٰہی سے لبریز رہتے ہوئے، اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے تھے اور مومن کی حالت کو خوف و رجاء کے بین بین تصور کرتے تھے اور صرف خوف یا صرف رجاء کے مخالف تھے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

''مجھ پر حالت رجاء کی بہ نسبت حالت خوف کا غلبہ رہتا ہے لیکن اس میں عیب کی کوئی بات نہیں کیونکہ خوف کا نتیجہ بہت کم ظاہر ہوتا ہے لیکن رجاء بعض اوقات، یا اس میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ یہ خوف گویا اشتہائے کاذب ہے اور رجاء گویا جرأت نالائق ہے۔ خوف ہوتا تو برستے ہوئے مینہ کی طرح، یہ لگاتار گناہ کیوں ہوتے۔ پھر دل کے گناہ الگ ہیں، وہ سب ۶۶ ہوتے ہیں اور بدن کے گناہ الگ ہیں وہ سب ۱۰۴ ہیں۔ اگرچہ میں یہ نہیں کہتا کہ میں رات دن یہ سارے گناہ کرتا رہا ہوں لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ مجھ سے صغائر و کبائر یقیناً سرزد ہوئے ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کو میں جانتا ہوں اگرچہ میں نے ان سے توبہ کر لی ہے۔ قبول و عدم قبول کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانے۔ بعض وہ ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں، میں ان کو نہیں جانتا یا بھول گیا ہوں۔ ہر چند ان سے بھی توبہ کرتا ہوں لیکن عقاب، حساب اور عتاب وغیرہ کا خوف لگا رہتا ہے۔ اس لیے کہ محض رجاء مرجیہ کا مذہب ہے اور محض خوف خوارج کا۔ مومن کو چاہیے کہ خائف اور راجی ہو۔ حیات میں خوف غالب رہے اور موت کے وقت رجاء و حسن ظن غالب آ جائے لیکن محض تمنا سے نہیں بلکہ ظہور ثمرات کے اعتبار سے۔''

عمرك بالحمية افنيته
خوفا من البارد و الحار
و كان اولى لك ان تتقي
من المعاصي حذر النار

''انسان چاہے تو اپنے نفس کی دونوں حالتوں کا امتحان کر سکتا ہے، اگر ہر ساعت میں محاسبہ نفس نہ کر سکے تو صبح و شام محاسبہ کرنے سے تو کوئی امر مانع نہیں ہے جس کا حساب اس جگہ پاک ہے اسے وہاں محاسبہ کا کچھ باک نہیں ہے۔''

آپ کو دنیا سے محبت نہیں تھی بلکہ ترکِ دنیا کو پسند فرماتے تھے اور اس کوشش میں رہتے تھے کہ دنیا کے مال و متاع اور دنیا کی جھوٹی عزتیں نہ ہی ملیں لیکن اگر دنیا کا مال ملے تو صرف قوت لایموت ملے۔

اخلاق رذیلہ سے نفرت:

نواب صدیق حسن مرحوم غیبت، چغلی، لغویات، کذب بیانی، دغا وفریب، خوشامد اور حسد ایسی بیماریوں میں مبتلا نہیں تھے اور ان سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے اور جاہلوں کی مجلس انہی رذائل کی بنا پر اختیار نہ کرتے۔ آپ کسی آدمی سے بھی کسی دینی دنیوی فضیلت پر حسد نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی کی خوشامد کرتے تھے اور ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ کے تحت انعامات الٰہیہ کی تقسیم پر شاکر وقانع تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "کسی نے میرا حصہ تو نہیں چھینا کہ اس پر حسد کروں اور جو کسی دوسرے کی قسمت میں ہے وہ بھی مجھے ہرگز نہیں مل سکتا پھر حسد چہ؟ ہاں سلف وخلف میں جو اہل فضل وتقویٰ ہیں ان کے تراجم احوال سے مطلع ہو کر یہ رشک ضرور ہوتا ہے کاش! یہ فضائل وخصائل مجھے بھی ملتے، مجھے بھی ان جیسا علم نصیب ہوتا۔ میں بھی ویسا متقی اور عابد وزاہد ہوتا جیسے وہ لوگ تھے یا جو شخص مالِ حلال سے سخاوت کرتا رہا ہو اس پر رشک آتا ہے کہ اگر مجھے دسترس ہوتی تو میں بھی راہِ للہ میں اسی طرح ایثار سے کام لیتا اور مال خرچ کرتا۔

اہل اللہ سے محبت:

آپ اہل اللہ سے بڑی گہری اور دلی محبت رکھتے تھے اور "المرء مع من احب" کی رو سے سمجھتے تھے کہ محبت محبّ کو محبوب تک پہنچا دیتی ہے۔ اس لیے آپ تمام صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین، فقہاء وصوفیاء وصالحین سے شدید محبت رکھتے تھے اور خواہش کرتے تھے کہ کاش مجھے ان کی صحبت نصیب ہوتی۔ اسی طرح آپ اہل فسق سے نفرت کرتے تھے اور ابن الدنیا کی صحبت سے کنارہ کشی اختیار کرتے تھے۔ آپ اہل اللہ کی محبت اور ان کی سیر وسوانح کو اپنے لیے مشعل راہ اور اعمال صالحہ ودینی کاموں کے لیے باعث ہمت وحوصلہ خیال کرتے تھے اور اپنی اس محبت کو آخرت میں نافع گردانتے تھے۔

وفات

علم وعمل کا یہ عظیم نمونہ، تصنیف وتالیف کا نامور سرخیل، اخلاق حسنہ کا پیکر جمیل، جید مدرس، مثالی مفسر، بہترین ادیب وشاعر، قرآن وحدیث کا بے مثال داعی اور ریاست بھوپال کا

عادل حکمران (۵۹) انسٹھ برس کی مختصر زندگی گزارنے کے بعد بالآخر ۲۹ جمادی الاخری ۱۳۰۷ ہجری بمطابق ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء کو اس جہان فانی سے جہان ابدی کے لیے چلا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی آپ کے سفر آخرت کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

''شیخنا المرحوم کی آخری تالیف کتاب ''مقالات الاحسان'' ہے، یہ کتاب ترجمہ ہے فتوح الغیب کا جو کہ سیدنا و مولانا حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی تالیف ہے جب اس کا طبع ہونا شروع ہوا تو میں نے اور انہوں نے اس کا مقابلہ کیا، جب صحت نامہ کا وقت آیا تو وہ بیمار تھے، میں نے اور ایک اور شخص نے اس کا مقابلہ ان کے روبرو کیا، مرض استنقا ہو گیا تھا، نہایت درجہ ایذا ہوئی مگر بڑے مستقل مزاج تھے۔ وفات کے وقت تک استقلال رہا، ہراس اور بے صبری کا کلمہ ہرگز زبان سے نہیں نکلا، ایام بیماری میں شب کو میں ان کے پاس رہتا تھا۔ رات کو نیند نہیں آتی تھی اور نہ لیٹا جاتا تھا۔ پلنگ پر قبلہ رخ بیٹھے رہتے، سامنے تکیہ رکھ لیتے تھے، اس پر سر رکھ لیا کبھی اٹھا لیا، اسی طرح ساری رات بسر ہوتی تھی، اکثر یا ارحم الراحمین کہتے تھے۔ بیماری کی شدت کی وجہ سے لکھنے کی طاقت نہیں تھی مگر علم کا شوق وہی، مجھ سے کہا بھائی تم آخر اور جگہ بیٹھ کر لکھتے ہو ہمارے سامنے ہی لکھا کرو، میں اس وقت ''مرأة النسوان'' لکھتا تھا، پس میں نے ان کے روبرو لکھنا شروع کیا۔ ظہر سے عصر تک ان کے کمرے میں لکھتا پھر گھر جاتا، بعد عشاء کے پھر آ جاتا تھا تو رات کو بھی چراغ کے روبرو بیٹھ کر ان کے سامنے لکھتا تھا۔ اس سے ان کو انس ہوتا، اس اثنا میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے، کئی دنوں سے اسی طرح ہوتا تھا، کبھی فرماتے بھائی آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو مثل دوا کے کہ جب بیمار ہوں تو ان کی حاجت ہو اور ایک مثل غذا کے کہ کسی حالت میں اس سے چارہ نہیں ہے، میری یہی مثال ہے۔ غرض یہ کہ چہار شنبہ بست و نہم (۲۹) ماہ جمادی الآخر ۱۳۰۷ھ ہجری کو ناگاہ جی میں آیا کہ آج ۳ بجے سے ان کے پاس جاؤں۔ چنانچہ جلدی سے کھانا کھا کر ان کے پاس حاضر

ہوا تو تکیے پر سر رکھے ہوئے تھے، میں نے سلام کیا تو سلام کا جواب دیا اور فرمایا اچھا ہوا سویرے آ گئے۔ پھر باتیں کرتے رہے، بے قراری زیادہ تھی۔ دوا علاج ہوتا رہا مگر کچھ نفع نہیں ہوتا تھا، اسی طرح ہوتے ہوتے رات کے ۱۲ بج گئے، اس وقت یا اس سے قبل کہا بھائی آگرے سے ہماری کتاب نہیں آئی، میں نے کہا وہ چھپ گئی، اس کا صحت نامہ بھی تیار ہو کر آ گیا، فرمایا اچھا ہوا مہینہ بھی پورا ہوا اور ہماری تالیف بھی پوری ہوئی، پھر کوئی دوا لایا تو پی لی، ذرا دیر بعد میں نے کہا کچھ آپ کو تسکین ہے، فرمایا کسی قدر، پھر کہا اب ہم دوا نہیں پئیں گے۔ اتنے میں ایک بج گیا، ذرا دیر بعد بیقراری ہوئی تو بسرعت ٹوپی سر سے اتار کر ڈال دی اور ذرا پاؤں پھیلائے اور چہرے پر پسینہ آیا، بکشادہ پیشانی بکمال درستی ہوش و حواس جان بحق تسلیم کی، اس وقت ایک بجنے پر ۳۵ منٹ رہ گئے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رحمہ اللہ تعالیٰ، بعد نماز صبح غسل دیا گیا، نماز جنازہ میں ایک خلق کثیر تھی، کئی بار نماز ہوئی، بروز پنجشنبہ یکم رجب ۱۳۰۷ ہجری کو قبل دوپہر کے اپنے خاص قبرستان میں مدفون ہوئے۔

آپ کی نمازِ جنازہ میں ہزاروں مسلمانوں نے شرکت کی اور تین بار آپ کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی جو گیارہ گیارہ اور تیرہ تیرہ صفوں پر مشتمل تھی۔

اللٰهم اغفرله وارحمه و ادخله الجنة الفردوس!

آمين يا رب العالمين

کچھ فتاویٰ جات کے بارے میں

لغوی معنی:۔

عربی زبان میں فَتْوٰی (یا فُتْوٰی) اور فُتْیا، اِفْتاء سے ماخوذ ہے، جس کے معنی اظہارِ بیان ورائے دہندگی کے ہیں۔[۱] مصدری معنی (رائے دہندگی) کی علاوہ خود (رائے) اور (رائے دہندہ کے کام) پر بھی فتویٰ اور فتیا کا اطلاق ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں نے ان دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے چنانچہ فتویٰ کو صرف ''دی ہوئی رائے کا مترادف'' قرار دیا ہے، اور فتیا کو باقی دونوں معانی کے لئے خاص بتایا ہے۔[۲] مگر لغت کی کتابوں سے اس تفریق کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی صدیوں میں فتویٰ کے بجائے لفظ فتیا کا استعمال عربوں کے ہاں زیادہ رہا ہے۔ کتب حدیث میں بھی فتویٰ کے بجائے فتیا کا لفظ ملتا ہے۔[۳] لغت کی کتابوں میں کسی ایسی عبارت یا شعر کا ذکر نہیں جس میں فتویٰ کا لفظ استعمال ہوا ہو، اگرچہ علماء وفقہا نے بعد میں دونوں ہی الفاظ عام طور پر استعمال کئے ہیں اور اس کی جمع فَتَاوٰی یا فَتَاوِی معروف رہی ہے۔[۴] قرآن مجید میں بھی گیارہ مقامات پر اس کے مشتقات وارد ہوئے ہیں جو استفتاء (سوال پوچھنے) اور اِفْتاء (جواب کی وضاحت کرنے) کے مختلف صیغے ہیں۔[۵] اسی سے پوچھنے والے کو مُسْتَفْتِی اور فتویٰ دینے کو مُفْتِی کہتے ہیں۔[۶]

اصطلاح:۔

میں فتویٰ سے مراد پیش آمدہ مسائل اور مشکلات سے متعلق دلائل کی روشنی

---

[۱] دیکھئے: لسان العرب، بذیل مادہ ''فتی''

[۲] "E.Tyan in: Encyclopaedia of islam ii, 866 Art. "fatwa"

[۳] دیکھئے: المعجم المفهرس لألفاظ الحديث النبوی ۶۸/۵ (یہاں متعدد احادیث کا ذکر ہے)

[۴] دیکھئے: نور البصر، ص ۱۴۸، کشف الظنون ۱۲۱۸/۲

[۵] دیکھئے: المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم: ص ۵۱۲

[۶] دستور العلماء ۱۳/۳

میں شریعت کا وہ حکم ہے جو کسی مسائل کے جواب میں کوئی عالم دین اور احکام شریعت کے اندر بصیرت رکھنے والا شخص بیان کرے۔ اکثر علماء نے مفتی کے لئے اجتہاد کی شرط ضروری قرار دی ہے اور مقلد کے فتویٰ کو درست نہیں بتایا، کیونکہ وہ دوسرے کی بات بغیر دلیل کے قبول کرتا ہے اس طرح وہ عالم نہیں رہتا اور جس کی یہ شان ہو اسے دوسرے کو فتویٰ دینے کا مجاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اگر کوئی مجتہد عالم موجود نہ ہو تو ضرورت کے وقت مقلد بھی فتویٰ دے سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی اس کے فتویٰ کو حقیقتاً فتویٰ نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ اپنے امام کا قول نقل کر دے[۲] اللہ ورسول کا حکم بتانا اور شریعت کے اندر صحیح اور غلط، راجح اور مرجوح، حلال اور حرام، کی تمیز دلائل کی روشنی میں کرنا اس کے بس سے باہر ہے اس سلسلے میں کوئی رائے ایک مجتہد ہی دے سکتا ہے۔[۳] جمہور علماء کے برخلاف احناف کے نزدیک مفتی کے لئے اجتہاد شرط صحت نہیں البتہ اولیٰ و بہتر ہے۔[۴] یہی وجہ ہے کہ ان کے متاخرین علماء کی کتابیں عام طور پر بے دلیل قیاسات اور تفریعات سے پر ہیں جو قوت اجتہاد سے محروم لوگوں کی کتاب وسنت سے ناواقفیت اور جمہور پسند ذہنیت کی غمازی کرتی ہیں۔

فتویٰ نویسی :۔

کے آداب اور مفتی و مستفتی سے متعلق مختلف مباحث کا جائزہ لینا طوالت کا موجب ہوگا۔[۵] اس لئے ان سے صرف نظر کرتے ہوئے یہاں فتویٰ نویسی کی تاریخ

---

(۱) صفة الفتویٰ والمفتی والمستفتی لابن حمدان، ص ۲۴، اعلام الموقعین ۴۶/۱ (۲) ارشاد الفحول للشوکانی، ص ۲۹۶ (۳) دیکھئے: القول المفید فی أدلة الاجتهاد و التقلید للشوکانی (۴) مجمع الأنهر ۱۴۶/۲ (۵) تفصیل کیلئے دیکھئے: الفقیه والمتفقه للخطیب البغدادی ۱۵۲/۲-۲۰۵ أدب المفتی والمستفتی لا بن الصلاح (بیروت ۱۹۸۶) المجموع للنووی ۱/ ۴۰-۶۹ صفة الفتوی والمفتی والمستفتی لابن حمدان (تحقیق: محمد ناصر الدین الالبانی، بیروت ۱۹۶۱) إعلام الموقعین عن رب العالمین لابن القیم (قاهره ۱۹۵۵) = اردو ترجمہ بہ نام "دین محمدی" مکتبہ قدسیہ لاہور، از محمد جونا گڑھی، أدب الفتیا للسیوطی (بیروت ۱۹۸۵) شرح عقود رسم المفتی لابن عابدین۔ درمجموعہ رسائل ابن عابدین ۱/ ۹-۵۲، الطُلَیحَة لمحمد النابغة القلاوی الشنقطی (قاهره ۱۳۳۹ھ)، ذخر المحتی من آداب المفتی للنواب صدیق حسنؒ خان (بھوپال ۱۲۹۴ھ) الفتوی فی السلام لجمال القاسمی (بیروت ۱۹۸۶) مفید المفتی لز عبدالاول جونپوری (لکھنؤ ۱۳۲۶ھ) الفتیا ومناهج الإفتاء لمحمد سلیمان الاشقر (کویت ۱۹۷۶ء)

کتب فتاوی اور ان کی قدر و قیمت اس فن میں علمائے ہند و پاک کی تالیفات اور اخیر میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے مجموعہ فتاویٰ پر تبصرہ کیا گیا ہے، تاکہ فتاویٰ کے مطالعہ سے قبل اجمالی طور پر اس فن کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل ہو جائیں جن سے فتویٰ نویسی کے میدان میں صاحبِ فتاویٰ کا مقام متعین کرنے میں مدد ملے اور ان کے فتاویٰ کی امتیازی خصوصیات واضح طور پر سامنے آسکیں۔

(۱)

فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے شروع ہوتا ہے، چودہ صدی کے طویل عرصے میں علماء نے اس شعبے کی دینی اہمیت کے پیش نظر ہمیشہ ہی اس کا خصوصی اہتمام کیا ہے تمام مسلمان اپنے اکثر دینی و دنیاوی امور کے متعلق پیش آمدہ مشکلات اور مسائل کے حل کی خاطر برابر ان کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں ان مسائل کا تعلق خواہ عقائد و عبادات سے ہو یا معاملات و اخلاق سے، یا آپسی اختلافات و نزاع سے ہر حال میں وہ شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لئے مفتیوں سے مدد لیتے رہے ہیں اور انہوں نے افتاء کو اپنا فریضہ منصبی تصور کرتے ہوئے ہمیشہ ہی ان کی رہنمائی کی ہے افتاء کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے، قرآن مجید میں دو جگہ لوگوں کے فتویٰ پوچھنے کے جواب میں اللہ کے فتویٰ دینے کا ذکر آیا ہے۔[۱] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور دیگر ائمہ دین و علمائے امت نے اس ذمہ داری کو بخیر و خوبی نبھایا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور جاری رہے گا۔

اس عرصے میں استفتاء اور افتاء کے طریقے بدلتے رہے، عہد رسالت میں فتاوی کا سلسلہ اکثر و بیشتر زبانی طور پر ہی چلتا رہا۔ جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے اس کا جواب کبھی تو قرآنی آیات کی صورت میں ملتا تھا اور کبھی وحی کی اساس پر اپنے اجتہاد سے فتویٰ دیتے تھے۔

۱۔ سورہ نساء آیت نمبر ۱۲۷، ۱۷۶

قرآن مجید میں جن فتاویٰ کا ذکر آیا ہے ان کے سوالات کبھی تو "یَسْتَفْتُوْنَکَ"[۱] کے صیغے سے شروع ہوتے ہیں اور کبھی "یَسْأَلُوْنَکَ"[۲] سے۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نازل کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت داری سے لوگوں تک پہنچا دیا ان کے علاوہ وہ فتاویٰ جو آپ نے مختلف اوقات میں صحابہ کرام کے سوالات کے جواب کے طور پر دیے، حدیث کی کتابوں میں منتشر صورت میں موجود ہیں۔ علامہ ابن القیمؒ (م ۷۵۱ھ) نے اپنی کتاب میں ان کا ایک بڑا حصہ ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔[۳]

صحابہ کرام اور فتویٰ

عہد رسالت میں اور اس کے بعد بہت سے صحابہ کرامؓ نے اپنے اجتہاد سے بعض مشکل دینی مسائل کے بارے میں فتاویٰ صادر فرمائے۔ علامہ ابن حزم (م ۴۵۶ھ) نے ایسے ۱۴۲ اصحابہ اور ۲۰ صحابیات کا ذکر کیا ہے جن سے فتاویٰ منقول ہیں۔[۴] اور انہیں فتاویٰ کی کثرت وقلت کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے سب سے زیادہ جن سے فتاویٰ منقول ہیں وہ بالترتیب یہ سات ہیں۔ حضرت عائشہؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابن عباسؓ۔ دوسرے حصہ میں ۲۰ ایسے صحابہ ہیں جن میں سے ہر ایک کے فتاوے کا ایک

---

[۱] دیکھیے حوالہ سابق

[۲] سورہ بقرہ، آیت نمبر ۱۸۹، ۲۱۵، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۲ سورہ مائدہ، آیت نمبر ۴ سورہ اعراف، آیت ۱۸۷، سورہ انفال، آیت نمبر ۱۔

[۳] دیکھیے: اعلام الموقعین عن رب العالمین ۴/ ۲۶۶_۴۱۴ = اردو ترجمہ بنام "دین محمدی" ۶۹/۱_۱۴۹) نواب صدیق حسنؒ خاں نے غالباً اسی پر اعتماد کرکے فارسی میں "فتاویٰ امام المتقین" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔

[۴] اصحاب الفتیا، مطبوعہ در آخر: جوامع السیرۃ ۳۱۹_۳۳۳، اور الإحکام فی اصول الاحکام ۴/ ۱۷۶، بعد کی اکثر کتابوں میں مفتی صحابہ وتابعین کے بارے میں معلومات ابن حزم سے قدرے اختلاف کے ساتھ نقل کی گئی ہیں۔ دیکھیے: تلقیح فہوم اہل الاثر لابن الجوزی ص۔ ۴۴ (قاہرہ ۱۹۷۵) إعلام الموقعین ۱/ ۱۱_۲۸، الجواہر المضیّۃ للقرشی ۲/ ۴۱۳_۴۱۷ (طبع حیدر آباد)

مختصر مجموعہ تیار کیا جا سکتا ہے باقی اور لوگوں سے زیادہ سے زیادہ ایک دو مسئلے منقول ہیں ان سب کے فتاویٰ بھی اگر جمع کئے جائیں تو ایک چھوٹا سا مجموعہ بنے گا، کچھ علماء نے بعض صحابہ کرام کے فتاویٰ و مسائل جمع کرنے کی طرف توجہ دی تھی چنانچہ ابوبکر محمد بن موسیٰ بن یعقوب بن مامون نے حضرت ابن عباسؓ کے فتاویٰ بیس حصوں میں جمع کئے تھے[1] اور تقی الدین سبکیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا[2] مگر یہ دونوں کتابیں دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہیں۔ عصر حاضر میں اس طرف دوبارہ توجہ ہوئی ہے اب تک حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عثمانؓ کے فقہی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''موسوعة فقه السلف'' کے نام سے بھی بہت سے صحابہ و تابعین کے آراء و مسائل کا مجموعہ مکہ مکرمہ سے کئی سال قبل چھپا تھا جو نامکمل سہی لیکن پھر بھی اہل علم اور عام قارئین کے لئے مفید ہے۔

عہد صحابہ کے مفتی:

عہد صحابہ میں فتاویٰ کا سلسلہ زبانی اور تحریری دونوں طریقوں سے جاری رہا۔ مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، شام اور مصر ہر جگہ لوگ مشکل مسائل کے سلسلے میں بعض جلیل القدر صحابہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ جو وہاں مسند فتویٰ پر متمکن ہوتے، یہ سلسلہ تقریباً پہلی صدی کے اخیر تک جاری رہا پھر تابعین اور تبع تابعین کا دور شروع ہوتا ہے اس دور میں منصب افتاء اجلہ تابعین و تبع تابعین کے سپرد رہا۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو صحابہ کرام کی موجودگی میں بھی فتویٰ دیتے تھے۔ مثلاً سعید بن المسیبؒ اور سعید بن جبیرؒ وغیرہ۔ علامہ ابن حزمؒ نے ہر علاقے میں عہد بہ عہد تمام مفتیوں کے نام اپنی کتاب میں ذکر کئے ہیں[3] جن کی تفصیل یہاں طوالت کی موجب ہوگی۔ مختصراً اتنا ذکر کر دینا کافی ہے۔

---

(۱) الإحکام فی اصول الاحکام ۱۷۶/۴، اعلام الموقعین ۱۸/۱۔۱۹، الجواهر المضية ۴۱۵/۲ کشف الظنون ۱۲۶۲/۲ (۲) الجواهر المضية ۴۱۸/۲ (۳) أصحاب الفتيا ص ۳۳۴۔۳۳۵ ابن حبان (م ۳۴۴ھ) نے اپنی کتاب ''مشاهير علماء الأمصار'' میں مفتیوں کے علاوہ دیگر مشاہیر علماء کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اسی موضوع پر علامہ ذہبی (م ۷۴۸ھ) کی ایک کتاب ''الأمصار ذوات الآثار'' بھی ہے لیکن اس میں خاص طور پر محدثین اور ناقلین حدیث کا ذکر ہے۔

مدینہ کے مفتی:

مدینہ میں بعض صحابہ (جیسے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، اور حضرت زید بن ثابتؓ وغیرہ) کے تربیت یافتہ سات فقہاء (جنہیں فقہائے سبعہ کہا جاتا ہے) مشہور ہوئے۔ یہ سعید بن المسیبؒ، عروۃ بن زبیرؓ، قاسمؒ بن محمدؒ بن ابی بکر صدیقؓ، عبیداللہؒ بن عتبہؒ بن مسعودؓ، خارجہؒ بن زیدؓ بن ثابتؓ، ابوبکرؒ بن عبدالرحمٰن اور سلیمانؒ بن یسارؒ ہیں۔ پھر ان کا سلسلہ امام زہریؒ اور امام ربیعہؒ بن عبدالرحمٰنؒ سے گزرتا ہوا امام مالکؒ اور ان کے تلامذہ تک پہنچتا ہے۔

مکہ کے مفتی:

مکہ میں حضرت ابن عباسؓ کے تلامذہ فتاویٰ صادر کرتے تھے۔ جیسے عطاءؒ، طاؤسؒ، مجاہدؒ اور عکرمہؒ وغیرہ ان کے بعد سفیان بن عیینہ سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ امام شافعی اور ان کے شاگردوں تک منتہی ہوتا ہے۔

کوفہ کے مفتی:

کوفہ میں حضرت ابن مسعودؓ سے تربیت پانے والے بزرگ منصب افتاء پر فائز تھے۔ جن میں علقمہؒ اور قاضیؒ شریح کے نام ممتاز ہیں۔ ان کے بعد ان کے شاگرد ابراہیم نخعیؒ پھر حماد بن ابی سلیمانؒ اور ان کے بعد امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ نے یہ فریضہ انجام دیا۔

بصرہ کے مفتی:

بصرہ میں حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ پھر قتادہؒ اور ان کے بعد حماد بن سلمہؒ، حماد بن زیدؒ اور معمر بن راشدؒ مشہور ہوئے۔

شام کے مفتی:

شام میں ابوادریس خولانیؒ پھر مکحولؒ اور ان کے بعد امام اوزاعیؒ اور ان کے تلامذہ نے یہ منصب سنبھالا۔

مصر کے مفتی:

مصر میں یزید بن ابی حبیبؒ اور ان کے بعد امام لیث بن سعدؒ اپنے اپنے زمانے کے مفتی تھے۔ ان کے علاوہ بغداد اور دیگر شہروں میں بہت سے علماء فتویٰ دیتے رہے۔ ان میں امام ابن المبارکؒ، امام احمدؒ، امام اسحٰق بن راہویہؒ، امام ابوثورؒ، امام داؤدؒ ظاہری اور امام اہل سنت ابن جریر طبریؒ وغیرہ شامل ہیں۔

دوسری صدی:

دوسری صدی ہجری میں بعض اصول وقواعد میں اختلاف کی وجہ سے فقہاء کے دو گروہ ہو گئے[1]۔ ایک اہل حدیث کا گروہ تھا جو احادیث نبویہ اور صحابہ کے فتاویٰ کی بنیاد پر فتویٰ دیتا تھا اور جب تک کسی واقعہ کا ظہور نہ ہو جاتا اس وقت تک اس کے بارے میں شرعی حکم بیان کرنے سے گریز کرتا تھا۔ اس گروہ میں علمائے حجاز کی غالب اکثریت شامل تھی۔

دوسرا گروہ اہل الرائے:

دوسرا گروہ اہل الرائے کا تھا جس میں فقہائے عراق کی غالب اکثریت تھی ان کے پاس چونکہ صحیح احادیث کم تھیں۔ اس لئے انہوں نے فتویٰ دیتے وقت عام طور پر رائے اور قیاس کا کثرت سے استعمال کیا، بعض ایسے قواعد وضع کئے جن کو سامنے رکھ کر پیش آمدہ اور آئندہ پیش آنے والے بلکہ محال اور غیر ممکن الوقوع ہزاروں مسائل سے متعلق اپنی رائے ظاہر کی، اور انہیں فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں جمع کر گئے۔ ائمہ مجتہدین کے بعد ان کے متبعین ومقلدین مختلف گروہوں میں بٹ گئے اور ہر گروہ فتاوی کے سلسلے میں اپنے مسلک کی توجیہہ وتائید میں لگ گیا، اس طرح فتاویٰ کا اجراء اجتہاد کے بجائے تقلید کی بنیاد پر ہونے لگا۔ اور تقلید کی روش ایسی مرغوب ہوئی کہ ہر مفتی اپنے مذہب کے اصول وفروع کے اردگرد گھومتا رہا اسے براہ راست کتاب وسنت کی طرف

---

[1] دیکھئے۔ حجۃ اللہ البالغۃ کا مبحث ''باب الفرق بین أهل الحديث وأهل الرأي''

رجوع اور دیگر ائمہ مجتہدین وفقہائے امت کی آراء سے استفادہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ان مقلدین کے بالمقابل علمائے حدیث کی ایک جماعت ہر دور میں ایسی بھی رہی ہے جو سلف صالحین، (صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین) کے طریقے پر کاربند رہی۔ فتویٰ نویسی کے وقت انہوں نے وہی طریقہ اپنایا جو سلف کے یہاں رائج تھا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) نے اپنے فتاویٰ میں اسی طریقے کی پیروی کی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مسائل میں انہوں نے ائمہ اربعہ تک مخالفت کی ہے، گزشتہ دو تین صدیوں میں فتویٰ نویسی کے اس رجحان کو کافی فروغ ہوا۔ ہندوستان، مصر اور دیگر بلاد عربیہ میں سلفی تحریک کے علمبرداروں نے جمود وتقلید کے خلاف جو کوششیں کی ہیں ان کا اثر فتویٰ نویسی پر بھی پڑا ہے۔ اس رجحان سے مقلدین بھی جزوی طور پر متاثر ہوئے چنانچہ خلافت عثمانیہ کے عہد میں جب ۱۲۸٦ھ میں "مجلة الأحكام العدلية" کی تدوین ہوئی تو پہلی بار مذاہب اربعہ کی تقلید سے، ہٹ کر بعض مسائل میں ابن شبرمہؒ کے مسلک پر فتویٰ دیا گیا۔ پھر ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳٦ میں مصر میں تقلید کی ڈگر سے نکلنے کی کوشش ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ مصالح مرسلہ اور حالات وزمانے کی رعایت کرتے ہوئے جملہ فقہائے اسلام کے اقوال وفتاویٰ کی بنیاد بنایا جائے۔ برصغیر میں اہل حدیث تو شروع ہی سے اس طریقے پر کاربند ہیں۔ اخیر میں مفتی محمد شفیع دیوبندی نے اپنی بعض کتابوں میں حنفی مسلک کی بجائے مالکی مسلک کی بنیاد پر مفقود الخبر کی بیوی کے نکاح ثانی کے بارے میں فتویٰ دیا۔ ۱۹۷۲ء میں حیدر آباد کے اندر طلاق ثلاثہ کے مسئلے پر جو سیمینار ہوا تھا اس میں بھی حنفی علماء نے اس مسئلے میں اپنا مسلک ترک کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے۔

اوپر فتویٰ نویسی کے عہد بہ عہد جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدائی صدیوں میں فتویٰ نویسی کے وقت احادیث وآثار اور فتاویٰ صحابہ وتابعین پر اعتماد کیا جاتا تھا بعد میں تقلیدی مذاہب وجود میں آئے اور ان کے اصول وضوابط وضع کیے گئے۔ چنانچہ فتویٰ نویسی میں بھی جمود وتقلید کے آثار نمایاں ہوئے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور دیگر فقہائے محدثین کی کوششوں سے پھر کتاب وسنت کی طرف براہ راست رجوع اور سلف صالحین،

صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے آراء و اقوال سے استفادہ کی طرف توجہ ہوئی جس کے نتیجے میں اہل حدیث اور سلفی علماء کا ایک بڑا گروہ وجود میں آیا۔ جس نے اجتہاد کا دروازہ جسے مقلدین نے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تھا، پھر سے کھول دیا۔ عصر حاضر میں اب تمام حق پسند اور منصف مزاج علماء اجتہاد کی ضرورت کے قائل نظر آتے ہیں۔ اور کسی ایک مذہب کی تقلید اور اس پر جمود کے بجائے تمام مذاہب سے استفادہ، ان کے تقابلی مطالعہ اور دلائل کی روشنی میں راجح مذہب کی تعیین کی دعوت دیتے ہیں اور نصوصِ کتاب و سنت کی موجودگی میں قیاس کو غلط قرار دیتے ہیں۔ یہ مقولہ اب زبان زد ہو چکا ہے "الاجتهاد فیما لانص فیه" (اجتہاد کو ان ہی مسائل میں دخل ہوگا جن کے بارے میں کتاب و سنت میں کوئی نص وارد نہیں) اس طریقہ کار کے مطابق اب فقہ کی کتابیں تیار کی جانے لگی ہیں۔ شیخ سید سابق کی کتاب "فقه السنة" ان میں سب سے زیادہ کامیاب کتاب تصور کی جاتی ہے محدثِ عصر علامہ محمد ناصر الدینؒ الألبانی کی کتاب "الثمر المستطاب فی فقه السنة والکتاب" اب تک طبع نہیں ہوئی امید کہ وہ بھی اس موضوع پر شاہکار ہوگی۔

اس مختصر سے تبصرے کے بعد اب ذیل میں کتب فتاویٰ کا ایک جائزہ لیا جا رہا ہے۔

(۲)

علم فتاویٰ کا شمار فقہ کے فروع ہوتا ہے۔ طاش کبری زادہ (م۹۶۸ھ) نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے[۱] کہ: اس میں جزئی واقعات کے بارے میں فقہاء سے صادر ہونے والے فروعی احکام بیان کئے جاتے ہیں اور غرض اس سے یہ ہوتی ہے کہ بعد میں آنے والے قوت استنباط سے محروم لوگ سہولت کے ساتھ ان سے استفادہ کر سکیں۔ عبدالنبی احمد نگری لکھتے ہیں[۲]: فتاویٰ سے عموماً شریعت اسلامی کے وہ فروعی مسائل مراد ہوتے ہیں جن کے بارے میں کسی فقہی کتب فکر کے بانی یا اس کے ساتھیوں

---

[۱] مفتاح السعادۃ ۲/۶۰۱ (طبع قاہرہ) نیز دیکھئے: ابجد العلوم ۲/۳۹۵ (طبع بیروت)

[۲] دستور العلماء ۳/۱۳

سے کچھ منقول نہیں ہوتا اور متاخرین علماء اپنے اجتہاد و استنباط کے ذریعہ ان کا حل پیش کرتے ہیں۔

اس میدان میں بے شمار کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں[1] جن میں اکثر حنفی علماء کی تالیف کردہ ہیں، ان کے علاوہ شافعی، مالکی اور حنبلی مکتب فکر کے علماء نے بھی اپنے اپنے مسلک کے مطابق فتاویٰ کے مجموعے تیار کئے۔ مقلدین کے علاوہ سلفی نقطہ نظر کے حامل علماء نے بھی ہر دور میں اس فن پر کتابیں لکھیں۔ ان سب کا تفصیلی جائزہ لینا یہاں دشوار ہے۔ ان کی اگر ایک فہرست ہی تیار کر دی جائے تب بھی طوالت کی موجب ہوگی ان کتابوں میں بہت سی تو اب مفقود ہیں بعض کے قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں کچھ مطبوعہ ہیں مگر صرف ایک بار طبع ہوئیں بہت کم ہی ایسی کتابیں ہیں جنھیں قبول عام اور استناد کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ اس لئے صرف اہم کتابوں کے ذکر پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ علمائے احناف نے فقہی مسائل کے ضعف یا قوت کے اعتبار سے فتاویٰ کی کتابوں کو تیسرے درجے میں رکھا ہے[2]۔ پہلے اور دوسرے درجے میں کتب ظاہر الروایۃ اور مسائل النوادر والأمالی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ حنفی مسلک کے یہ فتاوی انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں سے جمع ہوتے رہے یعنی بعض اوقات کسی فقیہ یا مفتی کے تمام فتاویٰ کو یک جا کر دیا جاتا تھا جو اس نے مختلف مسائل کے جواب میں وقتاً فوقتاً صادر کئے، بعد میں اسی کے نام سے یہ مجموعہ منسوب و مشہور ہوتا۔ خواہ اس کا جامع و مرتب کوئی دوسرا ہو فتاویٰ کا معتد بہ ذخیرہ اسی زمرے میں آتا ہے۔ فتاوی جمع کرنے کا اجتماعی طریقہ یہ تھا کہ علماء کی ایک مجلس منتخب کی جاتی اور مختلف ماخذ کے سہارے جزئی واقعات کے مطابق فتاویٰ مرتب کئے جاتے ''فتاویٰ عالمگیری''

---

[1] دیکھئے: کشف الظنون ۱۲۱۸/۲۔۱۲۳۱ (نیز در مواضع کثیرہ) مفتاح السعادۃ ۶۰۱/۲۔۶۰۴ (یہاں صرف حنفی مسلک کی کتابیں مذکور ہیں) مالکی مسلک کی کتب فتاویٰ کے لئے دیکھئے: مجلۃ دعوۃ الحق (رباط) مارچ ۱۹۸۴، ص ۱۵۵۔۱۵۵۷

[2] عقود رسم المفتی ص ۱۷، مفید المفتی ص ۱۷

(الفتاویٰ الهندية) کی تدوین اس طرز پر ہوئی ہے۔

فتاویٰ کی بہت سی کتابیں نوازل ، اجوبة ، مسائل ، سوالات أسئلة اور واقعات سے بھی موسوم ہیں۔ نوازل ، سے کسی واقعہ یا حادثہ کے پیش آنے کا پتہ چلتا ہے۔ برخلاف فتاویٰ کے جس کے تحت کسی بھی مسئلے سے متعلق شریعت کا حکم داخل ہوجاتا ہے خواہ وہ وقوع میں آیا ہو یا نہ آیا ہو بلکہ بسا اوقات بہت سے محال اور ناممکن الوقوع مسائل پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔

ہمیں یہاں اصطلاحی مفہوم میں فتاویٰ کی صرف ان ہی کتابوں سے غرض ہے جن کا تعلق دینی مسائل سے ہے۔ ورنہ لغوی معنی کے اعتبار سے فتاویٰ کے اندر وہ تمام کتابیں داخل ہو جاتی ہیں جن میں کسی فن اور موضوع سے متعلق سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں ، خواہ وہ زبان وادب سے متعلق ہوں ، یا حدیث ورجال ، منطق وفلسفہ ، تصوف وکلام ، تاریخ وتفسیر وغیرہ کے بارے میں۔ فتاویٰ کی بعض کتابیں مختلف فنون کے مسائل پر مشتمل ہیں۔[1] اور بعض مجموعے ایسے بھی ہیں جن میں فتاویٰ کے ساتھ وہ رسائل بھی شامل کردیے گئے ہیں جو مؤلف نے کسی سوال کے جواب میں نہیں لکھے ، بلکہ ان کی حیثیت مستقل تالیف جیسی ہے۔[2] کتب فتاویٰ کا جائزہ لیتے وقت ان تمام امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ اس نام کی مختلف کتابوں کے درمیان موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے تمیز کرنا دشوار ہوگا۔

حنفی مسلک کے فتاویٰ کی کتابیں عام طور پر فقہی ابواب کی ترتیب پر مرتب ہوتی ہیں ، جواب میں اختصار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ کہیں تو صرف نعم ، اور لا میں جواب دیا جاتا ہے اکثر کتابوں میں تائید کیلئے اپنے مذہب کی فقہی کتابوں سے اقتباسات بھی درج ہوتے ہیں کہیں کہیں مسئلے کی مختلف صورتیں اور ان کے مختلف جوابات ذکر کئے جاتے ہیں بعض مصنفین نے جواب کی تعلیل کیلئے قیاس اور عقلی توجیہات کا بھی سہارا لیا ہے مگر کتاب وسنت کے نصوص پیش کرنے کا زیادہ اہتمام نہیں کیا ہے۔ اگر کہیں حدیثوں کا ذکر

---

[1] مثلاً علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی الحاوی للفتاوی۔

[2] جیسے "مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ" میں شامل رسالے اور کتابیں۔

آتا بھی ہے تو صحیح وضعیف اور مرفوع وموقوف کے درمیان کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ پورا زور اپنے مذہب کے مطابق کے مسائل کے تخریج یا اپنے مسلک کے مختلف علماء کے متعارض اقوال کے درمیان تطبیق وترجیح میں صرف ہوتا ہے۔ دوسرے مذاہب کے علماء کے اقوال بلادلیل درج کئے جاتے ہیں انکے بارے میں اصل مأخذ کی طرف رجوع کئے بغیر اطمینان نہیں ہوتا۔ کتب فتاویٰ کے ان ہی نقائص کے پیش نظر نواب صدیق حسن خانؒ انہیں خرافات اور افسانے قرار دیتے ہیں اور ان میں پڑ کر وقت ضائع کرنے سے روکتے ہیں۔[1] اس لئے کہ وہ عموماً ایسے بہت سے اقتباسات اور تفریعات پر مشتمل ہوتے ہیں جن کی تائید قرآن وحدیث سے نہیں ہوتی پھر ان مفتیوں کے اقوال ایک مسلک سے متعلق ہونے کے باوجود باہم اتنے مختلف ہیں کہ عقل حیران ہو جاتی ہے۔

مگر ان خرابیوں کے باوجود (اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ کتب فتاویٰ کا شمار تیسرے درجے کی کتابوں میں ہے) چند امور میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان سے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کے سماجی، سیاسی، تمدنی اور فکری حالات کی عکاسی ہوتی ہے ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کو کب کس طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے بارے میں علماء کا کیا موقف رہا۔ ہر زمانے اور ہر علاقے کے رسم و رواج اور مروجہ بدعات کی تصور بھی ان کتابوں سے سامنے آتی ہے۔ علماء کے فتاویٰ کا ردّعمل عوام پر کیا ہوتا تھا؟ سلاطین و امراء اور طلبہ وعوام سے ان کے تعلقات کیسے تھے؟ ہر زمانے میں کن علماء کو فتویٰ نویسی کے میدان میں شہرت ملی؟ ان کے علم وفہم اور فقہ وبصیرت کا کیا حال تھا؟ یہ اور ان جیسے بیسیوں امور ہیں جن کے لئے کتب فتاویٰ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ہمیں تاریخ وتذکرے کی قدیم کتابوں کے ساتھ کتب فتاویٰ کو نہ بھولنا چاہیے۔ بعض اہل علم اب اس جانب متوجہ ہوئے ہیں[2] اور فتاویٰ کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے لگے ہیں۔

---

[1] ابجد العلوم ۲/۳۹۵_۳۹۶

[2] دیکھئے۔ سعد غراب کا مضمون "کتب الفتاویٰ و قیمتها الاجتماعیه" در: حولیات الجامعة التونسیة (تونس) جلد ۱۶ ص ۶۵_۱۰۲

احناف کے مشہور فتاویٰ:۔

حنفی علماء کی کتب فتاویٰ میں سب سے زیادہ شہرت کی حامل ''فتاویٰ قاضی خاں'' (م ۵۹۲ھ) ہے یہ آج تک احناف کے یہاں مقبول اور متداول ہے۔ مفتیوں اور قاضیوں کا عموماً اسی پر اعتماد رہتا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں ایسے مسائل مع حوالہ جمع کئے ہیں جو عام طور پر پیش آتے ہیں اور جن کی ضرورت برابر ہی پڑتی رہتی ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اس میں متاخرین کے متعدد اقوال میں سے صرف ایک یا دو قول ذکر کئے ہیں اور مشہور اور راجح قول کو مقدم رکھا ہے۔ تاکہ فتویٰ دیتے وقت علماء کو دشواری نہ ہو۔ قاسم بن قطلوبغا کہتے ہیں کہ قاضی خاں جس بات کی تصحیح کر دیں اسے دوسروں کی تصحیح پر مقدم سمجھا جائے گا۔[1]

''فتاویٰ عالمگیری'' اور ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' کا ذکر آگے ہندوستانی علماء کی تالیفات کے ضمن میں آرہا ہے۔ ان کے علاوہ مطبوعہ کتابوں میں ''نوازل ابی اللیث السمرقندی'' (م ۳۹۳ھ) سب سے قدیم ہے، مصنف نے اس میں پچھلے فقہا کے وہ اقوال جمع کئے ہیں جو نوازل سے متعلق ہیں۔ یہ کتاب حیدر آباد سے ۱۳۵۴ھ میں شائع ہوئی ہے اور بہت ہی غلط چھپی ہے ضرورت ہے کہ اسے قدیم مخطوطات کی روشنی میں پھر ایڈٹ کیا جائے۔[2]

تاریخی اعتبار سے ان کے بعد ابوالحسن سعدی (م ۴۶۱ھ) کی ''النتف فی الفتاویٰ'' کا نمبر آتا ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر مسائل میں احناف کے علاوہ دیگر ائمہ و علماء کے اقوال بھی مصنف نے ذکر کئے ہیں اور فضول کی عقلی توجیہ و تعلیل سے احتراز کیا ہے اس طرح یہ قاضیوں اور مفتیوں کے لئے بہترین مرجع بن گئی ہے اس میں بہت سے فقہی قواعد کا بھی ذکر ملتا ہے جنہیں کتاب کے مرتب نے یکجا کرنے کی کوشش

---

[1] دیکھئے: الفوائد البہیۃ ص ۶۵

[2] سزگین نے تاریخ التراث العربی (جلد ۱ جز ۳ ص ۱۰۸) میں اس کے قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے انہیں اس کے طبع ہونے کا علم نہیں۔

کی ہے یہ کتاب بغداد سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

دیگر مطبوعہ کتابوں میں "الفتاویٰ الطرسوسیة" أنفع الرسائل إلی الوسائل إلی تحریر المسائل" نجم الدین الطرسوسی (م ۷۵۸ھ) "الفتاویٰ البزازیة" لابن البرازی (م ۸۲۷ھ) "الفتاویٰ الزینیة" لابن نجیم (م ۹۷۰ھ) "الفتاویٰ الحامدیة" لحامد آفندی القونوی (م /۹۸۵ھ) الفتاوی الخیریة لنفع البریة" لخیر الدین الرملی (م ۱۰۸۱ھ) اور الفتاویٰ الانقرویة "لمحمد بن الحسین الأنقروی (م ۱۰۹۸ھ) معروف ہیں ان میں سے ہر ایک پر تبصرہ کے لئے مقدمہ کے یہ صفحات کافی ہیں۔

غیر مطبوعہ:۔

فتاویٰ کی بعض کتابیں اب تک غیر مطبوعہ صورت میں قدیم کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں خاص طور پر "الفتاویٰ الکبری" و "الفتاویٰ الصغری" لحسام الدین الصدر الشہید (م ۵۳۶ھ) "التجنیس والمزید" للمرغینانی (م ۵۹۲ھ) "فتاویٰ التمرتاشي" (م ۶۱۰ھ) "الفتاویٰ الولوالجیة" للولوالجی (م ۷۱۰ھ) اور "فتاویٰ القاسم بن قطلوبغا" (م ۸۷۹ھ) قابل ذکر ہیں۔ فتاویٰ پر بعض منظوم کتابیں بھی لکھی گئیں، جیسے "فتاویٰ جلال الدین الترکمانی البتاني" (م ۷۹۳ھ) اور "فتاویٰ علی آفندی الطرابلسي" (م ۱۰۳۲ھ)

احناف کی تالیف کردہ کتب فتاویٰ کا یہ نہایت ہی مختصر جائزہ ہے۔ شافعی علماء کی بھی اس فن پر بہت سی تالیفات ہیں۔ جن میں تاریخی ترتیب سے حسب ذیل کتابیں مطبوعہ صورت میں دستیاب ہیں "فتاوی ابن الصلاح" (م ۶۴۳ھ) "الفتاویٰ المصریة" للعز بن عبدالسلام (م ۶۶۰ھ) "المنثورات وعیون المسائل المهمات"، یا "فتاویٰ النووی" (م ۶۷۶ھ) "فتاویٰ تقی الدین السبکی" (م ۷۵۶ھ) "الحاوی للفتاوی" للسیوطی (م ۹۱۱ھ) "الفتاویٰ الحدیثیة"

۱؎ المختف ۹۰۲-۸۸۰/۲

''الفتاویٰ الکبری الفقھیة'' لابن حجر الھیثمی (م ۹۷۴ھ) اور ''فتاویٰ شمس الدین الرملی'' (م ۱۰۰۴ھ) فتاویٰ ابن الصلاح[1] کو علماء وفقہا کے درمیان شہرت خاص طور پر علم منطق کی حرمت کے فتویٰ سے ہوئی [2]۔

صلاۃ الرغائب سے متعلق ابن الصلاح اور العزبن عبدالسلام کے درمیان جو اختلاف رائے ہوا تھا وہ بھی تاریخی شہرت کا حامل ہے۔ سبکی (م ۷۷۱ھ) نے ''طبقات الشافعیة الکبریٰ'' میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا ہے اس موضوع پر ان دونوں کے فتویٰ الگ سے بھی شائع ہو چکے ہیں [3]۔

امام العز بن عبدالسلام رحمہ اللہ:

کی مطبوعہ ''الفتاویٰ المصریة'' کے علاوہ ''الفتاویٰ الموصلیة'' بھی ہے جو اب تک طبع نہیں ہوئی ان دونوں کتابوں میں مصنف نے مصر اور موصل کے اندر پوچھے گئے مسائل کے جواب دیئے ہیں، نووی نے مختصر انداز میں بعض اہم مسائل سے متعلق لکھا ہے۔ ان کے فتاویٰ میں ایک خاص باب بعض مشہور حدیثوں کی صحت وضعف کی تحقیق پر مشتمل ہے [4]۔ امام نووی چونکہ بڑے محدث بھی تھے اس لئے ان کی تحقیقات کو بعد کے لوگوں نے بڑی اہمیت دی اور اکثر احادیث مشہورہ اور موضوعات سے متعلق تالیفات ہیں ان کے اقوال نقل کئے گئے۔ ان کا مجموعہ فتاویٰ کئی بار طبع ہو چکا ہے۔

تقی الدین سبکی رحمہ اللہ:

کے فتاویٰ ان کے لڑکے تاج الدین سبکی نے جمع کئے یہ مجموعہ دو جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکا ہے۔ سبکی نے فقہ واصول کے بہت سے مسائل پر تفصیل سے لکھا

---

[1] پہلے اس کا صرف ایک حصہ چھپا تھا، البتہ بیروت میں دو جلدوں پر مشتمل اس کا مکمل ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

[2] دیکھئے: فتاویٰ ومسائل ابن الصلاح ۱/۲۰۹-۲۱۲ (بیروت ۱۹۸۶ء) ایک نسخہ جامعہ سلفیہ میں ہے۔

[3] دیکھئے: ''مساجلة علمیة بین العز بن عبدالسلام وابن الصلاح حول صلاۃ الرغائب'' تحقیق: محمد ناصر الدین الالبانی، طبع دمشق، ایک مطبوعہ نسخہ جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں بھی ہے۔

[4] دیکھئے: فتاویٰ الامام نووی ص ۱۷۷-۱۹۳ (بیروت ۱۹۸۲ء) اس کا نسخہ جامعہ سلفیہ میں موجود ہے۔ [جاوید]

ہے اور مخالف وموافق دلائل کا جائزہ لیا ہے۔ سیوطی کی ''الحاوی'' ان کے ۸۳ مستقل رسالوں اور تفسیر، حدیث، فقہ، عقیدہ، لغت اور نحو وغیرہ سے متعلق ان کے چھوٹے بڑے سینکڑوں فتاوی پر مشتمل ہے، منظوم سوالات کے جواب میں انہوں نے منظوم فتوے لکھے، سیوطی اپنی وسعت معلومات کیلئے مشہور ہیں۔ تقریباً تمام فنون کی اکثر نادر و نایاب کتابوں پر ان کی نظر تھی، اس وجہ سے وہ کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے ہر فن کے مراجع وماً خذ سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور کہیں بھی کوئی بات بغیر حوالے کے نہیں لکھتے۔ ان کی کتابوں میں بس ایک چیز کھٹکتی ہے، وہ یہ کہ انھوں نے فتاوی اور دیگر تالیفات میں بہت سی ضعیف حدیثوں سے استدلال کیا ہے اور ان کے ضعف کی طرف اشارہ کئے بغیر گزر گئے ہیں۔ چونکہ احادیث کی سند کا بھی عموماً ذکر نہیں کرتے اس لئے قارئین کو (خصوصاً اگر وہ حدیث کے عالم نہ ہوں) یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ سب حدیثیں قابل استدلال اور صحیح ہیں۔

''**الفتاوی الحدیثیة**'' اور ''**الفتاوی الفقهیة**'' میں ابن حجر ہیثمیؒ نے بہت سے فقہی مسائل سے متعلق احادیث کی روشنی میں فتوے دیے ہیں۔ لیکن علم حدیث میں ان کی مہارت فقہ جیسی نہ تھی۔ اس لئے بہت سی جگہوں پر ٹھوکر کھا گئے خصوصاً عقائد کے بعض بنیادی مسائل کے بارے میں انہوں نے جو موقف اپنی اشعریت کے پیش نظر اختیار کیا ہے، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ پر جس طرح زبان طعن و ساز کی ہے وہ بڑا ہی افسوس ناک ہے۔ علامہ شمس الحقؒ عظیم آبادی کے استاد شیخ خیرالدین نعمان بن محمود آلوسی (م ۱۲۱۷ھ) نے اپنی بے نظیر کتاب ''**جلاء العینین فی محاکمة الاحمدین**'' میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے جس کے بعد پھر ابن حجر ہیتمی کے اعتراضات اور اتہامات کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔

علمائے شافعی کے فتاوی:۔

شافعی علماء کی کتب فتاوی مجموعی طور پر احناف کی کتابوں سے مسائل کی تحقیق،

دلائل کے ذکر مختلف مذاہب و اقوال کے درمیان موازنہ و ترجیح اور احادیث کے نقد و پرکھ کے باب میں بدرجہا بہتر ہیں۔ ان کی کتابوں میں جوابات بھی قدرے تفصیلی اور تشفی بخش ہوتے ہیں، دوراز کار تاویلات اور تفریعات و قیاسات بھی ان کے یہاں بہت کم ہیں۔

علماء مالکی کے فتاویٰ:۔

مالکی علماء نے بھی فتاویٰ اور ان کے متعلقات پر بے شمار کتابیں لکھیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل تین کتابیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان تینوں مجموعوں میں اکثر متقدمین علمائے مالکیہ کے فتاویٰ جمع ہیں۔ یہ تینوں ہی نویں صدی ہجری کی تالیف ہیں۔

پہلی کتاب البرزلی (م ۸۴۱ھ) کی "جامع الأحکام لمانزل من القضایا بالمفتین والحکام" جو "نوازل البرزلي" اور "احکام" یا "فتاویٰ البرزلي" سے بھی مشہور ہے اب تک یہ طبع نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے اس پر تفصیلی تبصرے کی ضرورت یہاں محسوس نہیں ہوتی۔ بعض مالکی فضلاء و محققین اسے ایڈٹ کر رہے ہیں کچھ لوگوں نے اس کتاب اور اس کے مؤلف سے متعلق تعارفی مضامین لکھے ہیں۔[1]

دوسری کتاب یحییٰ بن موسیٰ المازونی (م ۸۸۳ھ) کی " الدرر المکنونة في نوازل مازونة" جو "نوازل المازوني" سے مشہور ہے۔ اس میں تونس، بجایہ، الجزائر اور تلمسان وغیرہ کے متاخرین علمائے مالکیہ کے فتاویٰ جمع کیے گئے ہیں۔ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ بھی اب تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے قلمی نسخے مراکش کے مختلف سرکاری اور شخصی لائبریریوں میں موجود ہیں۔

تیسری کتاب جو سب سے اہم تصور کی جاتی ہے اور بارہ جلدوں میں چھپ چکی ہے وہ أحمد بن یحییٰ الونشریسی (م ۹۱۴ھ) کی " المعیار المعرب والجامع

---

[1] دیکھئے۔ النشرة العلمية للكلية الزيتونية، عدد اص ۱۲۹۔۲۳۳، اور حولیات الجامعة التونسیة، عدد ۶، ص ۶۵۔۱۰۲، عبدالرزاق الحمامی نے مقدمہ کتاب کے کچھ منتخبات حولیات الجامعة التونسیة، عدد ۲۴ ص ۱۷۷۔۲۱۵ میں شائع کیے ہیں۔

المغرب عن فتاویٰ أهل إفريقية والأندلس والمغرب" ہے[1] حال ہی میں اس کا نیا ایڈیشن دارالغرب الاسلامی سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے ایک مستقل جلد میں اس کے موضوعات ومسائل کی فہرست بھی کچھ لوگوں نے مل کر تیار کر دی ہے۔ یہ بھی کتاب کے ساتھ نئے ایڈیشن میں چھپی ہے۔

مالکی فقہ کی کتابوں سے برصغیر کے لوگ مانوس نہیں۔ ان میں مسائل وابواب کی ترتیب حنفی فقہ کی کتابوں سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ ان کی بعض مشہور ومعتمد کتابیں بڑے مغلق اور ادق اسلوب میں لکھی گئی ہیں مگر فتاویٰ کے اس مجموعے کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر علماء نے بڑے واضح اسلوب میں فتوے لکھے ہیں، ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ یہ فتاویٰ عام طور پر عوام اور طلبہ کے لئے لکھے جاتے ہیں اس لئے ان میں مشکل اسلوب سے اجتناب کیا جاتا تھا۔

ان تین مجموعوں کے علاوہ قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ) کے فتاویٰ کا ایک مختصر مجموعہ چھپا ہے۔ اس کے علاوہ مطبوعہ کتابوں میں "نوازل المهدی الوزانی" المعروف بالمعيار الجديد (۱۱ جلدیں)، "أجوبة عبدالقادر الفاسی"، "أجوبة أبی الحسن الصغير" يا "الدرالنثير"، "أجوبة محمد بن ناصر الدرعی" يا الأجوبة الناصرية"، "نوازل الشريف العلمی"، "نوازل ابن هلال الضهاجی السجلماسی"، "نوازل المسنادی"، "نوازل القاضی أبی عبدالله محمد بن عبدالعزيز بردلة الفاستی"، "نوازل أبی العباس أحمد بن محمد السوسی = نوازل الشيخ التاوی بن سورة"، "نوازل محمد بن الحسن المجاسی" الفاسی، "أجوبة محمد بن المدنی كنون المستاری" مالکی فقہاء کے فتاویٰ کے معروف مجموعے ہیں۔

---

[1] اس کتاب سے متعلق ایک مضمون E. AMAR نے ARCHIVES MAROCAINER VOLL.xii-xiii (1908-9) PP.522-536 میں لکھا ہے۔

حنبلی علماء کے فتاویٰ:۔

حنبلی علماء فتاویٰ کی کتابیں زیادہ دستیاب نہیں[1]۔ انہوں نے دوسرے مذاہب کے علماء کے مقابلے میں اس فن پر کم توجہ دی ہے فقہ پر تو ان کی بہت سی تالیفات ہیں۔ لیکن خاص طور پر فتاویٰ کے مجموعے زیادہ نہیں۔عموماً ان کا اعتماد اپنے مذہب کی مستند فقہی کتابوں پر رہتا ہے جو ابن قدامه (م ۶۲۰ھ) ابن مفلح (م ۶۷۳ھ) علاء الدين المرداوی (م ۸۸۵ھ) اور منصور البهوتي (م ۱۰۵۱ھ) کی تالیف کردہ ہیں۔

یہاں فتاویٰ کی مناسبت سے ان ''مسائل'' کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو امام احمد بن حنبل کے مختلف تلامذہ نے بطور سوال و جواب مدوّن کئے ہیں یہ مسائل فقہ و حدیث اور عقائد و اخلاق کے مختلف موضوعات سے متعلق ہیں ان کے جوابات امام احمد نے مختصر انداز میں دیے ہیں بسا اوقات ایک ہی مسئلے سے متعلق ان مجموعوں میں ان کی مختلف رائیں نظر آتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ امام احمد عموماً کسی حدیث یا اثر پر اعتماد کرتے ہوئے جواب دیا کرتے تھے۔ رائے اور قیاس کا ان کے یہاں بہت ہی کم استعمال ہوتا تھا۔ اس لئے کسی سوال کے جواب میں جو حدیث جب انہیں زیادہ مناسب حال معلوم ہوتی اس کے مطابق اپنی رائے دے دیا کرتے اسی طرح ایک ہی مسئلہ میں ان سے متعدد اقوال منقول ہو گئے۔ ''مسائل الإمام احمد'' نام کی تین کتابیں اب تک طبع ہوئی ہیں جو امام ابوداؤد السجستانی (م ۲۷۵ھ) عبداللہ بن احمد بن حنبل (م ۲۹۰ھ) اور ابن ہانی (م ۲۶۱ھ) کی مرتب کردہ ہیں۔ ان کے علاوہ اسحاق بن منصور الکوسج (م ۲۵۱ھ) اور ابوالقاسم البغوی (م ۳۱۷ھ) کے مرتب کئے ہوئے مسائل کے قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں[2]۔ ان دونوں کو بعض محققین ایڈٹ کر چکے ہیں ممکن ہے کہ

---

[1] بعض کتابوں کا ذکر سالم علی الثقفی نے ''مفاتيح الفقه الحنبلي'' جلد دوم (طبع دوم ۱۹۸۲) کے مختلف صفحات میں کیا ہے۔ دیکھئے اس کا اشاریہ بذیل: جوابات، مسائل، فتاویٰ لیکن ان میں سے اکثر مفقود ہیں۔

[2] تاریخ التراث العربی جلد ۱ جزء ۳ ص ۲۲۴

عنقریب شائع ہو جائیں۔ ان کے علاوہ امام احمد کے پانچ دیگر تلامذہ نے بھی ان کے مسائل جمع کیے تھے جن کے اقتباسات بعض کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ ابوبکر المرّوذی (م ۲۷۵ھ) امام ابراہیم الحربی (م۲۸۵ھ) حنبل بن اسحاق بن حنبل (م ۲۷۳ھ) حرب الکرمانی (م ۲۸۰ھ) اور عبدالملک المیمونی ((م ۲۷۴ھ))[1]۔

امام احمد کے ان تمام مسائل اور دیگر فقہی آراء کو چوتھی صدی کے شروع میں ابوبکر الخلال (م ۳۱۱ھ) نے "الجامع العلوم الإمام أحمد" المسند من مسائل الإمام أحمد" کے نام سے بیس حصوں میں جمع کیا تھا۔[2] اس کے بعض اجزاء مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔[3] ان میں سے وہ مسائل جن کے جواب امام احمد نے حلفیہ اسلوب میں دیئے ہیں۔ ابن ابی یعلی نے "المسائل التی حلف علیها الإمام أحمد بن حنبل " کے نام سے الگ کیے تھے، حال ہی میں یہ کتاب طبع ہو گئی ہے۔

اس مختصر جائزے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امام احمد نے بہت سے مسائل کے متعلق جواب دیئے ہیں، لیکن یہ عام طور پر زبانی ہوا کرتے تھے۔ اور ان کے تلامذہ انہیں کتابوں میں مدوّن کیا کرتے تھے۔ بعد میں حنابلہ کے یہاں "مسائل" کے نام سے متعدد کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن یہ کتابیں سوال و جواب کے طرز پر مرتب نہیں ہیں بلکہ فقہائے حنابلہ کے فقہی اختیارات اور آراء کے مجموعے ہیں جنہیں فتاویٰ کے بجائے عام فقہی کتابوں میں شمار کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ابن حامد (م ۴۰۳ھ) کی ایک کتاب "تهذيب الأجوبة" برلن کی لائبریری میں موجود ہے[4] مگر اس کے مشمولات اور اسلوب کا علم نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہنا دشوار ہے کہ فتاویٰ کا مجموعہ ہوگا۔

---

[1] ان کے مرتب کیے ہوئے مسائل کے لئے دیکھیے۔ (بالترتیب) طبقات الحنابلة لابن أبی یعلی ۱/۵۶-۶۳، ۸۶-۹۳، ۱۴۳-۱۴۵، ۱۴۵-۱۴۶، ۲۱۲-۲۱۶

[2] اعلام الموقعین ۱/۳۶

[3] تاریخ التراث العربی جلد ۱ جزء ۳ ص ۲۳۳-۲۳۴

[4] تاریخ التراث العربی جلد ۱ جزء ۳ ص ۲۴۰

امام ابن تیمیہؒ کا فتاویٰ:۔

فتاویٰ کے پورے ذخیرے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) کا مجموعہ فتاویٰ منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ ابن تیمیہ کا شمار اگرچہ حنبلی مکتب فکر کے علماء میں کیا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت انہیں مجتہد مستقل شمار کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ انہوں نے فقہی مسائل میں تقلید کے بجائے اجتہاد کی روش اختیار کی ہے، وہ تمام مسائل کی آزاد تحقیق کرتے ہیں۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین کے اقوال اور دلائل کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں اور جو رائے کتاب وسنت سے زیادہ قریب اور دلائل کے اعتبار سے زیادہ قوی ہوتی ہے اسے راجح قرار دیتے ہیں اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ائمہ اربعہ کے اقوال کی مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ طلاق ثلاثہ کے مسئلے میں کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ روش مقلدین حنابلہ کی روش سے قطعاً مختلف ہے کیونکہ وہ اپنے فقہی مسلک سے خروج کو کبھی برداشت نہیں کرسکتے۔ متاخرین نے جن کتابوں پر اپنا مذہب معلوم کرنے کے لئے اعتماد کیا ہے ان میں ابن تیمیہؒ کی فقہی تالیفات شامل نہیں۔ ابن تیمیہؒ کی حنبلیت دراصل عقائد اور اصول میں امام احمد بن حنبلؒ کے طرز اور اسلوب کی پیروی کے مترادف ہے اس انتساب کا فروعی مسائل میں ان کی تقلید سے کوئی تعلق نہیں خود امام احمد نے ہمیشہ تقلید کی بجائے عمل بالحدیث کی دعوت دی ہے، ان کا مشہور مقولہ ہے جو انہوں نے اپنے ایک شاگرد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: **لاتقلدني ولا تقلدن مالكا ولا الشافعيّ ولا الأوزاعيّ وخذ من حيث أخذوا**[1] (نہ میری تقلید کرو نہ مالک، شافعیؒ اور اوزاعیؒ کی، مسئلہ وہیں سے لو جہاں سے ان لوگوں نے لیا ہے) یہی روش امام ابن تیمیہؒ نے اختیار کی اور زندگی بھر اسی پر کاربند رہے۔ اس سلسلے میں انہیں اپنے ہم عصر علماء سے اذیتیں بھی برداشت کرنی پڑیں، مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور ہمیشہ اصول وفروع میں (اشعریت اور تقلید کے بجائے) عمل بالکتاب

---

[1] دیکھئے: اعلام الموقعین ۳۰۲/۲ ایقاظ ھمم اولی الابصار ص ۱۱۳ اسی مفہوم کا ایک دوسرا قول امام احمد سے جامع بیان العلم وفضلہ ۱۴۹/۲ میں ابن عبدالبر نے بھی نقل کیا ہے۔

والسنہ کی دعوت دیتے رہے۔ ان کی تمام کتابیں اس کی کھلی شہادتیں دیتی ہیں "رفع الملام عن الائمة الأعلام" میں انہوں نے ائمہ مجتہدین کو بعض صحیح احادیث کی مخالفت سے متعلق معذور سمجھنے کے لئے جو وجوہ و اسباب بیان کئے ہیں اور ایک طالب حق کو ان مسائل سے متعلق جو موقف اختیار کرنے کی دعوت دی ہے وہ کسی مقلد سے بعید ہے۔ ابن تیمیہؒ کے بعد ان کے تلمیذ رشید ابن القیمؒ (م ۷۵۱ھ) نے "إعلام الموقعین عن رب العالمین" میں تقلید و اجتہاد کے موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا اور جمود و تقلید کے بجائے کتاب و سنت کے نصوص پر عمل کرنے کی دعوت دی۔ تقلید کے مفاسد اور برے اثرات پر جس تفصیل کے ساتھ انہوں نے روشنی ڈالی ہے میری معلومات کی حد تک وہ بے نظیر ہے۔

پچھلی سطور میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے فقہی مسلک سے متعلق وضاحت اس لئے کرنی پڑی کہ کچھ لوگ انہیں فروع میں حنبلی سمجھتے ہیں اور اپنے اس تصور کے مطابق کہ اجتہاد کا دروازہ ائمہ مجتہدین کے بعد ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے انہیں مجتہد ماننے میں تامل کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ ان کے فتاویٰ کے مجموعہ پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا فقہی مسلک کیا ہے؟

امام ابن تیمیہؒ کے فتاویٰ اور مسائل کے متعدد مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں اخیر میں عبدالرحمٰن بن محمد بن قاسم اور ان کے لڑکے محمد نے تلاش و جستجو کے بعد جتنے فتاویٰ و رسائل مطبوعہ یا قلمی صورت میں دستیاب ہو سکے وہ سب اکٹھا کر دیے۔[۱] یہ مجموعہ "مجموعه فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیه" کے نام سے ۳۵ جلدوں میں ریاض سے کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ دو جلدوں میں اس کی فہرست بھی الگ سے چھپی

---

[۱] اس میں "منهاج السنة"، "اقتضاء الصراط المستقيم"، "الاستقامة" الصفدية"، "درء تعارض العقل والنقل"، "بيان تلبيس الجهميه"، "الردعلى المنطقيين"، "النبوات"، "الصارم المسلول"، "الكلم الطيب"، "المسودة في اصول الفقه" اور "الجواب الصحيح لمن بدّل دين المسيح" شامل نہیں ہیں "جامع الوسائل" کے نام سے محمد رشاد سالم نے دو جلدوں میں جو مجموعہ شائع کیا ہے، اس کے اکثر رسائل بھی اس مجموعے میں نہیں ہیں۔ باقی تمام چھوٹی بڑی الگ سے چھپی ہوئی کتابیں "مجموع الفتاویٰ" میں داخل ہیں۔

ہے۔ اسے مختلف علوم وفنون سے متعلق مسائل ومباحث کا ایک انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ اس میں تفسیر (جلد۱۳ تا ۱۷)، حدیث (جلد ۱۸) فقہ (جلد ۲۱ تا ۳۵، اصول فقہ (جلد ۱۹، ۲۰) عقیدہ (جلد ۱ تا ۸، ۱۲) ،تصوف (جلد ۱۰، ۱۱) اور منطق (جلد ۹) کے موضوعات پر بے نظیر بحثیں ملتی ہیں۔ امام ابن تیمیہ کو اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا عجیب ملکہ عطا کیا تھا وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ بڑے ہی آسان اسلوب میں لکھتے ہیں جسے سہل ممتنع کہا جاسکتا ہے[۱] عربی کی متوسط استعداد رکھنے والا بھی اس سے مستفید ہوسکتا ہے۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ کوئی بات بغیر دلیل کے نہیں کہتے آیات و احادیث سے ایسا برمحل استدلال کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ان کے استعمال کی سب سے مناسب جگہ یہی ہے۔ تیسری خصوصیت جو دوسری کتب فتاویٰ میں بہت کم نظر آتی ہے یہ کہ صرف صحیح حدیثوں پر اعتماد کرتے ہیں، ضعیف اور ناقابل استدلال حدیثوں کی واضح طور پر نشاندہی کرتے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ مسائل پر اتنی تفصیل سے کلام کرتے ہیں کہ ان کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ جاتا یہ اور ان جیسی بہت سی خصوصیات ہیں جن کی بناپر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے فتاویٰ کا مجموعہ اس فن کی تمام کتابوں میں ممتاز ہے۔ یہ مجموعہ معروف معنوں میں صرف فتاویٰ پر مشتمل نہیں بلکہ ان کے دوسرے بہت سارے رسائل ور تالیفات کو حاوی ہے اس لئے ہر طرح کے مباحث و مسائل سے متعلق امام ابن تیمیہؒ کا نقطہ نظر معلوم کرنے کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کے افکار سے بعد میں آنے والے تمام مصلحین و مفکرین بڑی حد تک متاثر ہوئے ان کے تلامذہ (امام ابن قیمؒ ،امام ابن کثیرؒ ،امام ذہبیؒ اور امام ابن عبدالہادیؒ وغیرہم کے علاوہ بہت سے فقہا مسائل کی تحقیق، احادیث کی چھان بین، اصول و فروع میں کتاب و سنت کی طرف براہ راست رجوع، سلف صالحین (صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اور ائمہ مجتہدین) کے مسلک کے اتباع، اختلافی مسائل میں دلائل

---

۱ یہاں میں منہاج السنہ ۱۵۸/۴۔۱۵۹ کی طرف قارئین کو توجہ دلانا چاہتا ہوں جہاں انہوں نے اپنے زمانے کے شعراء، خطباء اور انشاء پردازوں کے بے جان اور مقفی و مسجع اسلوب پر سخت تنقید کی ہے اور اسے خلاف فصاحت قرار دیا ہے۔

کی روشنی میں راجح قول کی تعیین اور کسی ایک مذہب کی سختی کے ساتھ پابندی کے بجائے اجتہاد اور آزادی فکر کی دعوت میں امام ابن تیمیہؒ کے ہم نوا ہیں۔ عصر حاضر میں انہیں ''سلفی، اثری، انصارالسنہ'' یا ''اہل حدیث'' کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے تقلیدی فقہ کی بجائے فقہ حدیث (یا فقہ سنت) کی دعوت دی۔ ہندوستان میں نواب صدیق حسن خانؒ، (شیخ الکل) سید نذیر حسین اور ان کے تلامذہ، مصر میں احمد محمد شاکر، محب الدین خطیب، سید رشید رضا اور محمد حامد الفقی، شام میں طاہر الجزائری، جمال الدین القاسمی، محمد راغب، الطباخ اور محمد بہجۃ البطیار، عراق میں محمد بہجۃ الاثری، سعودی عرب میں عبدالرزاق حمزہ، محمد نصیف، عبدالرحمٰن المعلمی اور امام العصر ابن بازؒ وغیرہ، مراکش میں محمد العربی، تقی الدین الہلالی اور ان کے تلامذہ، الجزائر میں عبدالحمید بن بادیس، اور اس وقت اردن میں مقیم محمد ناصر الدین البانیؒ سلفی فکر کے اساطین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان علماء کی کوششوں سے عصر حاضر میں سلفی رجحان کو بڑا فروغ ہوا اور اس کا اثر تمام مکاتب فکر پر پڑا ہے۔ اس کی نمایاں مثال یہ ہے اب مصر، شام، کویت اور سعودی عرب میں فقہی مسائل پر غور کرنے کے لئے کمیٹیاں بنی ہیں جو مختلف مکاتب فکر کے علماء پر مشتمل ہیں۔ وہاں مسائل پر غور و خوض کرتے وقت تمام ائمہ سلف کی آراء سے استفادہ کیا جاتا ہے اور دلائل کی روشنی میں راجح قول کے مطابق فتویٰ دیا جاتا ہے آج ہمیں کسی ایک مسلک کی تقلید کے بجائے مسائل کے حل کے لئے یہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔[1]

---

[1] عصر حاضر میں عرب علماء نے فتویٰ کے بہت سے مجموعے مرتب کئے ہیں جن کا جائزہ انشاء اللہ کسی دوسری فرصت میں لیا جائے گا ان میں چار علمائے حرمین کے فتاویٰ ''قرۃ العین'' (قاہرہ ۱۹۳۷) علمائے نجد کے فتاویٰ و رسائل ''مجموعة الرسائل والمسائل النجدية'' (طبع قاہرہ) شیخ الازہر محمود شلتوت کے ''فتاویٰ'' (قاہرہ ۱۹۵۹) یوسف القرضاوی کی ''ھدی الاسلام فتاوی معاصرة (قاہرہ ۱۹۸۱) احمد الشرباصی کی ''یسالونك'' ۴ جلدیں (بیروت ۱۹۷۷) عبداللہ القلقیلی مفتی اردن کے ''الفتاوی الاردنیة'' (دمشق ۱۹۶۹) مشہور ہیں

(۳)

برصغیر پاک و ہند کے مطبوع و غیر مطبوع فتاویٰ:

برصغیر پاک و ہند میں فتاویٰ کے جو مجموعے تیار ہوئے ان میں سے اکثر حنفی علماء کے تالیف کردہ ہیں۔[1] جنوبی ہند میں کچھ شافعی علماء نے بھی اس فن پر کتابیں لکھی ہیں[2] گزشتہ دو صدیوں میں اہل حدیث علماء نے بھی فتاویٰ کے مجموعے شائع کیے[3]۔ ان تمام کتابوں پر تبصرہ یہاں مقصود نہیں کیوں کہ ان میں بہت سی اب مفقود ہیں بعض کے قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں کچھ طبع بھی ہوئی ہیں مگر ان کا حاصل کرنا دشوار ہے ان میں سے چند اہم مجموعوں کا مختصر جائزہ لینا کافی ہوگا جس سے مختلف مکاتب فکر کی مستند کتب فتاوی اور ان کی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اس صدی کے اوائل تک فتاویٰ کی اکثر کتابیں عربی یا فارسی زبان میں تھیں، ادھر سو سال سے فتاویٰ عموماً اردو میں لکھے جانے لگے ہیں فتوی پوچھتے وقت سائل عام طور پر کسی مستند عالم دین یا معروف مدرسے کی طرف رجوع کرتا ہے جہاں شعبۂ افتاء قائم ہوتا ہے وہاں فتاویٰ صادر کرتے وقت ان کے نقول محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد فقہی تبویب و ترتیب کے ساتھ افادہ عام کی خاطر انہیں مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ بہت سے اداروں کے فتاویٰ اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکے ہیں۔ مطبوعہ مجموعوں میں ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' مشہور ہے۔

بعض علماء اور ادارے والوں نے اپنے زیر اہتمام شائع ہونے والے دینی پرچوں میں باب الفتاویٰ کے تحت بہت سے فتاویٰ شائع کیے۔ ان میں سے کچھ کتابی

---

[1] دیکھیے: الثقافة الإسلامية في الهند ص ۱۰۸-۱۱۱

[2] ان کا ذکر محمد یوسف کوکن عمری نے اپنی کتاب ARABIC AND PARSIAN IN CARNATIC کے مختلف صفحات میں کیا ہے۔

[3] دیکھیے: ''ہندوستان میں اہلِ حدیث کی علمی خدمات (از ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی) اور مقدمہ فتاویٰ علمائے حدیث جلد اول (از ابوالحسنات علی محمد سعیدی)۔

شکل میں بھی چھپ چکے ہیں۔ کچھ فتوے اپنی علمی اہمیت اور مسئلے کی دینی نزاکت کے پیش نظر الگ سے پمفلٹ اور کتابچے کی شکل میں بھی شائع ہوئے، جیسے مولانا شمس الحق عظیم آبادی کا فتویٰ بابت مصافحہ و معانقہ بعد العیدین، اور فتویٰ ردِ تعزیہ داری وغیرہ۔ اس طرح کے سینکڑوں کتابچے اس صدی میں طبع ہو چکے ہیں۔

برصغیر میں فتاویٰ پر گزشتہ صدی تک کی عربی تالیفات میں سے صرف "الفتاوی الغیاثیة"، "الفتاوی الحمادیة" اور "فتاویٰ عالمگیری"، "الفتاوی الهندیة" اب تک زیورِ طبع سے آراستہ ہو سکی ہیں۔ حسب ذیل گیارہ مجموعے قلمی صورت میں برصغیر کے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔[1]

۱۔ الفتاویٰ السراجیة:

تالیف: سراج الدین عمر بن اسحاق الغزنویؒ (م ۷۷۳ھ) مخطوطہ در خدا بخش لائبریری (پٹنہ)۔

۲۔ فتاویٰ قاری الهدایة:

تالیف: سراج الدین عمر بن اسحاق الغزنویؒ۔ مخطوطہ در رضا لائبریری (رامپور)

۳۔ الفتاویٰ التاتارخانیة:

تالیف: عالم بن علاء الحنفی (م ۷۸۶ھ) اس کا مکمل نسخہ احمد آباد کے کتب خانہ پیر محمد شاہ میں موجود ہے۔ آصفیہ لائبریری (حیدر آباد) دارالکتب (قاہرہ) اسلامیہ کالج (پشاور) رضا لائبریری (رامپور) اور خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں اس کی متفرق جلدیں موجود ہیں۔

---

[1] ان میں سے اکثر کتابوں اور ان کے مخطوطات کا ذکر زبیر احمد نے اپنی کتاب THE CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC, LITERATURE (LAHORE 1967) کے مختلف صفحات میں کیا ہے۔ نمبر ۸، ۹، ۱۰ پر مذکورہ کتابوں کی طرف اشارہ جمیل احمد نے "حرکة التالیف باللغة العربیة الاقلیم الشمالی الهندی "(دمشق ۱۹۷۷) (ص ۲۱۴، ۲۱۵، ۳۶۱] میں کیا ہے

۴۔ فتاویٰ ابراہیم شاہیہ (نسخہ عربی):

تالیف: القاضی نظام الدین احمد بن محمد الگیلانی (م ۸۷۴ھ) یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا عبادات سے متعلق، اور دوسرا معاملات سے متعلق۔ اس کے قلمی نسخے بوہار لائبریری، پٹنہ، آصفیہ، رامپور انڈیا آفس اور پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔

۵۔ حسب المفتی:

تالیف: القاضی عبدالمعالی البخاری (دسویں صدی ہجری) اس کے قلمی نسخے پٹنہ، رامپور، انڈیا آفس اور دارالکتب (قاہرہ) میں موجود ہیں۔

٦۔ فتاویٰ اکبر شاہی:

تالیف: عتیق اللہ بن اسماعیل بن قاسم (در عہدِ اکبر ۹٦۳۔۱۰۱۴ھ) اس کا مخطوطہ آصفیہ لائبریری میں موجود ہے۔

۷۔ الفتاویٰ النقشبندیہ:

تالیف: معین الدین خواجہ النقشبندی (م ۱۰۸۵ھ) مخطوطہ در پٹنہ و رام پور۔

۸۔ جنگ مسائل:

تالیف: الملا محمد غفران بن تائب (م ۱۲٦۰ھ) اس کے دو مخطوطے رام پور میں ہیں۔

۹۔ الفتاویٰ الشرفیہ:

تالیف: المفتی شرف الدین (م ۱۲٦۸ھ) اس کا مخطوطہ رام پور میں ہے۔

۱۰۔ فتاویٰ الشرفیہ:

تالیف: أبی البرکات تراب علی اللکنوی (م ۱۲۸۱ھ) اس کا قلمی نسخہ ایشیا ٹک سوسائٹی (کلکتہ) کی لائبریری میں موجود ہے۔

۱۱۔ فتاویٰ مختصر شافعی:

تالیف: الشیخ میاں الملکنوی (؟) اس کا مخطوطہ بھی ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے۔

ان کتابوں میں سب سے قدیم ''الفتاویٰ الغیاثیۃ'' ہے جو سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد (۶۶۴۔۶۸۶ھ) کی تالیف اور اسی کی طرف منسوب ہے یہ غالباً ہندوستان میں فتاویٰ کا سب سے پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے مؤلف داؤد بن یوسف الخطیب ہیں[۱]۔ ان کے حالات تذکرے اور سوانح کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ کتاب مختصری ہے اس کی مقبولیت ومرجعیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دسویں صدی میں سندھ کے عالم محمد جعفر بوبکانی (م۹۴۹ھ) نے اپنی مشہور فقہی تالیف ''المتانۃ فی خزانۃ'' میں کئی مقامات پر اس کے حوالے سے متعدد مسائل نقل کئے ہیں (۱۳۲۲ھ میں) یہ مطبع بولاق (قاہرہ) سے شائع ہوئی تھی اس کے قلمی نسخے بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں[۲]۔

فتاویٰ تاتارخانیہ:

کا شمار بھی اہم کتابوں میں ہوتا ہے[۳]۔ اس کا اصل نام ''زاد المسافر'' یا ''زادالسفر'' امیر تاتارخاں کے نام سے منسوب ہو کر ''تاتارخانیہ'' کہلاتا ہے[۴]۔ مصنف نے اس میں فقہ حنفی کے ۲۷ مآخذ سے استفادہ کیا ہے اور ہر ایک کیلئے ایک علامت مقرر کی ہے۔ کتاب کے ابواب ''ھدایہ'' کی ترتیب پر ہیں۔ اس کی ضخامت اور اہمیت کے پیش نظر ابراہیم بن محمد حلبی (م۹۵۶ھ) نے ایک جلد میں اسکی تلخیص کی اور اس سے وہ نادر اور کثیر الوقوع مسائل منتخب کئے، جو متداول کتابوں میں نہیں ہیں۔ بعد کی

---

[۱] دیکھئے: ایضاح المکنون ۱۵۷/۲، بروکلمان (تکملہ) ۹۵۱/۲، معجم المطبوعات ص ۸۲۸ کشف الظنون ۱۲۱۳/۲ میں مؤلف کا نام مذکور نہیں۔

[۲] اس کے تفصیلی تعارف کے لئے دیکھئے برصغیر پاک وہند میں علم فقہ (از محمد اسحاق بھٹی) ص ۴۳۔۶۰

[۳] کشف الظنون ۲۶۸/۱

[۴] کشف الظنون حوالہ مذکور، نیز ۹۴۷/۲، نزہۃ الخواطر ۶۷/۲

[۵] دیکھئے: برصغیر پاک وہند میں علم فقہ ص ۱۱۵۔۱۲۵

اکثر فقہی کتابوں میں تاتارخانیہ سے استفادہ کیا گیا ہے۵۔ قاضی سجاد حسین نے یہ کتاب متعدد قلمی نسخوں کی بنیاد پر ایڈٹ کی ہے۔ وزرات تعلیم و ثقافت (حکومت ہند) کی مالی امداد سے جلد ہی اس کی اشاعت ہونے والی ہے۔

فتاویٰ حمادیہ:

تیسری اہم کتاب ''فتاویٰ حمادیہ'' ہے نویں صدی ہجری میں گجرات کے مفتی رکن الدین ناگوری نے قاضی حمادالدین گجراتی کے حکم سے اس کی تصنیف کی، اور اس سلسلے میں تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول کی دو سو چار کتابوں سے استفادہ کیا اور ان سے فقہی مسائل جمع کئے ۱۔ اس کی تالیف میں مؤلف کے لڑکے مفتی داؤد نے بھی ان کی معاونت کی تھی۔ کتاب کافی ضخیم ہے صرف ایک بار کلکتہ میں ۱۲۴۱ھ میں طبع ہوئے تھی۔ اب نادر و نایاب ہے۔ اس کے متعدد قلمی نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری اور دوسری کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں ۲۔

فتاویٰ عالمگیری:۔

چوتھی اور سب سے اہم اور مشہور کتاب ''فتاویٰ عالمگیری'' یا ''الفتاویٰ الهندية'' ہے جسے علمائے احناف کی ایک جماعت نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مرتب کیا اس کی تالیف میں کم وبیش آٹھ سال ۳ (۱۰۷۴ تا ۱۰۸۲ھ) کی مدت صرف ہوئی۔ کام کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا جن میں سے ہر حصہ ایک عالم کے سپرد ہوا اور اس کی امداد و اعانت کے لئے دس اور علماء مقرر ہوئے۔ صدارت کے فرائض شیخ نظام الدین برہان پوری (م ۱۰۶۲ھ) کے سپرد تھے۔ اس طرح تقریباً چالیس علماء وفقہا اس کتاب کی تالیف میں شریک رہے۔ ان سب کے نام کسی تذکرہ میں یکجا نہیں ملتے۔

---

۱ نزهة الخواطر ۷/۳۱

۲ تفصیلی تعارف کے لئے دیکھئے: برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۱۲۶۔۱۶۴۔

۳ محمد اسحاق بھٹی نے اپنی کتاب (ص ۲۶۷) میں ''دو سال'' لکھا ہے جو قرین قیاس نہیں۔

تلاش و جستجو کے بعد بعض محققین نے ان میں سے ۲۸۔۲۹ علماء کا پتہ چلایا ہے اور ان سے متعلق معلومات جمع کی ہیں ۔[1] ان میں وہ چار علماء جنھیں ایک ایک ربع تفویض کیا گیا تھا یہ ہیں: قاضی محمد حسین جونپوری (م ۱۰۸۰ھ) ملا محمد اکرم الاہوری (م ۱۱۱۶ھ) سید جلال الدین محمد مچھلی شہری اور شیخ وجیہ الدین گوپاموی (۱۰۸۳ھ)[2]

فتاویٰ عالمگیری کو بعض خصوصیات کی وجہ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں جو مسائل بیان کیے گئے ہیں وہ یا تو راجح اور مفتی بہ ہیں یا کتب ظاہر الروایۃ کے ہیں ایسے مسائل بہت کم درج کیے گئے ہیں جو شاذ اقوال پر مبنی ہیں۔ اختلاف اقوال کی صورت میں سیر حاصل بحث کے بعد صرف وہی قول ذکر کیا گیا ہے جو راجح ہے۔ جملہ مسائل پر بحث و تمحیص اور ان کی تشریح و توضیح میں کمالِ احتیاط اور ذہانت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مسائل کی تکرار اور متن میں حشو و زوائد سے پرہیز کیا گیا ہے اور چونکہ یہ علمائے فقہ کی ایک جماعت کی تگ و تاز علمی کا نتیجہ ہے اس لئے ضخامت کے باوجود ان اغلاط و اسقام اور نقائص و عیوب سے بڑی حد تک پاک ہے جو عام طور پر دوسری فقہی کتابوں میں نظر آتے ہیں اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر مسئلہ کے ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کی اصل عبارت نقل کی گئی ہے اس کے مآخذ و مصادر کی تعداد ۱۳۰ سے بھی زیادہ ہے ان میں فقہ حنفی کی تمام اہم اور قابل ذکر کتابیں شامل ہیں ابواب کی تقسیم اور مضامین کی ترتیب ''ہدایہ'' کے طرز پر ہے جس کی وجہ سے تلاشِ مسائل میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ فتاویٰ عالمگیری کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اسے تمام

---

[1] دیکھئے: معارف (اعظم گڑھ) ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ تک کے مختلف شمارے، ''مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین ۱۹۲۵ تا ۱۹۷۰'' میں صادق علی دلاوری کا مضمون ''فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین'' برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۲۶۹۔۳۴۱، اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۱۴۸/۱۵۔۱۴۹) از بزمی انصاری و ۱۵۰/۱۵۔۱۵۵ (تعلیقہ، از محمد اسحاق) الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند ص ۱۱۰، ۱۱۱، زبیر احمد ص ۴۲۔۴۷

[2] یہ نام بزمی انصاری نے اپنے مقالے میں ذکر کیے ہیں (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۱۴۷/۱۵) عبدالحیٔ حسنی ''الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند'' (ص ۱۱۱) میں آخر الذکر دونوں علماء کے بجائے شیخ علی اکبر حسینی (م ۱۰۹۰ھ) اور شیخ حامد جونپوری کے نام مرآۃ العالم کے حوالے سے لکھے ہیں۔

عالم اسلام میں قبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ ہندوستان مصر اور بیروت میں وہ بار بار چھپی۔ اس کے فارسی اور اردو اور (بعض مباحث میں) انگریزی ترجمے بھی ہوئے۔ ہندوستان کی انگریزی عدالتوں میں مسلمانوں کے شرعی مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک مدت تک فتاویٰ عالمگیری پر عمل ہوتا رہا۔ آج بھی مفتی، قاضی اور محقق علماء اس پر اعتماد کرتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے قبل اس حقیقت کا اظہار کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فتاویٰ کی مذکور بالا تمام کتابیں دراصل منتخب فقہی مسائل کے مجموعے ہیں جن کی تالیف اس مقصد کے پیش نظر عمل میں آئی ہے کہ مفتیوں، قاضیوں اور فقہیوں کو اپنے مذہب کے مفتی بہ اقوال معلوم کرنے میں مدد ملے اور ان کے مطابق مختلف مسائل میں لوگوں کی رہنمائی اور شرعی عدالتوں میں مقدمات کے فیصلے صادر کرنا آسان ہو۔ یہ مجموعے شخصی فتاویٰ سے کئی اعتبار سے مختلف ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان میں استفتاء اور افتاء کی صورت نہیں ہوتی ۔ دوسری یہ کہ ان میں تمام ممکن الوقوع مسائل فقہ کی مختلف کتابوں سے جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح انہیں ایک مسلک کی فقہی آراء کا انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ ان سے کسی مخصوص زمانے میں پیش آئے ہوئے مسائل اور مشکلات کا علم نہیں ہوتا کیونکہ ان میں عام طور پر پچھلی کتابوں کے اقتباسات ہوتے ہیں۔ اپنے زمانے کے مسائل کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی جاتی چنانچہ کسی مخصوص زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات، مختلف فکری رجحانات ، رسم و رواج اور بدعات و خرافات کا پتہ چلانے کے لئے ان کتابوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہتی لیکن انہیں شخصی فتاویٰ پر یک گونہ فضیلت اس وجہ سے ہے کہ ان میں عام طور سے مذہب کے مفتی بہ اور راجح اقوال ذکر کیئے جاتے ہیں شخصی فتاویٰ میں ہر عالم کی ذاتی رائے درجہ ہوتی ہے جو ممکن ہے مفتی بہ قول کے خلاف ہو۔ یہ بہر حال دونوں طرز کی کتب فتاویٰ اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔

اس مختصر وضاحت کے بعد جب ہم گزشتہ صدی تک فتاویٰ کے فارسی مجموعوں

پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں عربی کتابوں کی طرح اہمیت اور شہرت کی حامل کوئی کتاب نہیں ملتی ان میں سے اکثر تو دستبر دِزمانہ کی نذر ہو چکی ہیں جو بچی ہیں وہ بھی مختلف کتب خانوں میں قلمی صورت میں پڑی ہیں اور بہت کم ان کی طرف توجہ دی گئی ہے مطبوعہ کتابیں چند ایک ہیں جن تک مکہ مکرمہ میں ہماری رسائی نہ ہو سکی۔ ذیل میں ان تالیفات پر مختصر تبصرہ اپنی یاداشت اور چند مآخذ و مراجع پر اعتماد کرتے ہوئے کیا جارہا ہے۔

قلمی کتابوں میں ''فتاویٰ قراخانی'' ''فتاویٰ ابراہیم شاہی'' ''(نسخہ فارسی)'' ''فتاویٰ امینیہ'' اور ''فتاویٰ بابری'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے عہد (۶۸۸۔۶۹۵ھ) کی تالیف ہے اس کے اصل مصنف کا نام صدر الدین یعقوب مظفر کرمانی ہے اس کی وفات کے بعد اس کو موجودہ شکل میں قبول فراخان نے مرتب کیا۔ اسی کی نسبت سے سے فتاویٰ قراخانی کہا جاتا ہے۔ کتاب شروع سے آخرت تک سوال و جواب کی صورت میں ہے۔ اس کے متعدد قلمی نسخے انڈیا آفس (لندن) آصفیہ (حیدر آباد) ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) پنجاب یونیورسٹی (لاہور) اور پنجاب پبلک لائبریری (لاہور) میں موجود ہیں[1]۔ کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر سوال کا جواب دیتے ہوئے کسی مستند فقہی کتاب سے اقتباس دیا گیا ہے۔ ماخذ خواہ عربی ہو یا فارسی اس کی اصل عبارت نقل کی گئی ہے۔

فتاویٰ ابراہیم شاہی:

قاضی احمد بن محمد جونپوری (م۸۴۷ھ) کی تالیف ہے۔ حاجی خلیفہ کے بقول[2] یہ فتاویٰ قاضی خان کی طرح مبسوط و مفصل کتاب ہے۔ مصنف نے ۱۶۰ کتابوں کی مدد سے سلطان ابراہیم شرقی والی جونپور (۸۰۴۔۸۴۴ھ) کے لئے اس کی جمع وتدوین کی۔ فتاویٰ عالمگیری کے مقدمہ میں اس کا غیر معتبر کتابوں میں شمار کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ قاضی شہاب الدین دولت آباد کی تصنیف ہے مگر یہ درست نہیں یہ کتاب

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے: برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۶۱۔۹۸

[2] دیکھئے: برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۱۶۷۔۱۶۸، نیز معارف (اعظم گڑھ) مئی ۱۹۳۰

پہلے غالباً عربی میں لکھی گئی جس کے متعدد نسخوں کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اسے فارسی میں بھی لکھا۔ اس کے حصہ اول (جو عبارت سے متعلق ہے) کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔[1]

فتاویٰ امینیہ:

۹۴۸ھ کے قریب مرتب کی گئی۔ مقدمہ میں مؤلف اپنا نام محمد امین عبیداللہ مومن آبادی بتاتا ہے اور لکھتے ہیں کہ اس نے اپنی عمر اور دورِ شباب کا بڑا حصہ بخارا میں اجلہ فقہاء کی صحبت میں گذارا۔ پھر اسے شوق پیدا ہوا کہ وہ فتاویٰ کا ایک مجموعہ تیار کرے۔ چنانچہ یہ کتاب لکھی۔ مصنف کے حالات، تذکرہ اور سوانح کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً وہ ہمایوں کے عہدِ حکومت میں بخارا سے ہندوستان آئے تھے کتاب عام فقہی کتابوں کی طرز پر مرتب ہے اس میں جا بجا فقہ حنفی کے مشہور ماخذ کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ بالخصوص مختار الاختیار سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے قلمی نسخے ایشیاٹک سوسائٹی، آصفیہ اور پنجاب یونیورسٹی لاہور میں موجود ہیں۔[2]

فتاویٰ بابری:

"فتاویٰ بابری" مشہور مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کے زمانے (۸۹۹۔۹۳۹ھ) کی تصنیف ہے۔ اسکے مصنف شیخ نور الدین خوانی کے حالات متداول کتابوں میں نہیں ملتے اتنا معلوم ہے کہ وہ زین الدین خوانی کی اولاد میں سے ہیں۔ کتاب کے دیباچہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۹۲۵ھ کے اواخر میں بابر کی خدمت میں ان کو بازیابی حاصل ہوئی اور اسی کے حکم سے فتاویٰ کا یہ مجموعہ تیار کیا جس میں فقہ حنفی کی کئی مستند کتابوں پر اعتماد کیا ہے اور ہر ایک کیلئے ایک علامت مقرر کی ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے پٹنہ اور برہان پورہ میں موجود ہیں۔[3]

---

[1] دیکھئے: برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۱۶۷۔۱۶۸، نیز معارف (اعظم گڑھ) مئی ۱۹۳۰

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے: کتاب مذکور ص ۱۹۷۔۲۲۱

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے: کتاب مذکور ص ۲۳۳۔۲۴۴ نیز معارف (اعظم گڑھ) جولائی ۱۹۵۰

مطبوعہ فارسی کتب فتاویٰ:

مطبوعہ فارسی کتب فتاویٰ میں شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) کی ''فتاویٰ عزیز'' اور مفتی سعداللہ مراد آبادی (م ۱۲۹۴ھ) کی ''الفتاویٰ السعدیہ'' مشہور ہے۔ ''فتاویٰ عزیزی'' اب تک کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن دو جلدوں پر مشتمل ۱۸۹۴۔۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اردو ترجمہ بھی ''سرورعزیزی'' کے نام سے عبدالواجد غازی پوری نے ۱۳۲۲ء اور ۱۳۲۳ء میں کیا تھا جو دو حصوں میں چھپا ہے اس ترجمہ کا نیا ایڈیشن جدید ترتیب وتبویب کے ساتھ کراچی سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا ہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے وقت کے بعض اہم مسائل سے متعلق اپنی رائے کا بے لاگ اظہار کیا ہے انہوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا جو فتویٰ دیا تھا اس کے بڑے دور رس اثرات ظاہر ہوئے، انگریزوں کے خلاف جہاد کی تحریک کے لئے یہ بڑا ممد و معاون ثابت ہوا۔ بہت سے فقہی مسائل میں انہوں حنفی مذہب کی تقلید کے بجائے اجتہاد اور آزادی فکر کی روش اختیار کی ہے اور ہندوستان میں فتویٰ نویسی کی تاریخ میں پہلی بار فقہ حنفی کی کتابوں پر انحصار کے بجائے براہ راست قرآن و حدیث سے استدلال اور تمام ائمہ مجتہدین کے اقوال و آراء سے استفادہ کی طرح ڈالی۔ اس حیثیت سے ان کے فتاویٰ کا مجموعہ بڑی اہمیت کا حامل اور خصوصی توجہ کا طالب ہے یہاں موقع نہیں کہ ان کے فتاویٰ کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ امید کہ ہمارے محققین اس طرف متوجہ ہوں گے۔

فارسی فتاویٰ کے اور بھی کئی مجموعے ہیں لیکن دستیاب نہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ فارسی میں لکھے گئے ہیں یا عربی میں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر اب ناپید ہیں۔ اس لئے شاید ان کا ذکر یہاں مفید ہے[1] گزشتہ صدی تک فتاویٰ کے عربی و فارسی مجموعوں کا ایک جائزہ لینے کے بعد اب چودھویں صدی میں تالیف کی ہوئی بعض اہم کتابوں پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

اس صدی میں حنفی اور اہل حدیث مکتب فکر کے بہت سے علماء نے فتویٰ نویسی

[1] دیکھئے: الثقافة الاسلامية في الهند ص ۱۰۸۔۱۰۹

کے میدان میں شہرت حاصل کی اور مفتی کے لقب سے معروف ہوئے مگر ان میں سے چند ہی علماء کے فتاویٰ کتابی شکل میں مدوّن ہو کر شائع ہوئے۔ ہم یہاں دونوں مکتب فکر کی نمائندہ کتابوں کا ذکر کریں گے اور ان کی خصوصیات کی طرف اشارہ کریں گے۔

دیوبندی حنفی فتاویٰ:

علمائے احناف میں مولانا عبدالحیٔ لکھنوی (م ۱۳۰۴ھ) مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) مولانا خلیل احمد سہارنپوری (م ۱۳۴۶ھ) مولانا عزیز الرحمٰن دیوبندی (م ۱۳۴۷ھ) مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۳۶۲ھ) مفتی کفایت اللہ دہلوی (م ۱۳۷۲ھ) اور مفتی محمد شفیع (م ۱۳۹۶ھ) کے فتاویٰ قابل ذکر ہیں۔

فتاویٰ عبدالحیٔ:

تین حصوں میں عربی فارسی اور اردو تینوں ہی زبانوں کے فتاویٰ کا غیر مرتب مجموعہ ہے جو بار بار چھپ چکا ہے۔ اسکا مکمل اردو ایڈیشن (عربی اور فارسی فتاویٰ کے ترجمے کے بعد نئی ترتیب وتبویب کیساتھ کراچی سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا ہے۔ مولانا عبدالحیٔ نے بعض مسائل میں حنفی مسلک کے خلاف بھی فتوے دیے ہیں۔ یہ روش انکے ہم مذہب دوسرے علماء کو پسند نہ آئی۔ چنانچہ انہیں اردو ایڈیشن میں جابجا تنقید وتوضیح کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ قارئین مولانا عبدالحیٔ کے نظریات سے متاثر نہ ہوں۔ فتاویٰ کا یہ مجموعہ مولانا کے تبحر علمی، دقت نظر، وسعتِ معلومات اور فقہ و حدیث میں انکی مہارت کی کھلی شہادت ہے۔ افسوس کہ علمائے احناف نے انکی آراء سے استفادہ نہیں کیا ورنہ انکے یہاں وہ جمود اور تعصب باقی نہ رہتا جس کیلئے وہ ہر زمانے میں مشہور رہے ہیں[1] اور آج تک اپنی اسی روش پر قائم ہیں[1]۔ مولانا عبدالحیٔ نے ایک کتاب "نفع المفتی والسائل بجمع متفرقات المسائل" بھی لکھی ہے جس میں مختصر انداز میں مسائل

---

[1] اس کی شہادت شیخ الاسلام نے ابن تیمیہ نے "منہاج السنۃ" ۲/۱۴۳،۶۶، ذہبی نے "زغل العلم" ص ۳۴ (کویت ۱۴۰۴ھ) ابن ابی العز الحنفی نے "الاتباع" ص ۸ اور ابن قیم نے "اعلام الموقعین" کے مختلف صفحات میں دی ہے۔

کے جواب دیئے ہیں۔ یہ ان کے زمانہ قیام حیدر آباد کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔
مولانا رشید احمد گنگوہی کی ''فتاویٰ رشیدیہ'' کا شمار احناف کے ہاں اہم ترین کتب فتاویٰ میں ہوتا ہے ان کے اکثر علماء نے اپنے فتاویٰ میں اس پر اعتماد کیا ہے اور مولانا کی رائے کو بڑی اہمیت دی ہے اس میں اس زمانے کے بعض جدید مسائل سے متعلق ایسی آراء کا اظہار کیا گیا ہے جو آج بڑے ہی حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا گنگوہی نے منی آرڈر کے ذریعے رقم بھیجنے کو ناجائز قرار دیا ہے اس جیسے اور بھی بعض مسائل ہیں جن کا استقصاء یہاں مقصود نہیں ہے[۲]

مولانا خلیل احمد سہارنپوری:

مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے فتاویٰ کا مجموعہ '' فتاویٰ خلیلیہ '' کے نام سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا ہے یہ فتاویٰ مولانا نے مدرسہ مظاہر علوم (سہارن پور) کے شعبہ افتاء کی طرف سے لکھے تھے۔ دوسرے علماء کی طرح ان کے فتاویٰ میں بھی حنفی مسلک کی شدت کے ساتھ پابندی نظر آتی ہے۔ بحیثیت محدث ان کی شہرت کی وجہ سے ہمیں توقع تھی کہ وہ احادیث کی تحقیق اور ان میں صحیح وضعیف کی تمیز کے بعد ہی استدلال کی عمارت کھڑی کریں گے۔ لیکن فتاویٰ کے اس مجموعہ کو دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ مولانا نے اس جانب توجہ نہیں دی ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں عورتوں کو لکھنا سکھانے سے متعلق

---

[۱] خصوصاً شیخ محمد زاہد الکوثری کے نظریات سے مستفید ہونے کے بعد جو عقائد میں کٹر اشعری (بلکہ جہمی) اور فروع میں متعصب حنفی تھے، اور جن کی نگاہ میں شاہ ولی اللہ بھی نہیں جچتے۔ محدثین کرام اور سلف صالحین کے باری میں جو اہانت آمیز کلمات ان کے قلم سے نکلے ہیں ان کا صدور کسی متقی اور ''زاہد'' سے بعید ہے۔ ان کے تابوت میں آخری کیل محمد بہجۃ البیطار (مؤلف) '' الکوثری و تعلیقاتہ'' اور علامہ عبدالرحمٰن بن معلمی (مولف ''التنکیل بمانی تانیب الکوثری من الأباطیل '' نے ٹھونک دی ہے۔ مگر ہمارے حنفی بھائی اب بھی گڑے مردے اکھاڑنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اللہ انہیں ہدایت دے۔

[۲] دیکھئے مشیر الحق کا ایک مضمون ''فتاویٰ اور عصری مسائل، در: اسلام اور عصر جدید (نئی دہلی) اپریل ۱۹۷۰ص ۵۱_۶۴

مولانا کے فتویٰ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں[1] جہاں اس کی ممانعت سے متعلق دوضعیف حدیثیں بلا تحقیق نقل کر کے جواز کے دلائل کی طرف اشارہ کئے بغیر منع کا فتویٰ دے دیا ہے۔ اس موضوع پر مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے جس تفصیل وتحقیق سے ''عقود الجمان في جواز تعليم الكتابة للنسوان ''میں کلام کیا ہے، وہ نظیر ہے[2] اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ مولانا خلیل احمد سہارن پوری اور دیگر مانعین کی رائے کیا وزن رکھتی ہے؟

مولانا عبدالرحمٰن دیوبندی:

مولانا عبدالرحمٰن دیوبندی اپنے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے مفتی تھے انہوں نے ۱۳۲۹ سے ۱۳۴۴ھ تک جو فتوے لکھے ان کا غیر مرتب مجموعہ آٹھ حصوں میں ''عزیز الفتاویٰ'' کے نام سے دیوبند سے ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا۔ مفتی محمد شفیع نے بھی دارالعلوم دیوبند کے زمانہ قیام میں (۱۳۴۹ تا ۱۳۶۲ھ) جو فتوے دیے تھے ان کا مجموعہ ''امداد المفتین '' کے نام سے آٹھ حصوں میں دیوبند میں چھپا تھا۔ ۱۳۸۴ھ میں مفتی محمد شفیع نے کراچی سے ان دونوں مجموعوں کو علاحدہ تبویب وترتیب اور اصلاح کے بعد دوبارہ شائع کیا جو دوضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ پھر اس کی ترتیب جدید اور مفتی محمد شفیع کے کراچی میں لکھے ہوئے کئی سو فتاویٰ کے اضافہ کے بعد ۱۳۹۶ھ /۱۹۷۶ء میں ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے ازسرنو اشاعت ہوئی یہ مجموعہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں دیوبندی مکتب فکر کے دو بڑے مفتیوں کی رائیں جمع ہیں جن پر تقریباً اس کے تمام علماء کا اتفاق ہے۔ اور چونکہ یہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند سے صادر کئے گئے تھے اس لئے انہیں استناد کا درجہ حاصل ہے۔

فتاویٰ کی ترتیب واشاعت میں مفتی محمد شفیع کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کی تمام فتاویٰ (جو امداد الفتاویٰ یا'' فتاویٰ امدادیہ''

---

[1] فتاویٰ خلیلیہ ص ۳۲۰۔۳۲۱

[2] یہ نظر کتاب میں شامل ہے۔

کی چار جلدوں اور پانچ تتموں، نیز ''حوادث الفتاویٰ'' ''ترجیح الراجح'' اور رسالہ ''النور'' میں شائع شدہ فتاویٰ پر مشتمل ہے) جدید تبویب و ترتیب کے بعد ۶ جلدوں میں ''امداد الفتاویٰ'' کے نام سے کراچی میں شائع کئے (۱۳۸۲ھ تا ۱۳۹۳ھ) اور اس طرح مولانا تھانوی کے زندگی بھر کے تمام فتاویٰ کو یکجا ہو گئے اور ان سے استفادہ آسان ہو گیا مولانا تھانوی کو دیوبندی حلقوں میں عصرِ حاضر کی سب سی زیادہ متبرک اور اثر آفریں شخصیت تصور کیا جاتا ہے اس لحاظ سے ان کے فتاویٰ کی جو اہمیت ہو گی وہ ظاہر ہے۔ آج بھی علمائے دیو بند ان پر اعتماد کرتے ہیں اور فتویٰ نویسی کے وقت ان کی رائے بلاچون و چرا نقل کرتے ہیں۔

مفتی کفایت اللہ دہلوی:

مفتی کفایت اللہ دہلوی کے فتاویٰ کی ۹ جلدیں ''کفایۃ المفتی'' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں انہوں نے اپنی زندگی میں بے شمار فتوے لکھے جن کا تعلق ہر طرح کے دینی و دنیاوی امور سے ہے۔ جمعیۃ العلماء کے موسسین میں ہونے کی وجہ سے انہیں مسلمانوں کے ملی و سیاسی مسائل کا گہرا شعور تھا جب کہ دوسرے دیوبندی مفتیوں کو عام طور پر سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا انہوں نے اس طرح کے اکثر مسائل میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جانب داری سے اپنا دامن بچانے میں کامیاب رہے اس لحاظ سے ان کے فتاویٰ کا مجموعہ قابل مطالعہ ہے۔

ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کے ترتیب و اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اب تک اس کی ۱۱ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ادھر مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے فتاویٰ بھی ترتیب دیے جانے لگے ہیں ان کی پہلی جلد مولانا خلیل احمد سہارن پوری کے فتاویٰ پر مشتمل طبع ہو چکی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ علمائے احناف کے فتاویٰ کے مجموعوں پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فقہی مسائل میں اپنے مذہب کی سختی سے پابندی کی اور دوسرے مکاتب فکر کی آراء سے کم ہی استفادہ کیا ہے اگر کہیں اپنے مذہب کے خلاف کسی کا قول نقل بھی کرتے ہیں تو اس غرض سے کہ اس

کی تردید کریں عام طور پر اکثر مفتی حضرات فتاویٰ کی پچھلی کتابوں پر اعتماد کرتے ہوئے فتوے لکھتے ہیں۔ کتاب وسنت سے براہ راست مسائل کی تحقیق نہیں کرتے۔ دلائل میں اگر کہیں احادیث کا ذکر بھی کرتے ہیں تو ہر طرح کی رطب ویابس اور صحیح وضعیف اکٹھا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کی تنقید وتحقیق پر یا تو اس لئے توجہ نہیں دیتے کہ اس طرح اختلافی مسائل میں دوسروں کے مقابلے میں ان کے دلائل کی حقیقت آشکار ہو جائے گی یا پھر حدیث میں اس جیسی صلاحیت کے مالک نہیں ہوتے جس کا مظاہرہ وہ فقہی مباحث میں کیا کرتے ہیں۔ ایک اور نقص جوان فتاویٰ میں نظر آتا ہے وہ یہ کہ عصر حاضر کے پیدا شدہ مسائل سے متعلق ان میں تشفی بخش بحث نہیں ہوتی جسے پڑھ کر جدید تعلیم یافتہ حضرات مطمئن ہوسکیں۔ اکثر علماء اپنے اسلاف کے حوالے سے (جنھیں وہ بڑے بڑے القاب سے متصف کرتے ہیں) ایسی باتوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے مرعوب ہو کر کوئی شخص ازسرنو مسائل کی تحقیق کرنے کیلئے قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ تبلیغی نصاب پڑھانے اور بہشتی زیور ''پہنانے'' کے بعد اگر کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے تو اسے یہ فتاویٰ پوری کردیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ان کے اکثر علماء اب تک اجتہاد کے قائل نظر نہیں آتے۔ ان کے نزدیک اب بھی اس کا دروازہ بند ہے اور قیامت تک بند رہے گا حتی کہ عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدی بھی ان کے بعض اسلاف کے بقول حنفی المذہب ہوں گے[1] اجتہاد کے بارے میں ان کا یہ نقطہ نظر جمہور علمائے محققین کے خلاف ہے۔

بریلوی علماء فروعی مسائل میں اپنے دیوبندی بھائیوں کے ہم مسلک ہیں، لیکن وہ ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر ان تمام بدعات وخرافات کے قائل نظر آتے

---

[1] دیکھئے: شمس الدین قہستانی (م ۹۵۳ھ) کی ''جامع الرموز'' اور حصکفی (م ۱۰۸۸ھ) کی ''الدر المختار'' ۱/۵۶ سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے اپنے رسالہ ''الاعلام بحکم عیسیٰ علیہ السلام'' اور الحاوی للفتاوی ۲/۱۵۵۔۱۶۷) اور ابن عابدین (م ۱۲۵۲ھ) نے ''ردالمختار'' ۱/۵۷ میں عیسیٰ علیہ السلام کے مقلد ہونے کی تردید کی ہے۔ اسی طرح ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) نے ''المشرب الوردی فی مذھب المھدی'' اور طحطاوی م ۱۲۳۱ھ نے حاشیہ الدر المختار میں امام مہدی کے حنفی ہونے سے متعلق ایک طویل افسانے کو بے اصل بتایا ہے اور ان کا مجتہد مطلق ہونا ثابت کیا ہے۔

ہیں جو برصغیر میں رائج ہیں۔ اپنے فتاویٰ میں وہ ان سے سرِ موانحراف کو وہابیت قرار دیتے ہیں اور اپنے تمام مخالفین کی تکفیر کرتے ہیں ان کے پیشوا مولانا احمد رضا خاں بریلوی (م ۱۳۴۰ھ) کے مجموعہ فتاویٰ ''العطایا النبویة فی الفتاویٰ الرضویة'' پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بدعات کو ترویج و اشاعت اور موضوع و بے اصل احادیث واقوال سے ان کی تائید کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ اس سلسلے میں انہیں حنفی مسلک کے فقہی کتابوں میں موجود اپنے علماء کے فتووں کی بھی کوئی پرواہ نہ رہی۔ عقائد کے باب میں سینکڑوں ایسے ہیں جب کے بارے میں علمائے احناف کے اقوال واضح طور پر موجود ہیں، بلکہ خود امام ابوحنیفہ نے بھی ان سے متعلق رائے دی ہے۔ مگر مولانا بریلوی کو ان کے مطابق فتویٰ دینا پسند نہ آیا۔ ہمیشہ بدعت کو وہ سنت ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ آج تک یہی روش ان کے تمام متبعین نے اپنے فتاویٰ اور دیگر کتابوں میں اختیار کر رکھی ہے۔

اہل حدیث کے فتاویٰ:

احناف کے بعد جب ہم علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان کے یہاں فتویٰ نویسی کا ایک دوسرا انداز نظر آتا ہے۔ وہ کسی ایک امام کی تقلید کے بجائے تمام ائمہ کے اقوال سے استفادہ کرتے ہیں، مسائل کی تحقیق کے وقت پہلے براہ راست کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے ہیں پھر سلفِ صالحین (صحابہ، تابعین، اور تبع تابعین) کی آراء سامنے رکھتے ہیں اور دلائل کے مطابق جو قول راجح ہوتا ہے اس کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ ان کے یہاں احادیث وآثار سے استدلال کرتے وقت اس بات کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے کہ پہلے انکی چھان پھٹک کر لی جائے اور صرف صحیح احادیث پر اعتماد کیا جائے۔ حدیث کے علاوہ فقہ

---

[1] دیکھیے: امیر صنعانی (م ۱۱۸۲ھ) کا رسالہ '' ارشاد النقاد إلی تیسیر الاجتهاد'' اور امام شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) کا رسالہ ''القول المفید فی أدلة الاجتهاد والتقلید'' اور دیگر رسائل متعلق تقلید و اجتہاد۔ نیز دیکھیے: البدر المطالع ۲/ ۸۱۔۸۹ جہاں امام شوکانیؒ نے ایک حق پسند شخص کے لئے شریعت پر عمل کرنے کی راہ بتائی ہے۔

حنفی کی کتابوں پر بھی ان کی بڑی گہری نظر ہے حنفی مسلک کے علاوہ دوسرے مسلک کی فقہی کتابوں سے جابجا اقتباسات دیئے جاتے ہیں جن سے ان کی وسعت اطلاع کا علم ہوتا ہے انہوں نے شروع سے مخصوص مسلک کے بجائے "فقہ حدیث" کی دعوت دی ہے اور تمام ائمہ مجتہدین کے احترام اور ان سب سے استفادہ پر زور دیا ہے، فقہ حنفی پر اکتفا کرنے کے بجائے انہوں نے مختلف فقہی مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی سفارش کی ہے یہ رجحان ان کے فتاویٰ اور دوسری تمام فقہی تالیفات میں نظر آتا ہے۔

یہاں ان کی تمام کتب فتاویٰ کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ ان میں سے چند نمائندہ کتابوں کا تذکرہ اور ان پر مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کو اس مکتب فکر کی مشہور اور معتمد کتابوں کا علم ہو سکے۔

نواب صدیق حسنؒ خان:

تاریخی طور پر سب سے پہلے نواب صدیق حسنؒ خان (م ۱۳۰۷ھ) کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اس صدی کے ہندوستانی علماء میں سرفہرست ہیں ان کی تین کتابیں "**هداية السائل إلى ادلة المسائل**" (۵۶۰ صفحات) "**بدور الأهلة من ربط المسائل بالأدلة**" (۵۲۸ صفحات) اور "**دليل الطالب على ارجح المطالب**" (۱۰۱۲ صفحات) فقہ حدیث میں بے نظیر ہیں۔ ان کتابوں میں نواب صاحب نے تمام مسائل مع دلائل درج کیے ہیں اور اختلاف اقوال کی صورت میں راجح قول کی تعیین کی ہے چونکہ ان کتابوں میں سے بعض فارسی میں ہیں۔ اور ایک صدی قبل بھوپال میں چھپی تھیں اور اب نادر و نایاب ہیں اس لئے ان سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا جاتا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتابیں اس موضوع پر بعد کی عربی اور اردو تالیفات سے بدرجہا بہتر ہیں۔ ضرورت ہے کہ انہیں از سر نو ایڈٹ کر کے عربی اور اردو میں شائع کیا جائے۔

شیخ الکل میاں سید نذیر حسینؒ محدث دہلوی:

سید نذیر حسین دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) کے فتاویٰ کثیر تعداد میں تھے، ان کا ایک

نہایت ہی مختصر مجموعہ دو ضخیم جلدوں میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی وغیرہ کی کوششوں سے دہلی میں ”فتاویٰ نذیریہ“ کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر دوسری بار ۱۹۷۱ء میں لاہور میں بھی تین جلدوں میں چھپا ہے۔ اہل حدیث حضرات عام طور پر فتویٰ نویسی کے وقت میاں صاحب کی رائے معلوم کرنے کے لئے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس میں تقریباً اکثر فقہی مسائل مل جاتے ہیں۔ ان پر بحث بھی نسبتاً تفصیلی ہوتی ہے میاں صاحب کی عادت تھی کہ اکثر وہ اپنے تلامذہ سے جواب لکھوایا کرتے تھے اور وہ بڑی تحقیق اور جستجو کے بعد حدیث وفقہ کی کتابوں سے جواب کے لئے مطلوبہ مواد فراہم کیا کرتے تھے جو نادر نقول اور اقتباسات پر مشتمل ہوتا تھا پھر خود ہی جواب لکھ کر میاں صاحب کو دکھلایا کرتے۔ وہ اس پر تائیدی توضیحی نوٹ لکھ دیا کرتے۔ اس کے بعد وہ سائل کے نام روانہ کر دیا جاتا۔

”فتاویٰ نذیریہ“ کے بہت سے فتاویٰ اس طرح فی الواقع میاں صاحب کے لکھے ہوئے نہیں۔ ہر فتویٰ کے اخیر میں لکھنے والے کا نام مذکور ہے۔ اگر کوئی چاہے تو پوری کتاب میں سے ایک شخص کے تمام فتاویٰ اکٹھا کر سکتا ہے، اور ان سے اس کے فقہی آراء کا جائزہ لینے میں مدد لے سکتا ہے۔[1] اس اعتبار سے یہ کتاب نہ صرف مفتیوں کے لئے بلکہ سوانح نگاروں اور مورخوں کے لئے بھی اہم ہے۔ اس کی اہمیت کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے میاں صاحب کے زمانے کے علمی، فکری اور مذہبی حالات کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ غلام احمد قادیانی کے تکفیر سے متعلق سب سے پہلے میاں صاحب نے ہی فتویٰ دیا تھا۔ سر سید احمد خان کے بعض افکار وخیالات پر تنقید احناف اور اہل حدیث کے درمیان بحث مباحثہ، اور مختلف مذہبی فرقوں اور شخصیات پر تبصرہ بھی اس میں موجود ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ میاں صاحب کو اپنے زمانے میں کتنی مرجعیت اور شہرت حاصل تھی۔ ہر مکتب فکر کے لوگ ان کی طرف رجوع کرتے، علماء بھی اپنے علمی سوالات ان کے سامنے پیش کرتے اور وہ ہر ایک کو صاف اور واضح اسلوب میں

---

[1] کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اشاریہ بھی شامل ہے جس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

مدلل جواب دے کر مطمئن فرماتے۔ ان کے زمانے میں فرقہ بندی اور مذہبی تعصب کی وہ صورت نہ تھی جو افسوس کہ آج تمام مکاتب فکر کے یہاں پائی جاتی ہے اور علمی افادہ و استفادہ کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

شیخ حسین بن محسن انصاریؒ میاں صاحب کے معاصرین میں (م ۱۳۲۷ھ) کے ذریعہ علم حدیث کو بڑا فروغ ہوا۔ نواب صدیق خانؒ کے دور میں انہوں نے یمن سے ہجرت کر کے بھوپال میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں اپنا مسندِ درس بچھا رکھا تھا جہاں سینکڑوں علماء و طلبہ ان سے مستفید ہوئے انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے فتاوے اور فقہی رسائل بھی لکھے جن کا مجموعہ ان کی وفات کے بعد "نور العین من فتاویٰ الشیخ حسینؒ"[1] کے نام سے ان کے لڑکے شیخ محمد عرب نے دو جلدوں میں تیار کیا تھا افسوس کہ اس کی طرف پہلی جلد لکھنو سے ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی دوسری کا کوئی پتہ نہ چل سکا ان فتاویٰ کے اندر شیخ حسین نے ہر ہر مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور پوری تحقیق کے بعد دلائل کی روشنی میں راجح مسلک کی تعیین کی ہے ان میں سے بعض سوالات ان کے شاگرد مولانا شمس الحق" عظیم آبادی نے کیے تھے جن کے جواب الگ سے چھوٹے چھوٹے رسالوں کی شکل میں بھی چھپ چکے ہیں اور اس مجموعے میں بھی شامل ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عظیم آبادی ان سے بہت متاثر تھے فتویٰ نویسی کا جو طرز انہوں نے اختیار کیا تھا وہ غالباً اپنے استاد ہی سے سیکھا تھا۔ شیخ حسین چونکہ بڑے محدث ہیں اس لئے کسی موضوع پر بحث کرتے وقت احادیث کی تحقیق و تنقید بسط و تفصیل سے کرتے ہیں اور تمام مآخذ کی طرف رجوع کر لینے کے بعد ہی کسی مسئلہ پر آخری رائے دیتے ہیں۔

میاں صاحب اور شیخ حسین بن محسن کے تلامذہ میں بہت سے علماء فتویٰ نویسی کے میدان میں مشہور ہوئے۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادی (م ۱۳۲۹ھ) کا ذکر آگے آرہا ہے۔ ان کے علاوہ

---

[1] اس کا ایک نسخہ جامعہ سلفیہ فیصل آباد کی لائبریری میں بھی ہے۔ [جاوید]

مولانا سعید بنارسی:

مولانا سعید بنارسی (م ۱۳۲۲ھ) کے فتاویٰ کا ایک مختصر مجموعہ (۲۴ صفحات) ''فتاوی سعیدیہ'' کے نام سے چھپا ہے جو متعدد اختلافی مسائل کے جوابات پر مشتمل ہے۔ ان کے ذاتی مطبع سعید المطابع بنارس سے ''مسائل بادلائل'' (۱۶ص) نام کی ایک کتاب بھی چھپی ہے۔ جس پر مؤلف کا نام درج نہیں۔ اغلب یہ ہے کہ اس کے مؤلف بھی مولانا محمد سعید ہی ہیں۔ مولانا کی پوری زندگی مختلف فیہ فقہی مسائل کی تحقیق اور مسلک اہل حدیث کی تائید میں گذری، ان پر مناظرانہ رنگ غالب تھا، جس کے اثرات ان کے مجموعہ فتاویٰ میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

مولانا امام عبدالجبار غزنوی:

ایک دوسرے عالم مولانا عبدالجبار غزنوی (م ۱۳۳۴ھ) کی ''بستان المحققین بشارۃ السالکین'' (معروف بہ مجموعہ الفتاوی، ملقب بہ العروۃ الوثقی) بھی فتاویٰ کے مشہور مجموعوں میں سے ہے۔ یہ ''فتاویٰ غزنویہ'' کے نام سے معروف ہے اس کی پہلی جلد ۲۵۶ صفحات) امرتسر سے شائع ہوئی تھی۔ غالباً دوسری جلد بھی اس کے بعد چھپی، جیسا کہ پہلی جلد کے اخیر میں اعلان سے اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں عربی، فارسی اور اردو تینوں ہی زبانوں میں فتاویٰ ہیں۔ عقائد سے متعلق سوالات کے جوابات خالص سلفی نقطہ نظر سے اور بڑی تفصیل کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ صفاتِ الٰہی کے بات میں خاص طور پر غزنوی علماء نے مسلکِ سلف کو بڑے مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ فروعی مسائل میں بھی وہ ہمیشہ عمل بالکتاب والسنۃ کے داعی رہے۔ زہد و تصوف کے میدان میں بھی متاخرین صوفیا کے مبتدعانہ افکار و خیالات کے اثر سے محفوظ تھے ان تمام خصوصیات کا اندازہ فتاویٰ کے اس مجموعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔[1]

---

[1] اگر کوئی صاحبِ علم فتاویٰ غزنویہ کے ساتھ بطلِ حریت مفتی سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ کو بھی شامل کردے تو بہت بڑی علمی خدمت ہوگی۔ ان کے فتاویٰ (ہفت روزہ توحید امرتسر) اور الاعتصام میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ [جاوید]

امام حافظ مولانا عبداللہؒ غازی پوری:

مولانا عبداللہ غازی پوری (م ۱۳۳۷ھ) کے فتاویٰ کا مجموعہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے اس کے دو قلمی نسخے بنارس اور مبارک پور میں میری نظر سے گذرے ہیں، دوسرے نسخے میں فتاوی کی ترتیب و تبویب کا کام مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (م ۱۳۵۳ھ) نے کیا ہے پہلا نسخہ مسودہ کی شکل میں اور غیر مرتب ہے اس مجموعے میں غالباً ان کے وہ فتاوی بھی شامل ہوں گے جو الگ سے چھوٹے رسالوں کی صورت میں طبع ہوئے ہیں مثلاً "زکوۃ کا فتویٰ" (۱۲ص) "علم غیب کا فتویٰ" (۲۰ص) بحیرہ اور سائبہ کی تحقیق سے متعلق فتویٰ بعنوان "الحجة الساطعة في بيان البحيرة والسائبة" (۱۶ص) ان فتاویٰ میں مولانا نے مسائل کی تحقیق جس انداز میں کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تفسیر، حدیث اور فقہ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ ضرورت ہے کہ ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے۔

ارشاد السائلين إلى المسائل الثلاثين"[1] میں مولانا عبدالجبارؒ عمر پوری (م ۱۳۴۴ھ) نے تیس اہم سوالات کے جواب لکھے ہیں۔ یہ کتاب کلکتہ سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی ہے اور افسوس کہ اس وقت میرے پیش نظر نہیں۔ اس لئے اس کے مشمولات سے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔

فاتح قادیان شیخ الاسلام ثناء اللہ امرتسریؒ (م ۱۹۴۸ء):

ان مجموعوں کے مقابلے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۳۶۷ھ) کے فتاویٰ کا مجموعہ "فتاویٰ ثنائیہ" نسبتاً زیادہ مشہور اور متداول ہے۔ یہ دراصل اخبار "اہل حدیث" (امرتسر) میں باب الفتاویٰ کے تحت شائع ہونے والے سوالات اور ان کے مختصر جوابات پر مشتمل ہے جن کی ترتیب و تدوین کا کام مولانا محمد داؤد راز دہلوی (م ۱۹۸۱ء) نے کیا ہے۔ اور ان ہی کے زیر اہتمام دہلی سے دو جلدوں میں اس کی اشاعت ہوئی۔

---

[1] اسکا ایک نسخہ جامعہ سلفیہ کی لائبریری میں ہے اور تفصیلی علمی فتاویٰ ہے اور راقم نے اس کی تخریج و تحقیق کر دی ہے۔ .... (جاوید)

دوسری بار لاہور میں بھی ۱۹۷۲ء میں چھپا ہے۔ اس میں ہر طرح کے سوالات اور ان کے جواب مذکور ہیں، پرچے میں اشاعت کے پیش نظر جواب عموماً مختصر الفاظ میں ہیں۔ مسائل پر تفصیل کم ہی نظر آتی ہے۔ کتاب پر نظر ثانی مولانا شرف الدین دہلوی (م۱۹۶۱ء) نے کی ہے جگہ جگہ انہوں نے حواشی اور تعلیقات لکھے ہیں جن میں مسائل کی توضیح اور دلائل کا ذکر ہے کہیں کہیں اختلافی نوٹ بھی چڑھاتے ہیں۔ اس مجموعہ میں مولانا امرتسری اور دوسرے لوگوں کی ایسی بہت سی تحریریں بھی شامل ہیں۔ جن کا فتاویٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ "اہل حدیث" کی تمام جلدیں (۱۹۰۳ـ۱۹۴۷ء) بھی مرتب کے پیش نظر نہ تھیں۔ ضرورت ہے کہ از سر نو ان کے تمام فتاویٰ جمع کیے جائیں[1]۔

حضرت حافظ عبداللہ روپڑیؒ:

مولانا امرتسری کے مدمقابل مولانا عبداللہ روپڑی (م۱۳۸۴ھ) نے بھی اپنے پرچہ "تنظیم اہل حدیث" میں فتاویٰ کا ایک باب رکھا تھا۔ اس میں ان کے سینکڑوں فتاویٰ شائع ہوئے جو میں کتابی شکل میں "فتاویٰ اہل حدیث" کے نام سے کئی جلدوں میں مرتب کیے گئے۔ جن میں سے بعض چھپ چکی ہیں۔ مولانا روپڑی، غزنوی علماء کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لئے عقائد کے باب میں مسلک سلف کے وہ بھی زبردست حامی، اور صفاتِ باری میں تاویل کے سخت خلاف تھے۔ فروعی مسائل بھی ان کے فتاویٰ میں ان امور کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

امام انقلاب مولانا محمد اسمٰعیل سلفیؒ:

متاخرین میں گوجرانوالہ کے مولانا محمد اسمٰعیل سلفی (م۱۳۸۷ھ) نے بھی بہت سے فتاویٰ لکھے جو "الاعتصام" (لاہور) اور دوسرے پرچوں میں شائع ہوئے۔ ان کا ایک مختصر مجموعہ "فتاویٰ سلفیہ" کے نام سے لاہور میں چھپا ہے۔ مولانا کی تحریریں

---

[1] ہمارے فاضل دوست بدر الزمان نیپالی نے ایک مقالہ میں "فتاویٰ ثنائیہ" پر تنقیدی تبصرہ کیا ہے جو محمد داؤد راز دہلوی کی مرتب کردہ کتاب "حیات ثنائی" میں شامل ہیں۔[2] اس فتاویٰ کے مرتب کرنے والے مولانا محمد صدیق" سرگودھا والے ہیں۔ فتاویٰ اولاً ۳ جلد بعد دو میں طبع ہوا۔ [جاوید]

بڑی مدلل اور فکر انگیز ہوتی ہیں فتاویٰ میں بعض عصری مسائل سے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی دقت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے علاوہ بہت سے علماء ہیں جن کے فتاویٰ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔ ضرورت ہے کہ انہیں مختلف پرچوں، کتابچوں اور مجموعوں سے اکٹھا کیا جائے، اور مناسب ترتیب وتبویب کے بعد طبع کرایا جائے خصوصاً مولانا عبداللہ رحمانی ؒ کی مختلف تحریریں جو پوتے کی وراثت، بیمہ، بینک کے سود اور دوسرے بہت سے اہم موضوعات سے متعلق ہیں ان مسائل پر انہوں نے بڑی تحقیقی بحث کی ہے جس کے بعد کسی دوسرے شخص کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ سنا ہے کہ کوئی صاحب ان کے فتاویٰ ''الفتاویٰ الرحمانیہ'' کے نام سے جمع کر رہے ہیں، خدا کرے جلد اس کی ترتیب واشاعت عمل میں آئے۔

ادھر چند سال قبل مولانا ابوالحسنات علی محمد سعیدی (م ۶ جولائی ۱۹۸۷ء) نے ''فتاویٰ علمائے حدیث'' کے نام سے تمام مشہور علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ کے ازسرِنو ترتیب وتبویب کا کام شروع کیا تھا جس کی ۱۱ جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔ افسوس کہ ان کی وفات کی وجہ سے یہ سلسلہ ناقص رہ گیا خدا کرے کہ کوئی باذوق اور محنتی شخص اس سلسلے کو مکمل کردے۔ بلاشبہ یہ مجموعہ افادیت کے لحاظ سے سابقہ تمام مجموعوں سے افضل ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ ایک ہی مسئلہ میں مختلف علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ (مع حوالہ) یکجا مل جاتے ہیں اگر کہیں ان کے درمیان اختلاف ہے تو اس کا بھی علم ہوتا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فتویٰ دینے میں علمائے اہل حدیث نے کبھی کسی دوسرے شخص کی تقلید نہیں کی، بلکہ ہر ایک نے دلائل کی روشنی میں جس قول کو راجح سمجھا اس کے مطابق فتویٰ دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے اساتذہ اور مشائخ کی بھی پرواہ نہیں کی۔ یہ حریت فکر اور آزادی رائے صرف اہل حدیث علماء کے ہاں نظر آتی ہے آج بھی ان کے ہاں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

(۴)

محقق زماں امام العصر مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ:۔

مولانا شمس الحق عظیم آبادی (۱۸۵۷ـ۱۹۱۱ء) کا شمار عصر حاضر کے مشہور محدثین میں ہوتا ہے انہوں نے علم حدیث کی جو خدمت کی ہے اس سے ہندو بیرونِ ہند کے تمام علماء و محققین واقف ہیں۔ سنن ابی داؤد اور دار قطنی پر ان کے شروح وحواشی سے آج پوری دنیا میں اسلامی تحقیقات سے دلچسپی رکھنے والے مستفید ہو رہے ہیں۔ ان کی دوسری مطبوعہ تحریریں بھی اپنے موضوع پر بے نظیر ہیں۔ ضرورت ہے کہ انہیں ازسرِ نو ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے۔ زیر نظر مجموعہ کی ترتیب کے لئے دراصل یہی خیال محرک بنا ہے۔ اس میں مولانا کی وہ تمام اردو اور فارسی تحریریں جمع کر دی گئی ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً کسی سوال کے جواب میں لکھی تھیں اور ہمیں متفرق طور پر دستیاب ہوئی ہیں۔ اس مجموعہ سے علم حدیث میں ان کی مہارت کے ساتھ ان کی فقہی بصیرت اور مجتہدانہ صلاحیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

مولانا نے اپنی طالب علمی کے دور میں اور اس کے بعد وفات تک بہت سے فتوے لکھے۔ افسوس کہ ان سب کی نقل محفوظ نہ رکھی گئی ورنہ کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جاتیں۔ چند مسائل کا مجموعہ انہوں نے "تنقیح المسائل" کے نام سے تیار کیا تھا مگر اس کی ترتیب و تکمیل بھی اپنی حیات میں نہ کر سکے۔[۱]

اپنے گھر پہ وہ عموماً مسائل کی تحقیق اور فتوی لکھنے میں لگے رہتے، ان کے شاگرد رشید مولانا ابوالقاسم بنارسی (م ۱۳۶۹ھ) کا بیان ہے کہ "زیادہ وقت اسی کار خیر میں بسر ہوتا تھا"۔[۲] ان کے فتاوی کے دو ناقص مجموعے "چند فقہی مسائل اور ان کے جواب" کے نام سے خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں زیر رقم ۲۶۸، ۲۶۹ (مخطوطۂ اردو) محفوظ ہیں۔ جو ۲۰ (= ۷ + ۱۳) فتاوی پر مشتمل ہیں۔[۱] ان میں سے بعض فتاوی پر جو

---

[۱] دیکھئے: یادگار گوہری ص ۱۱، نزھۃ الخواطر ۸/۱۸۰

[۲] اہل حدیث (امرتسر) ۱۳۱ اکتوبر ۱۹۱۹، ص ۹

تاریخ درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی زندگی کے آخری تین چار سال (۱۳۲۶۔ ۱۳۲۹ھ) کے کچھ فتاویٰ ہیں۔[2] بعض ان کے تحریر کردہ نہیں، بلکہ ان کی رہنمائی میں ان کے تلامذہ، محمد عین الدین میتابرجی، محمد عبداللہ، (ان کے لڑکے) محمد ادریس کے لکھے ہوئے ہیں۔[3] مولانا نے ان کی تائید و توثیق کی ہے۔ فتاویٰ کے ان دونوں مجموعوں میں سے صرف دو فتوے اب تک شائع ہوئے، ایک نماز عیدین کے بعد مصافحہ و معانقہ سے متعلق (=فتویٰ نمبر ۱۰)[4] دوسرا حالت صغر میں لڑکی کے نکاح اور خیار بلوغ سے متعلق (=فتویٰ نمبر ۱)[5]۔ باقی اب تک غیر مطبوعہ صورت میں پڑے تھے جو پہلی بار اس مجموعہ میں شائع کیے جا رہے ہیں۔

اس قلمی مجموعہ کے علاوہ ''فتاویٰ نذیریہ'' میں بھی ان کے چھ فتوے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک عربی[6] ایک فارسی[7] اور چار اردو[8] میں ہیں۔ ایک جگہ فارسی میں ان کی ایک طویل تحریر بھی نظر آتی ہے جس میں انہوں نے مولانا عبدالحیٔ لکھنوی (م ۱۳۰۴ھ) پر تعاقب کیا ہے[9]۔ ان کے علاوہ فتووں پر ان کی تائیدی دستخط ثبت ہیں[10]۔ ان فتاویٰ میں سے بعض پر ان کی مہر بھی موجود ہے جس پر ۱۲۹۵ھ کی تاریخ کندہ تھی[1]! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتاویٰ ان کے زمانہ قیام دہلی (محرم ۱۲۹۵۔ محرم ۱۲۹۶ھ)

---

(۱) مخطوطہ نمبر ۲۶۸ کے شروع میں ایک نوٹ دیا گیا ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ ابتدائی تین سوال و جواب عربی میں ہیں اور وہ اس مجموعہ سے نکال کر ACC.NO۵۰۵ کے ساتھ چسپاں کر دیئے گئے ہیں اس طرح کل تعداد ۲۳ ہو جاتی ہے۔ ہمیں کئی بار تلاش و جستجو اور لائبریرین سے رجوع کرنے کے بعد بھی ان تینوں کا سراغ نہ مل سکا۔

(۲) دیکھئے: فتویٰ نمبر ۴، ۸، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۵۔ (۳) فتویٰ نمبر ۸، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۵

(۴) یہ مستقل رسالے کی شکل میں پٹنہ سے شائع ہوا بہ عنوان ''هداية النجدين إلى حكم المعانقة والمصافحة بعد العيدين''

(۵) یہ الاعتصام (لاہور) ۲۰ نومبر ۱۹۷۰ میں مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی توجہ سے شائع ہوا۔

(۶) دیکھئے: فتاویٰ نذیریہ ۱/۳۲۵۔ ۳۳۰ (طبع اوّل)

(۷) ایضاً ۱/۴۲۶۔ ۴۳۱ (۸) ایضاً ۱/۱۴۳۔ ۱۵۳ یہاں ۱۵ مسائل پر بحث ہے اور ان کی حیثیت ۱۵ فتوؤں کی سی ہے۔ ۲۸۶۔ ۲۸۹، ۳۷۲۔ ۳۷۳، ۲/۱۵۱۔ ۱۵۵ (۹) ایضاً ۲/۲۶۹۔ ۲۷۲ (۱۰) ایضاً ۱/۳۹۵، ۴۳۸۔ ۴۳۹، ۵۰۸۔ ۵۱۰، ۲/۴۵، ۱۷۹۔ ۱۸۰، ۱۷۹، ۴۸۰۔

کے تحریر کردہ ہیں۔ جب وہ اپنے استاد میاں نذیر حسین دہلوی سے حدیث پڑھ رہے تھے اور ان کی عمر ۲۲ سال کے قریب تھی۔ دوسری بار وہ پھر ۲۸ سال کی عمر میں ایک ڈیڑھ سال کے لئے (۱۳۰۲۔۱۳۰۳ھ) میاں صاحب کے پاس حدیث پڑھنے کے لئے مقیم رہے[۲] اس زمانے کے فتاویٰ محفوظ نہیں۔

طالب علم کے زمانہ ہی میں انہوں نے عقیقہ کے مسائل پر ایک رسالہ فارسی میں ''الأقوال الصحیحة فی احکام النسیکة'' (۱۲۹۴ھ) اور آمین بالجہر سے متعلق اردو میں ''الکلام المبین'' (۱۳۰۳ھ) لکھا تھا پھر جانوروں کو خصی کرنے سے متعلق ''القول المحقق'' (۱۳۰۵ھ) گاؤں میں جمعہ کی فرضیت پر ''التحقیقات العلی'' (۱۳۰۹ھ) عورتوں کو لکھنا سکھانے کے جواز پر ''عقود الجمان'' (۱۳۱۱ھ) اور تعزیہ داری کے رد میں ''فتویٰ ردِ تعزیہ داری'' (اس پر تاریخ مذکور نہیں) یہ سب ان موضوعات سے متعلق سوالات کے جواب میں مفصل فتوے ہیں جس میں سے بعض اردو اور بعض فارسی میں ہیں اور الگ سے چھپ چکے ہیں۔

تلاش وجستجو کے بعد مولانا کی دو تحریریں مزید ہیں ایک میں انہوں نے فضائل شعبان سے متعلق احادیث کا جائزہ لیا ہے۔ (فتویٰ نمبر ۳۸) دوسری میں اس سوال کا جواب ہے کہ ایک شہر میں کئی جگہ جمعہ جائز ہے یا نہیں۔ اور ایک جامع مسجد کے پاس کسی دوسری جامع مسجد کی تعمیر کیسی ہے؟ (فتویٰ نمبر ۳۹)

مولانا عظیم آبادی کے مذکورہ بالا تمام اردو و فارسی فتاویٰ یک جا کر دیے گئے ہیں۔ تین عربی فتووں کے مختصر اردو ترجمے بھی شامل ہیں۔ اصل فارسی فتووں کی اشاعت کے ساتھ ان کے مختصر اردو ترجمے بھی قارئین کے فائدے کی لئے بڑھا دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح یہ مجموعہ مولانا عظیم آبادی کے ۵۰ فتووں پر مشتمل ہوگیا ہے ان کی دستیاب شدہ تمام اردو اور فارسی تحریریں (مطبوعہ وغیر مطبوعہ) اس میں آگئی ہیں۔ صرف ایک رسالہ

---

[۱] ایضاً ۱۵۳/۱۱۔۳۲۰

[۲] دیکھئے: حیاۃ المحدث شمس الحق عظیم آبادی ص ۱۰، مولانا شمس الحق عظیم آبادی۔ حیات اور خدمات ص ۵۲

''فتح المعين في الرد على البلاغ المبين في إخفاء التامين'' جو مسئلہ آمین سے متعلق محمد شاہ پنجابی کے رسالہ کے رد میں ہے۔ اور جس کا ذکر مؤلف نے خود ''الکلام المبین'' میں کیا ہے۔[1] مجھے تلاش و بسیار کے باوجود اب تک حاصل نہ ہوسکا۔ غالباً یہ اردو میں ہوگا، اس کی طباعت بھی ''الكلام المبين'' سے قبل یعنی ۱۳۰۳ھ سے پہلے ہوگی۔

فتاویٰ کے اس مجموعہ میں مختلف موضوعات سے متعلق سوالات کے تحقیقی و تفصیلی جواب نظر آتے ہیں اس لحاظ سے یہ مجموعہ کتب فتاویٰ کے اندر خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا عظیم آبادی نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اس پر بڑی تشفی بخش بحث کی ہے۔

اس سے متعلق اکثر احادیث ذکر کی ہیں پھر ان پر محدثانہ انداز میں کلام کیا ہے۔ صحیح اور ضعیف احادیث کی نشاندہی کی ہے۔ ناقدین حدیث اور علمائے جرح و تعدیل کے اقوال نقل کر کے سند اور متن کی چھان بین کی ہے۔ علاوہ ازیں ہر مسئلہ سے متعلق فقہائے مذاہب اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) اور سلف صالحین (صحابہ ،تابعین اور تبع تابعین) کے اقوال و آراء کا جائزہ لیا ہے اور ان کے دلائل کا موازنہ کرنے کے بعد صحیح اور راجح قول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے لئے مضبوط دلائل دیے ہیں۔

ان فتاویٰ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کوئی بات بلاسند نہیں کہی گئی ہے، اور نہ ہی کوئی قول کسی کی طرف بغیر حوالے کے منسوب کیا گیا ہے۔ مولانا نے ہر فن کی مستند کتابوں سے مطلوبہ مواد فراہم کیا ہے۔ کسی حدیث کی تحقیق کرنی ہو تو بڑے بڑے محدثین اور علمائے جرح و تعدیل کے اقوال سے استشہاد کرتے ہیں۔ تخریج حدیث میں ''نصب الرايه'' ''تلخيص الجسير'' وغیرہ، شرح حدیث میں فتح الباری، شرح

---

[1] الکلام المبین ص ۳۷ (طبع اول) مجھے ''حیاۃ المحدث'' اور ''مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات'' لکھتے وقت اس کا علم نہ ہوسکا تھا۔

نووی، شرح السنة للبغوی، معالم السنن، مرقاة، نیل الاوطار وغیرہ، رجال کے سلسلے میں تقریب، تہذیب، خلاصہ للمزی میزان الاعتدال وغیرہ مشکل الفاظ کے سلسلے میں النہایة، المصباح المنیر، الصحاح، القاموس وغیرہ۔ تفسیر میں ابن کثیر بغوی، طبری۔ حدیث کے متون میں تقریباً اکثر مطبوع وغیر مطبوع کتابیں۔ فقہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کی تمام مشہور اور مستند کتابیں۔ اسی طرح اصول فقہ، اصول حدیث، عقیدہ، تاریخ سیرت کے اکثر مآخذ فتویٰ نویسی کے وقت ان کے پیش نظر ہوتے، جن کے حوالے اس مجموعہ کے ہر ہر صفحے میں ملتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ عظیم آبادی مآخذ ومصادر پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے اور متفرق معلومات کس سلیقے اور خوبی کے ساتھ اکٹھا کرتے تھے۔

مولانا کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر موضوع پر بحث وتحقیق میں ایک ہی اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ کہیں سرسری جواب پر اکتفا نہیں کرتے۔ یوں تو ان کی تمام تحریریں ان کی محدثانہ صلاحیت اور فقہی مسائل میں مجتہدانہ بصیرت کی شاہد ہیں، پھر بھی ہم خاص طور پر ان کے چند فتاویٰ کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے عورتوں کو لکھنا سکھانا، (فتویٰ نمبر۴۳) جانوروں کو خصی کرنا (نمبر۴۴) عیدین کی نماز کے بعد مصافحہ ومعانقہ (نمبر۱۰) دیہات میں جمعہ کی فرضیت (نمبر۴۱) لڑکی کا حالتِ صغر میں نکاح اور خیارِ بلوغ کی تحقیق (نمبر۱۰) تعزیہ داری (نمبر۴۰) عقیقہ (نمبر۴۵) میت کی پیشانی پر بسم اللہ لکھنا (نمبر۴۷) طلاق ثلاثہ سے متعلق رکانہ والی حدیث پر بحث (نمبر۴) ایک نماز کے لئے مسجد میں دوسری جماعت قائم کرنا (نمبر۳۶) آمین بالجہر کا مسئلہ (نمبر۴۲) وغیرہ ان مسائل پر مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ علمائے احناف نے ان میں سے بعض مسائل میں جو موقف اختیار کیا ہے۔ مولانا علمی انداز میں اس جائزہ لیا ہے، اور خود فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے اس کے خلاف نقول فراہم کیے ہیں۔ احناف بعض مسائل میں اتنے متشدد ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان کے بڑے بڑے علماء نے لڑکیوں کو لکھنا سکھانے کی ممانعت کا فتویٰ دیا ہے۔ تعجب ہے کہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی

ا، مولانا خلیل احمد سہارن پوری ۲، مولانا وکیل احمد سکنہ پوری ۳ (م ۱۳۲۲ھ) اور عراق کے شیخ خیر الدین نعمان بن محمود آلوسی ۴ (م ۱۳۱۷ھ) سب اس سلسلے میں یک زبان ہیں۔ ان لوگوں نے اس کے لئے جن ضعیف احادیث کا سہارا لیا ہے ان کی حقیقت علامہ عظیم آباد کا فتویٰ دیکھنے سے واضح ہوتی ہے۔

نماز عیدین کے بعد مصافحہ و معانقہ بھی ایک رسم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اکثر شہروں میں علمائے احناف اور عوام اس پر خصوصاً عمل کرتے ہیں، مولانا نے فقہ شافعی، مالکی اور حنبلی کیساتھ فقہ حنفی کی بھی مستند کتابوں سے اسکا بدعت ہونا نقل کیا ہے۔

جانوروں کو خصی کرنے سے متعلق جتنی تفصیلی بحث مولانا عظیم آبادی نے کی ہے کہیں اور نظر نہیں آتی، اسی طرح تعزیہ داری، عقیقہ اور آمین بالجہر کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اور ان سے متعلق احادیث کی جس طرح چھان بین کی ہے وہ ہمیں فتاویٰ کے دوسرے مجموعوں میں شاید ہی کہیں ملے دوسرے فتویٰ نگاروں کے بالمقابل مولانا اختصار سے کام لینے کے بجائے تفصیل اور تحقیق کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور یہی ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔

ان فتاویٰ پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عظیم آبادی فتویٰ نویسی کے وقت ہر مسئلہ میں پہلے کتاب و سنت کی طرف رجوع کرتے ہیں، پھر علماء و فقہا اور ائمہ مجتہدین کے اقوال نقل کرتے ہیں اور ان کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں، پھر

ا دیکھئے فتاویٰ عبدالحئی ۲/۳۸۱ مطبوعہ لکھنؤ۔

۲ فتاویٰ خلیلیہ ص ۳۲۰-۳۲۱

۳ انہوں نے ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر "تنقیح البیان بجواز تعلیم کتابة النسوان" کے نام سے لکھا ہے۔ دیکھئے: نزهة الخواطر ۸/۵۱۸ اور "نذر مقبول" میں ان کے حالات اور خدمات پر ایک مضمون۔

۴ ان کا ایک رسالہ "الاصابة في منع النساء من الكتابة" کے نام سے ۶ اوراق پر مشتمل "مکتبہ الاوقاف العامة بغداد میں زیر رقم ۱۲/۵۹۶۲ مجامیع محفوظ ہے، جس میں اس موضوع سے متعلق ہندوستان سے پوچھے گئے سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ دیکھئے: فهرس مکتبہ الاوقاف ۱/۳۸۳، ان کے حالات کے لئے دیکھئے: حیاۃ المحدث شمس الحق ص ۲۵۱-۲۵۳)

ان کی جانچ پرکھ کے بعد جس قول کو وہ کتاب و سنت کے موافق پاتے ہیں اسے راجح

چند ایک فتاویٰ کا مختصر تعارف

۱: فتاویٰ مولانا محمد حسین بٹالویؒ (م ۱۹۲۰ء):۔

مولانا محمد حسین کا شمار پاک و ہند کے ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تجدید دین کا بیڑا اٹھایا اور مولانا نے ہی سب سے پہلے (مرزا غلام احمد قادیانی) کے خلاف کفر کا فتویٰ مرتب کیا۔

تو اولاً مرزا غلام احمد پر شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی نے کفر کا فتویٰ دیا۔ یہ فتویٰ پہلے مولانا محمد حسینؒ نے اپنے رسالہ اشاعت السنہ میں طبع کروایا۔

اور اس کے بعد مولانا عطاء اللہ حنیف م ۱۹۸۷ نے دار الدعوۃ السلفیہ سے شائع کیا۔

۲: فتاویٰ محمدی مولانا محمد جونا گڑھیؒ (م، مارچ ۱۹۴۱ء):۔

مولانا جو تفسیر ابن کثیر، اعلام الموقعین کے مترجم، محمدیات اور اخبار محمد کے ایڈیٹر تھے۔ جن کو خطیب الہند کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک فتاویٰ مرتب کیا جو میرے دوست حافظ عبدالخبیر (مدیر دار الفرقان لاہور) نے مجھے عنایت کیا جو آج کل میرے پاس ہے۔

۳: فتاویٰ حافظ محمد ٹونکیؒ (م ۱۸۹۶ء):۔

۱۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور مولوی فیض الحسن سے پڑھا۔

سید نذیر حسین محدث دہلویؒ سے تفسیر و حدیث پڑھی ان کی تصانیف میں سے شرح دیوان حتبی شرح دیوان حماسہ دیگر کتب ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے ادیب تھے ان کے فتاویٰ میں سے فتاویٰ مسائل متفرقہ ہیں۔ آخری زمانہ میں نواب صدیق حسنؒ ان کو بھوپال لے آئے تھے۔ ان کے فتاویٰ کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہاں ہے۔

۴: فتاویٰ ستاریہ:۔

مولانا ابو محمد عبدالستار بن عبدالوہاب دہلویؒ م ۱۹۶۶ء یہ فتاویٰ چار جلد پر مشتمل ہے۔ اس کو حافظ عبدالغفارؒ نے مرتب فرمایا، اور کراچی سے مکتبہ سعودیہ نے شائع کیا اور آج کل نئی ترتیب کے ساتھ چھپایا جا رہا ہے۔ مولانا کا تعلق غرباء اہل حدیث سے تھا بعض مسائل میں وہ منفرد بھی ہیں۔ مفتی محمد ادریس سلفی کراچی نے فتاویٰ (ستاریہ) کے ضمیمہ کے طور پر دو جلدیں مرتب کی ہیں۔

۵: فتاویٰ استاذ العلماء حافظ محمد گوندلویؒ (۴ جون ۱۹۸۵ء)

حافظ صاحبؒ کا فیض جاری ہے حافظ صاحبؒ بلا کے ذہین اور صاحب فراست انسان تھے ان کو دیکھ کر قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ مولانا مودودیؒ نے ایک دفعہ ان کے متعلق کہا تھا جس کا معنی یہ ہے کہ بحر لا ساحل له

قرار دیتے ہیں۔ اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، اس سلسلے میں وہ کسی امام کی تقلید

حافظ صاحبؒ مدرس مصنف ایک اچھے مفتی بھی تھے ان کا فتاویٰ راقم نے جمع کرنا شروع کیا تھا بہت زیادہ کام ہو گیا تھا مگر بعض وجوہات کی بنا پر یہ کام مکمل نہ ہو سکا، ان شاء اللہ حافظ صاحب کے فتاویٰ بعض تفصیلی اور بعض تو صرف ہاں یا نہ تک محدود ہیں۔

۶: فتاویٰ حصاروی (۱۹ ستمبر ۱۹۸۱ء):۔

مولانا ایک حق گو انسان تھے پوری زندگی وعظ و تبلیغ میں گذار دی۔ مولانا مدرس، مصنف ہونے کے ساتھ ایک اچھے مفتی بھی تھے۔ بقول ڈاکٹر عبدالروف ظفر چیئر مین سیرت چیئر بہاول پور یونیورسٹی مولانا محمد داود غزنویؒ نے ایک دفعہ ان کے فتاویٰ کو دیکھ کر کہا مولانا آپ فتویٰ لکھتے وقت علیہ و ما علیہ۔ سب کو محیط کر لیتے ہیں اور دلائل کی بھرمار اور استدلال بھی کمال۔ ان کے فتاویٰ آج کل مولانا محمد یوسف (راجووال) طبع کروا رہے ہیں یہ تمام کام ہو گیا ہے، یہ خبر مولانا یوسف راجووال حفظ اللہ نے ایک خط کے ذریعے دی۔ تقریباً ۷ جلدیں میں ہوگا۔

۷: اسلامی فتاویٰ، مولانا عبدالسلام بن یاد علی (م ۱۹۷۴ء)

مولانا کی علمی شہرت، اسلامی خطبات اور شرح مشکوٰۃ کی وجہ سے ہے۔ مولانا فتاویٰ کے میدان میں بھی ید طولیٰ رکھتے۔ اس فتاویٰ میں منکرین حدیث کا تفصیلی جواب اور اہل حدیث کی تاریخ اور اس پر وارد اعتراضات کا تفصیلی جواب بھی موجود ہے۔

اور عقائد و مسائل کے حوالے سے اسلامی فتاویٰ کی بڑی اہمیت ہے۔

۸: فتاویٰ مولانا سلطان محمود صاحبؒ جلال پور پیر والا: (۴ نومبر ۱۹۹۵ء)

مولانا سلطان محمودؒ مولانا شیخ عبدالحق مہاجر مکی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے انہوں نے پوری زندگی سوائے ایک سال جامعہ سلفیہ کے جلال پور میں گذاری۔

اس علاقہ میں مولانا ہی کا فتویٰ جاری تھا بلکہ میراث کے سلسلہ میں ان کا فتویٰ عدالت میں حرف آخر ہوتا تھا۔ ان کا فتاویٰ اخبار اہل حدیث وغیرہ میں شائع کرتا رہتا تھا۔ آج کل جلال پور پیر والا میں ان کا فتاویٰ مرتب ہو رہا ہے۔

۹: مولانا محمد عبداللہ ویرووالویؒ (م ۱۹۹۱ء):۔

مولاناؒ کا تعلق امرتسر سے تھا۔ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد لائل پور جناح کالونی میں مدرسہ دار القرآن کی بنیاد رکھی جو آج کل ملک کا ایک نامور مدرسہ ہے۔ مولاناؒ امانت و دیانت میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ منتظم اور مفتی بھی تھے۔ ان کا فتاویٰ مولانا محمد سعید چنیوٹیؒ نے مولانا کی سوانح حیات میں شامل کر دیا ہے۔

کے بجائے سلف کے طریقہ کی پیروی کرتے ہیں۔

۱۰: فتاویٰ مولانا عطاء اللہ حنیفؒ (۱۲ اکتوبر ۱۹۸۷ء):۔

مولاناؒ کا شمار مرکزی جمعیت اہل حدیث کے بانیوں میں ہوتا ہے۔
مولاناؒ علمی حلقوں میں بڑا بلند مقام رکھتے تھے۔ان کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ کتاب دوست انسان تھے۔ مولانا بیک وقت مدرس، مصنف،ایڈیٹر اور مفتی بھی تھے،ان کا فتاویٰ راقم نے مرتب کر کے حافظ احمد شاکر کو دیا تھا۔

مولانا جدید وقدیم مسائل پر اچھی نظر رکھتے تھے ان کے حالات پر ہفت روزہ الاعتصام کا نمبر مرقع شہود پر آرہا ہے۔

۱۱: فتاویٰ زبیدی،مولانا عبدالعزیز زبیدی حفظہ اللہ:۔

مولانا نے زیادہ تر تعلیم احناف کے مدرسہ میں پائی اور پھر مولانا سلطان محمود صاحبؒ سے درس حدیث لیا تو فقہ کی جگہ فقہ الحدیث کا غلبہ ہو گیا اور اس کے ساتھ انہوں نے بخاری شریف پر عربی حاشیہ لکھا۔مولانا کا علمی حلقوں میں ایک نام ہے۔مولانا مدرس، مصنف اور صاحب رائے انسان ہیں۔ان میں دلائل اور تفصیل ہوتی ہے راقم نے ان کے فتاویٰ کو جمع تو کر لیا ہے مگر کچھ کام باقی ہے۔مولانا آج کل بیمار ہیں اللہ ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔

۱۲: فتاویٰ صراط مستقیم:۔

مولانا محمود احمد میرپوریؒ (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ء)۔مرتب ثناء اللہ سیالکوٹی۔مولانا قدیم و جدید علوم سے بہرور تھے، جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ سے فارغ ہونے کے بعد جامعہ پنجاب سے ایم اے کر کے جامعہ اسلامیہ مدینہ میں داخلہ لیا۔مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد برطانیہ میں تبلیغ کے لئے گئے اور وہاں ایک مرکز قائم کیا اور رسالہ صراط مستقیم بھی جاری کیا اس میں سوالات کے جوابات دیتے تھے یہ فتاویٰ مکتبہ قدوسیہ لاہور سے شائع ہوا ایک جلد میں جو ۵۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۲: فتاویٰ برکاتیہ:۔

مولانا ابوالبرکات احمد بن محمد اسمٰعیلؒ م ۱۹۹۱ء مرتب محمد یحییٰ جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ نے شائع کیا جو ایک جلد میں ہے۔مولانا ابوالبرکات عالم و فاضل ہونے کے ساتھ صاحب دل انسان بھی تھے۔طلبہ سے نہایت محبت سے پیش آتے۔ پوری زندگی وعظ و درس میں گزاری۔ حضرت جامعہ اسلامیہ کے شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز رہے ان کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔

انہوں نے اردو، فاری اور عربی تینوں زبانوں میں فتوے لکھے۔ اردو میں ان

نیز اس فتاویٰ میں حضرت امام محمد گوندلوی کی تقدیقات موجود ہیں۔ جو ہفت روزہ اہل حدیث وغیرہ میں طبع ہوتے رہے۔ اس فتاویٰ میں جدید مسائل پر بھی لکھا گیا ہے۔ مثلاً خون کا عطیہ، انعامی بانڈ، پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت۔ راقم کو ان کے جنازہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہے۔

۱۳: فتاویٰ رفیقہ مولانا محمد رفیق پسروری (۲۳ فروری م ۱۹۷۷ء)

مولانا ایک مناظر کی حیثیت سے بہت معروف تھے۔ مولانا کا فتاویٰ چھوٹے سائز کے ۴ حصوں پر مشتمل ہے۔ اہل حدیث کے امتیازی مسائل پر ایک اچھی کاوش ہے۔

۱۴: مفتی پاکستان حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ فاضل مدینہ یونیورسٹی:

حافظ صاحب حافظ محمد عبداللہ روپڑی کے شاگرد خاص ہیں۔ حافظ صاحب کے فتویٰ کا اسلوب بھی حضرت حافظ عبداللہ جیسا ہے یعنی با دلائل۔

اگر چہ ان کے فتاویٰ ابھی تک غیر مرتب اور کتابی شکل میں نہیں۔

مگر ہفت روزہ اہل حدیث اور الاعتصام میں اکثر طبع ہوتے رہتے ہیں۔

۱۵: احکام و مسائل شیخ الحدیث حافظ عبدالمنان نور پوری حفظہ اللہ:۔

حافظ صاحب جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث ہیں، جماعت کے نامور عالم دین ہیں امور فتویٰ میں کمال حاصل ہے۔ ان کا فتویٰ حال ہی میں ایک جلد میں شائع ہوا ہے۔ جو قابل تحسین علمی کاوش ہے۔

۱۶: مولانا عبیداللہ عفیف:۔

مولانا عبیداللہ عفیف جامعہ سلفیہ کے فاضل ہیں ایک مدت سے مدرس اور مفتی کے عہدے پر فائز ہیں۔ فتویٰ لکھتے وقت عرق ریزی سے کام لیتے ہیں۔ ان کا فتاویٰ مکتبہ قدوسیہ لاہور عنقریب شائع کر رہا ہے، جو تین چار جلد میں ہوگا۔ ان کے فتاویٰ جدید، قدیم کا سنگم ہیں۔

۱۷: آپ کے مسائل اور ان کا حل: مولانا مبشر ربانی لاہور:۔

اس نوجوان نے علمی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا ہے، اللہ اس کی عمر میں برکت عطاء فرمائے۔

ان کے فتاویٰ قدرے طویل لیکن تسلی بخش ہوتے ہیں۔ مجلات و رسائل میں سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ فتاویٰ کی دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں اور تیسری زیر ترتیب ہے۔

ماضی قریب کے معروف علماء کے اگر فتاویٰ جات کو جمع کر دیا جائے تو بہت بڑی علمی خدمت ہوگی۔

کا اسلوب گزشتہ صدی میں علماء کے ہاں مستعمل اسلوب سے مختلف نہیں۔ عربی الفاظ اور تراکیب کا اس پر گہرا اثر ہے املا میں بھی پرانا انداز نظر آتا ہے۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مزید علمی و دینی خدمات کی توفیق بخشے۔

آمین۔

محمد عزیر

مثلاً:

۱) شیخ الحدیث مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی (م ۱۹۶۲ء)

۲) ملک عبدالعزیز ملتانی (م/۱۹۶۹ء)
تلمیذ خاص شیخ الاسلام ثناء اللہ امرتسری

۳) مولانا عبداللہ ثانی جڑانوالہ فیصل آباد (م ۱۹۸۳ء)
تلمیذ فاتح قادیان مولانا ثناء اللہ امرتسری

۴) حافظ محمد عبداللہ بڈھیمالوی مرحوم مفتی جامعہ سلفیہ فیصل آباد (۱۹۸۷ء)

۵) سید محب اللہ شاہ صاحب پیر اف جھنڈ (۲۱ جنوری ۱۹۹۵ء)

۶) سید بدیع الدین پیراف جھنڈ سندھ (م ۸ جنوری ۱۹۹۶ء)

۷) مفسر قرآن مفتی محمد عبدہؒ جامعہ سلفیہ فیصل آباد (م ۳۰ جون ۱۹۹۹ء)

۸) شیخ الحدیث مولانا قدرت اللہ فوق جامعہ سلفیہ

۹) مولانا محمد علی جانباز سیالکوٹ

۱۰) مولانا زبیر احمد زئی، حضرو (سرحد)

۱۱) مولانا محمد عبداللہ امجد صاحب ستیانہ فیصل آباد

موجودہ حالات میں مسئلہ جامعہ سلفیہ کمیٹی کا فتاویٰ جات اگر مرتب کر دیے جائیں تو بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

[محمد اشرف جاوید ولد محمد صدیق (آل عبدالرحمن)، لائبریرین جامعہ سلفیہ فیصل آباد]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احکام قربانی

سوال:

احکام قربانی تفصیل سے بیان فرمادیں؟

جواب:

قربانی کے واجب یا سنتِ مؤکدہ ہونے کے متعلق علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے، مگر صحیح و محقق بات یہی ہے کہ یہ سنت مؤکدہ ہے۔ یہی جمہور کا مذہب ہے۔ امام بخاریؒ نے اس کے سنت ہونے پر باب قائم کیا ہے جس بنا پر یہ سنت ہے۔ طوالت کے خدشہ سے اختصار کیا ہے۔

قربانی واجب نہیں، کیونکہ وجوب پر کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی کسی صحابیؓ سے واجب ہونا منقول ہے۔ جو حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كَانَ لَهُ سَعَةٌ وَ لَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا۔ (ابن ماجہ)

''کہ جو شخص استطاعت کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔'' (رواہ ابن ماجہ، البانی: ۲/۱۹۹)

اول:

تو اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف ہے زیادہ صحیح یہی ہے کہ یہ موقوف ہے

دوم:

اس سے وجوب نہیں، بلکہ تاکید ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ کچا پیاز وغیرہ کھانے سے متعلق فرمایا کہ مسجد میں کھا کر نہ آؤ، حالانکہ بالاتفاق اس سے حرمت ثابت نہیں

ہوتی۔ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی حلت ثابت ہے۔ کما لا یخفی من له فهم سلیم۔

اور اس کا سنت ہونا دلائل سے ثابت ہے جن کی تفصیل بوجہ اختصار یہاں ترک کردی گئی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ۱۰ص۳ میں سنیت کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کے وجوب کے قائلین کی مخالفت کا عندیہ ظاہر کیا ہے۔

قال ابن حزم: لا یصح عن احد من الصحابة انها واجبة و صح انها غير واجبة عن الجمهور، و عن محمد بن الحسن هي سنة غير مرخصة فی ترکها، وقال الطحاوی وبه ناخذ و لیس فی الاثار ما یدل علی وجوبها، انتهی-واقرب ما یتمسک به للوجوب حدیث ابی هریرةؓ رفعه: مَنْ وُجَدَ سَعَة فَلَمْ يُضَحِّ فَلاَ يقربن مُصَلَّانَا، اخرجه ابن ماجة و احمد ورجاله ثقات، لکن اختلف فی رفعه ووقفه والموقوف اشبه بالصواب، قاله الطحاوی وغیره رفع ذلک فلیس صریح فی الوجوب، انتهی ملخصا۔ (محلی ابن حزم ۷/ ۳۵۸، هدایہ۴/ ۴۲۷)

''ابن حزم کہتے ہیں صحابہ کرام سے کسی ایک سے بھی وارد نہیں کہ یہ واجب ہے، بلکہ جمہور سے اس کا غیر واجب ہونا منقول ہے۔ اور محمد بن الحسنؒ سے مروی ہے کہ یہ ایسی سنت ہے جس کے ترک کی اجازت نہیں۔ طحاوی نے کہا یہی ہمارا مذہب ہے اور آثار سے اس کے وجوب کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ انتہی۔ اور زیادہ سے زیادہ جس سے وجوب کی دلیل اخذ کی جاسکتی ہے وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جسے وہ مرفوع بیان کرتے ہیں: کہ جو شخص استطاعت کے باوجود قربانی نہ کرے وہ

ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔ (ابن ماجہ، احمد ورجالہ ثقات)
لیکن اس کے مرفوع وموقوف ہونے میں اختلاف ہے طحاویؒ اور
دیگر ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو قریب تر کہا ہے۔ نیز اس
سے وجوب کی صراحت نہیں ہوتی۔ (انتھی ملخصاً)

اور قربانی کے لئے صاحبِ نصاب ہونا بھی شرط نہیں ہے، کیونکہ اس شرط کے لئے کوئی دلیل ثابت نہیں، بلکہ صرف استطاعت اور قدرت ہونی چاہئے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں ہے۔ کما لا یخفی۔

مسافر کی قربانی:۔

اور اقامت (یعنی مسافر نہ ہونا) بھی شرط نہیں ہے، کیونکہ اس پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ دلیل اس کے مخالف ہے۔ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں باب الاضحیہ للمسافر والنساء (یعنی مسافر اور عورت کی قربانی) قائم کیا ہے۔ اور اس میں فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر مکہ کے دوران قربانی کی ہے:۔

اس پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

فیه اشارة الی خلاف من قال ان المسافر لا اضحیة علیه۔

”اس باب وحدیث کو لا کر امام بخاریؒ نے سفر میں قربانی نہ ہونے والے قول کی مخالفت ثابت کی ہے۔“ (فتح الباری ۱۰/۵)

اس میں مسافر پر قربانی کے نہ ہونے کے قائل کی مخالفت کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس سے بالصراحت واضح ہوا کہ اقامت قربانی کے لئے شرط نہیں ہے۔ کما لا یخفی۔ نیز احناف کے نزدیک قربانی صاحبِ نصابِ زکوۃ پر اس طرح واجب ہے جیسا کہ صدقۃ الفطر، بشرطیکہ مسافر نہ ہو۔ ہدایہ میں ہے:

الاضحیة واجبة علی کل حر مسلم مقیم موسر فی یوم الاضحی علی نفسه و علی ولده الصغار والنساء لما روینا من اشتراط السعة ومقداره ما یجب به صدقة

الفطر -(ملخص بقدر الحاجة) (هدایه/۴/۷/۴۲۷)

''قربانی ہر آزاد مسلمان مقیم پر جو قربانی کے روز خوشحال ہو اس کی اپنی ذات چھوٹے بچوں اور عورتوں پر فرض ہے جس کی دلیل وہ حدیث (ابو ہریرہؓ) ہے جسے ہم نے بیان کیا ہے یعنی جس میں وسعت کی شرط پر قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ آسودگی اور خوشحالی کی مقدار وہی ہے جس سے صدقہ فطر واجب ہوتا ہے۔''

حجامت:۔

اور جو شخص قربانی کرنے کا ارادہ رکھے اسے چاہیئے کہ جب ذوالحج کا چاند دیکھ لے تب سے قربانی کرنے تک بال اور ناخن نہ کٹوائے جیسا کہ بخاری کے علاوہ اور دیگر کتب حدیث میں بھی ہے:

عَنْ اُمِّ سَلْمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا رَأَيْتُمْ هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ وَ أَرَادَ أَحَدُكُمْ اَنْ يُّضَحِّيَ فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهٖ وَ اَظْفَارِهٖ-رواه الجماعة (منتقى الأخبار ۲/۳۰۰، مصابیح السنة ۱/۴۹۰ و مسلم ص ۱۵۶۵، الباني ۳۳۴)

''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا جو شخص ذوالحج کا چاند دیکھے اور وہ قربانی کا ارادہ رکھے تو بال اور ناخن نہ کٹوائے۔

قربانی کا وقت:۔

قربانی کا وقت نمازِ عید ادا کرنے کے بعد ہے اور اگر کسی نے عید کی نماز سے قبل ذبح کرلیا تو نہ صرف قربانی ناجائز ہوگی، بلکہ اس کی جگہ دوسری بھی کرنا ہوگی، کیونکہ بخاری شریف میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ أَوَّلَ مَا نَبْدَأُ فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا أَنْ نُصَلِّيَ ثُمَّ نَرْجِعَ فَنَنْحَرَ، مَنْ فَعَلَهُ فَقَدْ أَصَابَ سُنَّتَنَا وَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلُ فَإِنَّمَا هُوَ لَحْمٌ قَدَّمَهُ لِأَهْلِهِ لَيْسَ مِنَ النُّسُكِ فِيْ شَيْءٍ-الحديث ـ

(رواہ البخاری، فتح الباری ۱۰/۳۳، مسلم ۳/۱۵۵۳)

''آج کے روز ہمارا سب سے پہلا عمل نماز پڑھنا ہے پھر واپس لوٹ کر قربانی کریں گے جس نے ایسا کیا اس نے ہماری سنت کو پالیا (سنت کے موافق عمل کیا) اور جس نے (نماز سے) پہلے قربانی کی تو وہ صرف گوشت ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کو پیش کیا ہے، قربانی میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔''

احناف کے نزدیک بھی ماسوا دیہات میں رہنے والوں کے یہی وقت ہے۔

جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

وقت الاضحية يدخل بطلوع الفجر من يوم النّحر الا انه لا يجوز لأهل الامصار الذّبح حتّى يصلّى الامام العيد، فامّا اهل السّواد فيذبحون بعد الفجر-(ہدایہ ۴/۴۲۹)

''قربانی کا وقت تو دسویں ذوالحج کے طلوع فجر ہی سے شروع ہوجاتا ہے، لیکن شہر والوں کے لئے قربانی کرنا جائز نہیں ہے، حتیٰ کہ امام عید کی نماز سے فارغ ہوجائے، البتہ دیہاتوں والے طلوع فجر کے بعد قربانی کرلیں''۔[1]

---

[1] قربانی میں دیہاتوں اور شہریوں کا فرق کئی دوسرے ائمہ کے نزدیک ساقط الاعتبار ہے لہذا حق اور صحیح بات یہی ہے کہ نمازِ عید کے بعد قربانی کا جانور ذبح کیا جائے۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ قربانی کا وقت امام کی نماز سے قبل ناجائز اور نماز کے بعد امام کی قربانی سے قبل جائز ہے، خواہ وہ شہروں کے باسی ہوں یا دیہاتوں کے رہنے والے، یہی رائے امام

قربانی کے جانور کی عمر:

بکری کی عمر ایک سال، یعنی ایک سال مکمل ہو کر دوسرا شروع ہو جائے، گائے اور بھینس کی دو سال، یعنی دو سال مکمل ہو کر تیسرا شروع ہو جائے، اونٹ کی پانچ سال اور چھٹا شروع ہو۔ بھیڑ (مینڈھا) ایک سال سے کم بھی جائز ہے۔ بشرطیکہ خوب موٹا تازہ اور ایک سال کا معلوم ہوتا ہو۔ جس کی دلیل حضرت جابرؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّةً اِلَّا اَنْ يَّعْسُرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوْا جَذْعَةً مِنَ الضَّأْنِ -(رواه الجماعة الا البخاری (المنتقی ٢/٣٠١، مصابیح ١/٤٨٩، مسلم٢/١٠٠،٣/١٥٥٥)

"دو دانت والے کے سوا ذبح نہ کرو مگر کہ تم پر تنگی ہو تو بھیڑ کا جذعہ (ایک سال کا) ذبح کرو۔"

مسنّہ:

ہر جانور میں سے "ثنی" کو کہتے ہیں اور "ثنی" بکری میں سے جو ایک سال مکمل کرنے کے بعد دوسرے میں ہو اور گائے بھینس میں سے جو دو سال مکمل ہونے کے بعد تیسرے میں ہو، اور اونٹ جو پانچ سال مکمل کرنے کے بعد چھٹے میں ہو، جیسا کہ "نیل الاوطار" میں ہے:

حسنؒ، اوزاعی اور اسحاقؒ کی ہے۔ نیز

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ طلوع شمس یا طلوع فجر کے قائلین کی رائے پر عمل کرنا درست نہیں ہے، جو منقول ہے کہ یوم النحر "ذبح کا دن" ہے اس لئے کہ وہ مثل عموم کے ہے تو اس باب کی روایات اسے خاص کرتی ہیں سو عموم کو خاص پر بنا کیا جائے گا۔ (نیل الاوطار ج ٣ ص ١٤١)

اور علامہ شیخ عبیداللہ مبارک پوریؒ نے بھی دلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے امام احمدؒ کے مذہب کو ترجیح دی ہے کہ قربانی کا وقت طلوع شمس یا طلوع فجر کی بجائے نماز عید سے مشروط ہے (جیسا کہ حدیث براءؓ) اور اس میں اہل الامصار اور اہل البوادی برابر ہیں۔ (مرعاۃ المفاتیح ج ٢ ص ٣٢٦) (خلیق)

قَوْلُه' "اِلَّا مُسِنَّة" قال العلماء اَلْمُسَنَّةُ هِیَ الثَّنِیَةُ من کلّ شیء من الابل و البقر والغنم (انتھی) وَالثَّنی من الشّاۃ مادخل فی السّنۃ الثّانیۃ، کذا فی مفرداتِ القرآن الامام الراغب القاسم الحسین وھوالقدم علی الغزالی و القاضی ناصر الدین البیضاوی ۔(نیل الاوطار ۱۲۱/۵، مفردات القرآن ـ۸۰)

''مُسِنَّة: علماء کہتے ہیں مسنہ ہر وہ اونٹ، گائے اور بکری ہے جو دو دانت والا ہو اور بکری کا ''ثنی'' جو دوسرے سال میں داخل ہوجائے۔''

منتھی الارب میں ہے:

ثنی کفنی شتر درسال ششم درآمدہ۔

''ثنی فنی کی طرح ہے، اونٹ کا ثنی وہ ہے جو چھٹے سال میں داخل ہوگیا۔''

والثّنی منھا و من المعز ابن سنة و من البقر ابن سنتین و من الابل ابن خمس سنین و یدخل فی البقر الجاموس لانه من جنسه۔(الھدایۃ ۴/۴۳۳)

''اور ثنی بکری کا ایک سال کا ہوتا ہے اور گائے کا دو سال کا اور اونٹ کا پانچ سال کا اور گائے میں بھینس بھی داخل ہے، کیونکہ وہ اس جنس سے ہے۔(ہدایہ)

جذعہ:

بھیڑ میں سے اسے کہتے ہیں جو سال سے کم ہو۔[1]

---

[1] ''مسنہ'' کے بارے میں علامہ عبیداللہ مبارکپوری رقمطراز ہیں کہ:

اہل لغت اور اصحابِ شروح الحدیث والفقہ کے اقوال سے یہ بات عیاں ہے کہ:

الجذع من الضّان ماتمّت له ستّة اشهر في مذهب الفقهاء وذكر الزّعفرانىّ رحمة الله عليه انه ابن سبعة اشهر- (هدايه ۴/۴۳۳)

''فقہاء کے نزدیک بھیڑ کا جذعہ وہ ہے جس کے چھ ماہ مکمل ہو جائیں اور زعفرانی رحمہ اللہ کہتے ہیں جو ساتویں ماہ میں ہو۔''

مگر مذکورہ شرط کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں:

هذا اذا كانت عظيمة بحيث لوخلط بالثّنان يشتبه على النّاظر من بعيد-(هدايه ۴/۴۳۳)

''کہ جذعہ جائز ہونے کا حکم اس وقت ہے کہ اتنا بڑا ہو کہ اگر وہ ثنی (دو دانت والے) جانوروں میں ملا دیا جائے تو دور سے دیکھنے والے پر مشتبہ ہو جائے۔''

قربانی کے جانور کی صفات:

اور شرط یہ ہے کہ قربانی کا جانور مندرجہ ذیل عیوب سے پاک ہو:

۱)...... اس کے سینگ آدھے یا آدھے سے زیادہ نہ کٹے ہوں۔

۲)...... کان کٹا نہ ہو۔

''مسنہ'' اور ''مسن'' اسنان سے ماخوذ ہے جو کہ دانتوں میں سے ایک دانت کا ظاہر ہو جانا ہے، نیز مسن، ثنی، مسنہ، ثنیہ ایک ہی چیز ہے۔ اونٹ گائے اور بکری میں سے ''مسن'' وہ ہے جو اپنے منہ کے اگلے دانت گرا دے۔ مسن اور ثنی (یعنی دانتا) میں اور قربانی کی عمر کے مفہوم کا اعتبار دانتوں کے گرانے، دانت کے اگنے اور اسکے ظاہر ہونے پر ہے اور اس کی عمر کی طرف التفات نہ کیا جائے گا اور اونٹ، گائے اور بکری کی قربانی صرف اسی صورت میں جائز ہوگی جبکہ اس کا دانت گر جائے اور ان مذکورہ جانوروں کا دانت بھی ظاہر ہو جائے،

نیز جذعہ کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ اور جمہور علماء کہتے ہیں کہ بھیڑ سے مراد وہ ہے جس کا تقریباً ایک سال ہو جائے۔ (مرعاۃ المفاتیح ج۲ ص۳۵۳) .... (خلیق)

۳)...... کانا یا اندھا نہ ہو۔

۴)...... ظاہراً لنگڑا نہ ہو۔

۵)...... بہت بیمار نہ ہو۔

۶)...... اتنا بوڑھا نہ ہو کہ ہڈیوں کا گودا باقی نہ رہا ہو۔

۷)...... کان پھٹا ہوا نہ ہو۔

کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّضَحّٰى بَاَعْضَبِ الْقَرْنِ وَالْاُذُنِ، قَالَ قَتَادَةُ فَذَكَرْتُ لِسَعِيْدِبْنِ الْمُسَيَّبِ فَقَالَ، اَلْعَضْبُ: النّصف فَاَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ-رواه الخمسة و صححه الترمذی و لکن ابن ماجة لم یذکر قول قتادة ......الخ-(ترمذی احمد شاکر ۴/۹۰، ابن ماجہ ۲/۲۰۲، ابوداؤد ۳/ ۲۳۸، مسند احمد ۱/۸۳، مصابیح السنہ ۱/۴۹۳)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ ٹوٹے ہوئے سینگ اور پھٹے ہوئے کان والا جانور ذبح کیا جائے۔ قتادہؒ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن میتبؒ سے ذکر کیا تو کہنے لگے کہ اَلْعَضْبُ: نصف یا اس سے زیادہ، کٹے ہوئے کو کہتے ہیں۔"

اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قَالَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ لاَ يَجُوْزُ فِىْ الْاَضَاحِىَ اَلْعَوْرَاءُ اَلْبَيِّنُ عَوَرُهَا وَالْمَرِيْضَةُ اَلْبَيِّنُ مَرَضُهَا وَالْعَرْجَاءُ اَلْبَيِّنُ ظَلَعُهَا وَالْكَسِيْرُ الَّتِىْ لاَ تُنْقٰى-(رواه......[1] وصحہ الترمذی، (منتقی الاخبار ۲/۳۰۲)،(ترمذی ۱۴۶۵ البانی، ابن

---

[1] مؤلف نے یہاں خالی چھوڑا ہے۔

ماجہ ۲/۲۰۲ البانی، ترمذی احمد شاکر ۴/۹۰، مصابیح السنہ ۱/۴۹۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: چار قسم کے جانور قربانی میں جائز نہیں ہیں۔ کانا جس کا کانا پن ظاہر ہو اور بیمار جس کی بیماری نمایاں ہو، اور لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو اور بڑی عمر کا جس کی ہڈیوں کا گودا باقی نہ ہو۔

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں:

اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْاُذُنَ وَاَنْ لاَ نُضَحِّيَ بِمُقَابَلَةٍ وَلاَمُدَابَرَةٍ وَلاَ شَرْقَاءَ وَلاَ خَرْقَاءَ -رواه الترمذی وابوداود والنسائی والدارمی و ابن ماجه، و انتهت روايته الى قوله: والاُذُن، كذا فی المشكاة، (احمد ۱/۱۰۸، ابوداود ۳/۲۳۷، ابن ماجہ ۲/۲۰۲، البانی۔ مصابیح السنہ ۱/۴۹۲، دارمی ۲/۴)

”کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ آنکھ اور کان اچھی طرح دیکھ لیں اور ایسی قربانی نہ کریں جس کا کان اگلی جانب سے پھٹا ہو یا پچھلی طرف سے اور وہ جانور جس کا کان لمبائی یا گولائی میں پھٹا ہو۔ ابن ماجہ کی روایت ”الاذن“ تک ہے۔“

اور احناف کے نزدیک جانور ان سب عیوب سے پاک ہو اور ان کے ہاں دم بھی نصف سے زیادہ کٹی ہوئی نہ ہو، ماسوا سینگ یا کان کے کہ وہ کٹے پھٹے عیب نہیں ہیں۔ ہاں! کان اگر نصف سے زیادہ کٹا ہو تو عیب ہے، ورنہ عیب نہ ہوگا، ہدایہ میں ہے:

ولا يضحی بالعمياء والعوراء والعرجاء الّتی لا تمشی الی المنسک ولا العجفاء ولا تجزی مقطوعة الاذن والذَّنَب ولا الّتی ذهب اكثر اذنها و

ذنبها و ان بقی اکثر الاذن والذّنب جاز ویجوز ان یّضحّی بالجمّاء۔(هدایه ۴/ ۴۳۱)

''اندھا، کانا، لنگڑا جو قربان گاہ کی طرف چل کر نہ جاسکتا ہو، نہ ہی لاغر، کان کٹے اور دم کٹے کی قربانی کی جائے گی جس کے کان اور دم کا زیادہ حصہ کٹا ہوا ہو اور اگر دونوں کا زیادہ حصہ باقی ہو تو جائز ہوگا، نیز بے سینگ کی قربانی بھی جائز ہے۔''

قربانی کا جانور خریدنے کے بعد عیب کا پیدا ہو جانے کا حکم:

اور یہ عیوب معتبر ہیں لیکن اگر بہ نیت قربانی جانور تمام عیوب سے سالم خریدا تھا اور بعد میں کوئی عیب پیدا ہو گیا تو وہ (بطور قربانی) جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں:

اِشْتَرَیْتُ کَبْشًا اُضَحِّی بِهٖ فَعَدی الذِّئْبُ فَأَخَذَ الْاِلْیَةَ، قَالَ سَأَلْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ضَحِّ بِهٖ،(رواہ احمد)

وهو دلیل علی انّ العیب الحادث بعد التّعیّن لایضرّ۔ (المنتقی) (نیل الاوطار ۵/ ۱۲۵۔۱۲۶) فی اسناد جابر جعفی وهو ضعیف جداً۔

''کہ میں نے ایک دنبہ بغرض قربانی خریدا، اس پر ایک بھیڑیا جھپٹا اور اس کی چکی لے گیا۔ سو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی کی قربانی کرلو۔ پس یہ دلیل ہے کہ تعین کے بعد عیب کا پیدا ہو جانا مضر نہیں ہے۔ (الفتح الربانی ۱۳/ ۸۰)

احناف کے نزدیک غنی کو دوسری بدل لینی چاہیے اور غریب کے لئے وہی درست وکافی ہے، چنانچہ مذکور ہے:

وهذا الّذی ذکرنا اذا کانت هذه العیوب قائمة وقت

الشّراء،ولو اشترا ھا سلیمة ثمّ تعیب بعیب مانع ان کان غنیّا علیه غیره و ان کان فقیرا تجزیه هذه، لانّ الوجوب علی الغنّی با لشّرع ابتداء لا بالشّراء فلم تتعّین به و علی الفقیر بشرائه بنیّة الاضحیة فتعیّنت-(هدایه ۴/۴۳۲)

''اور جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ عیوب جبکہ وقت خرید موجود ہوں اور اگر اس نے سالم خریدا تھا پھر اس میں قربانی سے مانع کوئی عیب پیدا ہو جائے، سو اگر مالدار ہے تو اس کے ذمہ دوسری ہے اور اگر وہ تنگدست ہے تو اس کیلئے یہی جائز ہے، اس لئے کہ تونگر کے ذمہ شرع میں ابتدا سے واجب تھی نہ کہ خریدنے کے بعد اور تنگدست پر صرف یہ جانور قربانی کی نیت سے خریدنے کی بنا پر متعین ہوا تھا۔''

خصی جانور کا حکم:

خصی جانور کی قربانی جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصی جانور کی قربانی کی ہے جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہتی ہیں کہ:

ضَحّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكَبْشَيْنِ سَمِيْنَيْنِ عَظِيْمَيْنِ اَمْلَحَيْنِ[1] اَقْرَنَيْنِ مَوْجُوْئَيْنِ -رواه احمد۔ (منتقی الاخبار ۲/۳۰۵) (فتح الباری کتاب الاضاحی ۵۵۶۴ مصابیح السنۃ ۱/۴۸۰، مسلم ۴/۱۹۶۶)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بڑے، موٹے، خوبصورت سینگوں والے خصی مینڈھوں کی قربانی کی۔''

اس مضمون سے متعلق اور بھی بہت سی احادیث منقول ہیں، مگر بخوف طوالت

---

[1] املح اور ملیح: سفید و سیاہ رنگ کے مینڈھے کو کہتے ہیں۔

ایک پر ہی اکتفا کیا ہے۔ حنفی مذہب میں بھی ہے: ویجوز ان یضحی بالجماء والخصی لان لحمها اطیب و قد صح عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَنَّہٗ ضَحّٰی بِکَبْشَیْنِ اَمْلَحَیْنِ مَوْجُوْئَیْنِ۔(۴/۴۳۳) (انتهى ما فى الهداية ملخصا بقدر الحاجة)......... بے سینگ اور خصی جانور کی قربانی جائز ہے کیونکہ اس کا گوشت عمدہ ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے دو خوبصورت اور خصی مینڈھوں کی قربانی دی تھی۔ (ہدایہ)

قربانی کا گوشت کھانا اور دوسروں کو کھلانا:

قربانی کے گوشت میں سے ازروئے قرآن و حدیث خود کھائے اور فقیروں، محتاجوں کو کھلائے، کوئی پابندی نہیں کہ کس قدر خود کھائے اور کتنا فقیروں کو دے۔ فرمانِ الٰہی ہے: فَکُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوْا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ...... الآیۃ (سورۃ الحج ۳۶) اسے (خود بھی) کھاؤ اور مسکین سوال نہ کرنے والوں اور سوال کرنے والوں کی بھی کھلاؤ۔

اور حنفی مذہب میں مستحب ہے کہ ایک تہائی فقیروں، محتاجوں کو دے، جیسا کہ ہدایۃ میں ہے:

> یاکل من لحم الاضحیة و یطعم الاغنیاء و الفقراء و یدّخر و یستحبّ ان لا ینقص الصّدقة عن الثُّلث۔ (انتهى ملخصا)، (هدايه ۴/۴۳۳)
>
> ”قربانی کا گوشت (خود) کھائے، اغنیا و فقراء کو کھلائے، ذخیر کرلے اور بہتر ہوگا کہ ایک تہائی سے کم صدقہ نہ کرے۔“

قربانی کی کھال کا مصرف:

قصاب کی اجرت قربانی میں سے نہ دے (بلکہ) اپنے پاس سے علیحدہ دے۔

> عَنْ عَلِیٍّ قَالَ بَعَثَنِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُمْتُ عَلَی الْبُدْنِ فَاَمَرَنِیْ فَقَسَّمْتُ لُحُوْمَهَا ثُمَّ اَمَرَنِیْ فَقَسَّمْتُ جِلَالَهَا وَجُلُوْدَهَا۔وقال سفیان حدثنی عبدالکریم۔ (بخاری ج حدیث

۱۷۱۷، مسلم ۲/۹۵۴، مصابیح السنۃ ۲/۲۶۶)

عَنْ عبدالرحمن بن اَبِی لَیْلٰی عَنْ علیؓ قَالَ: اَمَرَنِی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اَقُوْمَ عَلَی الْبُدْنِ وَلاَ اُعْطِی عَلَیْھَا شَیْئًا فِی جِزَارَتِھَا۔ (رواہ البخاری، فتح الباری ۳/ ۱۷۱۷، مصابیح السنۃ ۲/۲۶۶)

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے مجھے بھیجا کہ میں اونٹوں کی قربانی کی نگرانی کروں، سو مجھ کو حکم دیا تو میں نے گوشت تقسیم کیا، پھر حکم دیا تو میں نے ان کی جھولیں اور کھالیں تقسیم (خیرات) کردیں۔ عبدالکریم نے مجاہد سے بیان کیا اور انہوں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلی سے اور انہوں نے حضرت علیؓ سے کہ: مجھے نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ قربانیوں کی نگرانی کروں اور ان میں سے قصاب کو اجرت میں سے کچھ نہ دوں۔

اور قربانی کی کھالوں کو یا تو صدقہ کروں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، یا اس میں سے کوئی چیز استعمال کی مثل مشکیزہ، ڈول وغیرہ بنالوں، فروخت نہ کی جائے، جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث سے ظاہر ہے۔''

اور حنفی مذہب میں بھی یہی ہے:

ویتصدّق بجلدھا لانّہ جزء منھا ویعمل منہ آلۃ تستعمل فی البیت کالنّطع والجراب والغربال ونحوھا۔ (ھدایہ ۴/۴۳۴) واللّٰہ اعلم بالصواب۔

''اور اس (قربانی) کی کھال کو صدقہ کردے اس لئے کہ وہ اسی کا حصہ ہے، یا پھر اس سے کوئی گھریلو کارآمد چیز بنالے جیسا کہ چٹائی، چمڑے کا تھیلا اور چھلنی وغیرہ۔''

قد حرّرہ المھین محمد یٰسین الرحیم آبادی

ثم العظیم آبادی عفی عنہ۔

اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام:

⇦ محمد عبدالحمید غفر اللہ عنہ۔

⇦ ابو محمد عبدالوہاب ۱۳۰۰ھ رسول الآداب خادم شریعت

⇦ (الجواب صحیح) محمد امیر الدین ۱۳۰۱ حنفی واعظ جامع مسجد دہلی امیر الدین ۱۳۰۱)

⇦ محمد عبید اللہ ۱۲۹۱ھ، مصنف تحفۃ الہند۔ (فقیر محمد عبدالحق ۱۲۹۵ھ)

⇦ (یہ جواب صحیح ہے) حررہ ابو العلی محمد عبدالرحمٰن الاعظم گڑھی المبارکفوری

⇦ (نعم الجواب) ابو القاسم محمد عبدالرحمٰن۔

⇦ جواب ھذا بَاصَوابَ ہے۔حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ۔

⇦ محمد طاہر ۱۳۰۴ھ

⇦ محمد عبداللطیف ۱۲۹۵ھ

⇦ الثقلین محمد تلطف حسین ۱۲۹۲ھ خادم شریعت رسول۔

⇦ سید محمد عبدالسلام غفرلہ ۱۲۹۹ھ

⇦ عبدالرؤف ۱۳۰۳ھ۔

⇦ الجیبُ مُصِیب۔ محمد حسین خان حوز جوے۔

⇦ جواب ہذا صحیح ہے۔ فقیر محمد عبدالقادر عفی عنہ۔

⇦ صحیح .... (فقیر عبدالجلیل)۔

⇦ قد صح الجواب۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حررہ الفقیر ابو محمد عبدالرؤف بہاری مانپوری عفا عنہ۔

⇦ محمد شمس الدین۔ ملک بنگالہ نصیر آبادی۔

⇦ ابو محمد عبدالحق، لودیانوی۔

واللہ الموفق

احکام عقیقہ

سوال:

علمائے دین عقیقہ کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ وہ واجب، سنت یا مستحب ہے اور اسکے کیا کیا احکام ہیں؟ بینوا توجروا۔

عقیقہ کا حکم

جواب:

جمہور کے نزدیک عقیقہ کرنا سنت ہے واجب نہیں اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک مستحب ہے اور بعض کے نزدیک واجب ہے، مگر قول جمہور زیادہ صحیح اور درست ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیقہ کرنا ثابت ہے اور اس کا ترک ثابت نہیں نیز جب وجوب کی کوئی دلیل نہیں تو سنت ہوا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو چیز بغیر ترک کے ثابت ہو وہ سنت ہے جب تک کہ وجوب کی کوئی دلیل موجود نہ ہو اور جو حدیث میں بلفظ 'امر' وارد ہے کہ لڑکے کی طرف سے عقیقہ کرو، جیسا کہ حضرت سلمان بن عامر الضبی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَعَ الْغُلَامِ عَقِيقَةٌ فَاهْرِيقُوْا دَمًا وَ اَمِيْطُوا عَنْهُ الْأَذٰى- رواه الجماعة الا مسلما، كذافي منتقى الاخبار، صحيح ابن ماجہ البانی ۲/۲۰۶، ترمذی البانی ۲/۹۲، ارواء الغلیل حدیث ۱۱۷۱ بیہقی ۸/۲۹۹)

"لڑکے کے پیدا ہونے کے ساتھ عقیقہ ہے اس کی طرف سے

جانور ذبح کرو اور اس سے ایذا کو (یعنی حجامت وغیرہ بنوا کر) دور کرو۔ مسلم کے علاوہ جماعت نے روایت کیا۔

یہ امر وجوب کے لئے نہیں ہے کہ اس سے وجوبِ عقیقہ پر دلیل لائی جائے، کیونکہ دسری حدیث میں ہے (جو آئندہ آئے گی) کہ جو شخص عقیقہ کرنا چاہے کر لے، اس اختیار دینے سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ واجب نہیں ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ حدیث سابق کے امر کے صیغہ کو وجوب پر محمول نہ کیا جائے، تاکہ دونوں حدیثوں میں مطابقت ہو سکے۔

احناف کے نزدیک عقیقہ کا حکم:

امام ابو حنیفہؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ عقیقہ مستحب ہے سنت نہیں، مگر یہ استدلال درست نہیں کیونکہ کسی فعل میں شرع کی طرف سے اختیار سنت کے مخالف نہیں، اس لئے کہ سنت میں بھی اختیار حاصل ہوتا ہے، بلکہ مستحب وہ ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کیا ہو اور کبھی چھوڑا ہو۔ کما لا یخفی علی الماھر بالاصول۔

قوله، "فَاهْرِيقُوْا عَنْهُ دمًا" تمسّک بهذا و بقّية الاحاديث القائلون بانّها واجبة، و هم الظّاهرية والحسن البصرى، و ذهب الجمهور من العترة و غيرهم الى انّها سنّة و ذهب ابوحنيفة الى انّها ليست فرضا ولاسنّة، و ذهب ابوحنيفة الى انّها ليست فرضا ولا سنّة، و قيل انّها عنده تطوّع، احتجّ الجمهور بقوله ﷺ: مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّنْسُکَ عَنْ وَلِدِهٖ فَلْيَفْعَلْ، وسياتى، و ذلک يقتضى عدم الوجوب لتفويضه الى الاختيار فيكون قرينة صارفة لاوامر نحوها عن الوجوب الى النّدب، ولهذا الحديث احتجّ على عدم الوجوب والسُّنِّية، ولكنّه لايخفى انّه لامنافاة بين

التفويض الى الاختيار وبين الفعل الّذى وقع فيه التفويض سنّة۔ (نیل الاوطار ۵/۱۴۰)

”آپ ﷺ کا فرمان ”فاهريقوا عنه دما“ اور دوسری احادیث سے قائلین وجوب نے استدلال لیا ہے اور وہ ظاہری اور حسن بصری ہیں۔ سادات جمہور اور ان کے علاوہ کے نزدیک سنت ہے اور ابوحنیفہؒ کے نزدیک نہ فرض ہے نہ سنت اور کہا گیا کہ ان کے نزدیک نفل ہے۔ جمہور نے آپ ﷺ کے فرمان ”جسے پسند ہو کہ وہ اپنے بچے کی طرف سے ذبح کرے تو وہ کر لے“ جو آئندہ آئے گا، اور اختیار دینا عدمِ وجوب کا متقاضی ہے، سو یہ ایسا قرینۂ صارفہ ہے جو اس قسم کے اوامر کو وجوب سے استحباب کی طرف تحویل کر دیتا ہے اور اس حدیث سے عدم وجوب سے سنیت کا استدلال کیا گیا ہے اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ فعل اختیاری اور فعل مسنون میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔“ (نیل الاوطار)

عقیقہ کا وقت:

بچہ پیدا ہونے کے ساتویں، چودھویں یا اکیسویں روز عقیقہ کرنا بہتر ہے۔

عَنْ سمُرة رضى الله عنه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كُلُّ غُلاَمٍ رَهِينَةٌ بِعَقِيقَةٍ تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ وَ يُسَمّٰى فِيْهِ وَ يُحْلَقُ رَاْسُهٗ رواه الخمسة والترمذى۔ (منتقى الاخبار) ويدلُّ على ذلك ما اخرجه البيهقىُّ عن عبدالله بن بريدة عن ابيه عن النّبىّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: اَلْعَقِيقَةُ تُذْبَحُ لِسَبْعٍ وَلِاَرْبَعَ عَشْرَةَ وَلِاِحْدَى وَ عِشْرِيْنَ[1] (نیل الاوطار ۵/۱۴۰،

---

[1] عقیقہ ساتویں روز کرنا ہی سنت ہے جس طرح سے حضرت سمرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے جبکہ ساتویں، چودھویں اور اکیسویں روز عقیقہ والی حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت ضعیف ہے

ابن ماجہ، البانی ۲/۲۰۶، مشکوٰۃ ۴۱۵۳، بیہقی ۹/۳۰۳، ابوداؤد ۲۸۳۸)

''حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر بچہ اپنے عقیقہ کے ساتھ گروی ہے ساتویں دن اس کی طرف سے (جانور) ذبح کیا جائے گا اس کا نام رکھا جائے اور سر منڈایا جائے۔ اور اسی طرح بیہقی میں عبداللہ بن بریدۃ اپنے والد کے واسطہ سے نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: عقیقہ کا جانور ساتویں، چودھویں اور اکیسویں دن ذبح کیا جائے۔''

اور اگر اکیسویں دن عدم قدرت یا کسی اور سبب سے نہ کر سکے تو جب قدرت ہو تو کرلے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا......الآية. (البقرہ: ۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

اور بلوغت کے بعد والد وغیرہ سے طلب کرنے کا حق حاصل نہیں ہے بلکہ بذاتِ خود اپنی طرف سے کرلے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت کے بعد اپنا عقیقہ کیا ہے، جیسا کہ بیہقی میں ہے:

العقيقة سنّة مؤكّدة و وقتها من الولادة الى البلوغ و يسقط الطّلب عن الأب، والأحسن أن يعقّ عن نفسه تداركا لما فات، والخبر أنّ النّبيّ صلى الله عليه وسلم عقّ عن نفسه بعد النّبوة، لما رواه البيهقيّ، و تكلّم بعض العلماء بصحّة هذا الخبر، وسبع البدنة والبقر كشاة- الشرح القويم فى شرح مسائل التعليم [۱] بس

اور اس کے ضعف کا سبب اسماعیل بن مسلم المکی ہے جس کے بارے میں صاحب بلوغ الامانی نے کہا ہے: وهو ضعيف لكثرة غلطه ووهمه۔ کہ وہ اپنے کثرتِ اغلاط و اوھام کی بنا پر ضعیف ہے۔ (بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی۔ ج ۱۳ ص ۱۲۹) [خلیق]

حجر الهیتمی الشافعی ،بیهقی ۹/ ۳۰۰)

''عقیقہ سنت مؤکدہ ہے اور اس کا وقت ولادت سے لیکر بالغ ہونے تک ہے اور بلوغت کے بعد باپ سے طلب کرنے کا حق ساقط ہو جائے گا اور بہتر ہوگا کہ جو چھوٹ گیا ہے اس کا تدارک خود اپنی جانب سے عقیقہ سے کر لے۔ اور مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کے بعد اپنی طرف سے خود عقیقہ کیا تھا (بیہقی) اور بعض علماء نے اس خبر کی صحت پر کلام کیا ہے کہ اونٹ اور گائے کا ساتواں حصہ ایک بکری کے برابر ہے۔''

(الشرح القدیم للهیتمی)[1]

لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا کرنا چاہئے:

عَن عمر و بن شعیب عن ابیه عن جده قَالَ سُئِل رَسُوْلُ

---

[1] (الف) عقیقہ میں قربانی کی طرح حصے نہیں ہوسکتے:

عقیقہ کو قربانی پر قیاس کرتے ہوئے اونٹ اور گائے میں اشتراک کرنا مشروع نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں میں ایک اہم فرق ہے وہ یہ کہ:

عقیقہ میں خاص بچے کی طرف سے خون بہایا جاتا ہے جو کہ اصل مقصود ہے اور یہی چیز قربانی میں اشتراک سے مانع ہے، جبکہ ایک قربانی خواہ ایک بکری ہو تمام گھر والوں کی طرف سے کفایت کرتی ہے۔ اسی سے متعلق حافظ ابن القیمؒ رقمطراز ہیں:

ولکن سنه رسول الله صلی الله علیه وسلم احق وأولی أن تتبع وهو الذی شرع الاشتراک فی الهدایا، و شرع فی العقیقة عن الغلام دمین مستقلین لا یقوم مقامهما جزور و لا بقرة- (تحفة المودود باحکام المولود ص۵۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی حقیقت میں اس لائق اور استحقاق رکھتی ہے کہ اس کی اتباع کی جائے اور آپ ﷺ ہی نے قربانی میں اشتراک (حصوں) کو مشروع قرار دیا ہے۔ اور آپ ﷺ ہی نے عقیقہ میں بچے کی طرف سے دو مستقل خون بہانے مقرر فرمائے ہیں۔ اونٹ اور گائے ان دونوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتے۔

اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَنِ الْعَقِیْقَةِ، فَقَالَ: لاَ اُحِبُّ الْعُقُوْقَ وَكَاَنَّہ، كَرِهَ الْاِسْمَ، فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّمَا نَسْئَلُكَ عَنْ اَحَدِنَا یُوْلَدُ لَہ، قَالَ مَنْ اَحَبَّ مِنْكُمْ اَنْ یَنْسُكَ عَنْ وَلَدِهٖ فَلْیَفْعَلْ عَنْ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ وَ عَنِ الْجَارِیَةِ شَاةٌ رَوَاهُ احمد ۲/۱۸۲ وابوداؤد ۲/۵۴۷، والنسائی ۷/۱۶۲ (منتقی الاخبار بیهقی ۹/۳۰۰، مصنف عبدالرزاق ۴/۳۳۰)

''عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیقہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں عقوق کو پسند نہیں کرتا، گویا آپؐ نے اس نام کو ناپسند کیا۔ صحابہؓ نے عرض کی اے اللہ کے رسول! ہم تو آپ سے اس بچے کے متعلق پوچھتے ہیں جو کسی کے ہاں متولد ہو آپ نے فرمایا: جس کے ہاں بچہ پیدا ہو اور وہ اپنے بچے کی طرف سے ذبح کرنا چاہے تو وہ لڑکے کی طرف سے دو

(ب) عقیقہ میں صرف دو بکرے یا بکریاں ہی سنت ہیں:

عقیقہ میں سنت کے مطابق ''عن الغلام شاتان مکافئتان و عن الجاریة شاة'' بچے کی طرف سے دو بکریاں اور بچی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرنی چاہیے۔ دوسرے جانور مثلاً اونٹ گائے وغیرہ کرنا ثابت نہیں ہے، بلکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا تھا۔ جیسا کہ ''ارواء'' میں ہے: نفس لعبدالرحمن بن ابی بکر غلام فقیل لعائشة، یا ام المؤمنین! عقی عنه جزورا، فقالت: معاذالله، ولكن ما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: شاتان مكافئتان (ارواء الغلیل ج ۴ ص ۳۹۰، و قال الالبانی اسنادهٗ حسن) کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو حضرت عائشہؓ سے کہا گیا اے ام المؤمنین اس کی طرف سے اونٹ کا عقیقہ کر دیجئے! تو آپ نے فرمایا: اللہ کی پناہ! جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے (وہ کروں گی) دو بکریاں برابر۔ [خلیق]

بکریاں برابر کی اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرے۔ (احمد، ابوداؤد، نسائی۔ منتقی الاخبار)

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللّٰه عَلیه وسلم عقّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ کَبْشًا کَبْشًا-رواه ابوداؤد والنسائی وَقَالَ بِکَبْشَیْنِ(کذافی منتقی الاخبار ۲/۳۶۲)بیہقی ۹/۳۰۲، ترمذی البانی ۲/۹۳، ابوداود ۲/۵۴۷، فی نسائی: کبشین کبشین وهو: اصح

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسن اور حسین (رضی اللہ عنہما) کی طرف سے ایک ایک مینڈھا (بطور عقیقہ کے) ذبح کیا''۔[1] (ابوداؤد) اور نسائی نے کہا: دو دو مینڈھے (ذبح کیے) (منتقی الاخبار)

اور عقیقہ کے جانور کے تمام احکام قربانی کے مثل ہیں، کیونکہ حدیث کی رو سے دونوں کے مابین کوئی فرق ثابت نہیں ہوتا مگر جن عیوب سے قربانی کے جانور کا مبرا ہونا ضروری ہے۔ (جس کی تفصیل گذر چکی ہے) ان سے عقیقہ کے جانور کا مبرا ہونا ضروری نہیں کیونکہ یہ کسی حدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔

الثّانی یشترط فیها ما یشترط فی الأضحیة و فیه وجهان للشّافعیَّة فقد استدلَّ باطلاق الشّاتین علی عدم الاشتراط وهو الحقُّ لکن لا لهذا الاطلاق بل لعدم ورود ما یدلُّ ههنا علی تلک الشروط والعیوب المذکورة فی الاضحیة وهی أحکام شرعیَّة لا تثبت بدون دلیل-(نیل الاوطار ۵/۱۴۶)

---

[1] اس حدیث میں دلیل ہے کہ لڑکے کی جانب سے ایک ہی جانور پر اکتفا جائز ہے اور دو کی تعداد شرط نہیں بلکہ استحبابی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ۵/۸۷) [خلیق]

''دوسرا مسئلہ یہ کہ اس (عقیقہ) کی وہی شروط ہیں جو قربانی میں پائی جاتی ہیں اور اس مسئلہ میں شافعیہ کے دو قول ہیں اور دو بکریوں کے اطلاق سے شروط کے معدوم ہونے پر استدلال کیا گیا ہے جو کہ صحیح مذہب ہے لیکن یہ استدلال اطلاق کی وجہ سے نہیں بلکہ عدم دلیل کی بنا پر ہے جو ان مذکورہ شرائط و عیوب پر دلالت کریں جو قربانی میں پائی جاتی ہیں''۔ (نیل الاوطار)

عقیقہ کے گوشت کا حکم:

عقیقہ کے گوشت کا حکم قربانی جیسا ہے یعنی کرنے والا خود کھائے اور دوسروں کو کھلائے، یہ جو مشہور ہے کہ باپ عقیقہ کا گوشت نہ کھائے بالکل بے اصل ہے۔ اسی طرح عقیقہ سے دائیہ کو مروجہ طریق پر دینا ضروری نہیں، لیکن اگر وہ محتاجوں کے زمرہ میں آتی ہو تو مستحق ہوگی، چنانچہ اس بارے میں شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کا فتویٰ بھی ایسا ہی صادر ہو چکا ہے۔ نیز لڑکے کا سر منڈانا اس کے بالوں کے برابر چاندی وزن کر کے خیرات کرنا اور اس روز نام رکھنا بھی سنت ہے اور لوازماتِ عقیقہ سے ہے، جیسا کہ منتقی میں ہے:

و عن ابی رافع انّ حسن بن علی رضی اللہ عنہ لماولد ارادت امُّه فاطمة ان تعقَّ منه بکبشین۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم: لَاتَعُقِّیْ عَنْهُ وَلٰکِنِ احلِقِیْ شَعْرَ رَاْسِهٖ فَتَصَدَّقِیْ بِوَزْنِهٖ مِنَ الْوَرِقِ، ثمّ ولد حسین فصنعت مثل ذلک۔ (رواه احمد کذافی منتقی الاخبار)(نیل الاوطار ۵/۱۴۴)

''حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو ان کی والدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ان کی طرف سے دو مینڈھوں کے عقیقہ کرنے کا ارادہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی طرف سے عقیقہ نہ

کرو لیکن اس کا سر منڈواؤ اور اس کے بالوں کے برابر چاندی صدقہ کرو پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو انہوں نے وہی عمل دہرایا۔"

اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے عقیقہ کرنے سے جو منع فرمایا تھا وہ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عقیقہ کردیا تھا، جیسا کہ گزشتہ حدیث میں گذر چکا ہے۔

قوله: لَا تَعُقِّیْ عَنْهُ: قیل یحمل هذا علی انّه قدکان صلی اللّٰہ علیه وسلم عَقَّ عَنْهُ و هذا متعین لما قدمنا فی روایة الترمذی والحاکم عن علی رضی اللّٰہ عنه۔

(نیل الاوطار ۱۴۵/۵)

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اس کا عقیقہ نہ کرو یہ اس پر محمول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عقیقہ خود کردیا تھا اور یہ تطبیق ترمذی اور حاکم کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے کی گئی ہے۔

عَنْ عَمرِو بِنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللّٰہ علیه وسلم اَمَرَ بِتَسْمِیَةِ الْمَوْلُوْدِ یَوْمَ سَابِعِهٖ وَوَضْعِ الْاَذٰی عَنْهُ وَالْعَقِّ-رواه الترمذی وَقَالَ: حَدیث حَسَنٌ غَرِیْبٌ-(نیل الاوطار ۱۴۳/۵، منتقیٰ ۳۱۲/۲)

"حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے داداد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں روز نومولود کے نام رکھنے، سر منڈانے اور عقیقہ کرنے کا حکم دیا۔"

اور عقیقہ کی مناسبت سے یہ بھی ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے روز داہنے کان میں اذان کہنی چاہئے اس میں لڑکی اور لڑکے کا ایک حکم ہے۔

عَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم أَذَّنَ فِیْ اُذُنِ الْحُسَیْنِ حِیْنَ وَلَدَتْهُ فَاطِمَةُ بِالصَّلاَةِ-رواه احمدُ وکذلک ابوداؤد والترمذیُ و صححه-وَقَالاَ: اَلْحَسَنِ-(کذافی منتقی الاخبار ۲/۳۱۳، مسند احمد ۶/۸ مصابیح السنۃ ۳/۱۴۶، ابوداؤد کتاب الادب حدیث ۳۳۳ ترمذی البانی حسن صحیح ۲/۹۷ بیہقی ۹/۳۰۵، مصنف عبدالرزاق ۴/۳۳۶)

قد حررہ ابوخیر محمد یٰسین الرحیم آبادی ثم العظیم آبادی عفی عنہ- | درشان محمد یٰسین نازل شدہ جبلپوری |

اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام:

- ⇦ محمد عبیداللہ ۱۲۹۱ھ
- ⇦ فقیر محمد عبدالحق ۱۲۹۵ھ
- ⇦ الجواب صحیح، حمیداللہ عفی عنہ مدرس مدرسہ مطلع العلوم میرٹھ۔
- ⇦ الجواب صحیح، محمد طاہر سلہٹی۔
- ⇦ محمد عبیداللہ، مصنف تحفۃ الہند۔
- ⇦ عقیقہ سنت ہے اگرچہ کیفیت وکمیت میں سہولت ہے۔ امیر احمد پشاوری
- ⇦ الجواب صحیح۔ ابوالقاسم محمد عبدالرحمٰن۔
- ⇦ یہ جواب صحیح ہے۔ حررہ ابوعلی محمد عبدالرحمٰن الاعظم گڑھی المبارکفوری۔
- ⇦ الجواب صحیح والمجیب نجیح حررہ ابوعبداللہ فقیر اللہ متوطن ضلع شاہپور پنجاب
- ⇦ مجیب صاحب نے جواب محققانہ دیا ہے اور بہت صحیح ہے لیکن یہ ضرور یاد رکھیں کہ عوام الناس بلکہ بعض خاص میں بھی یہ مشہور ہے کہ لڑکے کے لئے نر اور لڑکی کے لئے مادہ چاہئے تو یہ قطعاً غلط اور بے اصل ہے۔ حدیث شریف میں ہے خواہ نر ہو یا مادہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

قَالَ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم و لا یَضُرُّکُمْ ذُکْرَانًا اَوْ اِنَا ثًا۔ کذافی ابی داود و الترمذی و النسائی و المشکاۃ و غیرھا و کذافی الشروح الکبار مثل فتح الباری وغیرہ۔ (ترمذی ۲/۹۲ ارواء الغلیل ۴/۳۹۱، مشکوۃ البانی ۲/۱۲۰۸)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے لئے کوئی حرج نہیں خواہ نر ہو یا مادہ۔" (ابوداؤد و ترمذی وغیرہ)

اور اذان کا حکم یہ ہے کہ داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہنی چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مولود اُمّ الصبیان (ایک بیماری ہے جس سے غشی کے دورے پڑتے ہیں) سے محفوظ رہے گا۔"

فِی مُسْنَدِ اَبِی یَعْلَی الْموصِلی عَنِ الْحُسَیْنؓ مَرْفُوْعًا مَنْ وُلِدَلَهٗ[1] وَلَدٌ فَاَذَّنَ فِی اُذُنِهِ الْیُمْنٰی وَ اَقَامَ فِی اُذُنِهِ الْیُسْرٰی لَمْ تَضُرُّهٗ اُمُّ الصِّبْیَانِ[2] رواہ فی جامع الصغیر و کذا فی المرقاۃ و فی شروع السنۃ: ان عمر بن عبدالعزیز کان یؤذّن فی الیمنی و یقیم فی الیسری اذا ولد الصّبیّ-انتھی

"مسند ابو یعلی الموصلی میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً

---

[1] یہ روایت ضعیف ہے بلکہ موضوع ہے۔ اس سند میں جبارہ بن مغلس ضعیف ہے اور یحییٰ بن العلاء متھم بالوضع اور طلحہ بن عبیداللہ مجہول ہے۔ مسند ابی یعلی ۱۲/۱۵۰، تحقیق مولانا ارشاد الحق اثری درست بات اَذَّنَ فِی اُذُنِ الحَسَیْنِ بْن علیؓ ولدتہ فاطمۃ بالصلاۃ رافع عن ابیہ۔ مزید (مسند احمد ۱۲/۱۵۱، مصابیح ۱۳-۱۴۶، ابوداؤد ادب ۵/۳۳۳، ترمذی احمد شاکر ۴/۹۷، مسند احمد ۶/۹، شرح السنۃ ۱۱/۲۷۳، مصنف عبدالرزاق ۴/۳۳۶، مشکوۃ البانی ۲/۱۲۰۹)......... [جاوید]

[2] اسے صاحب التلخیص الحبیر حافظ ابن حجر العسقلانی نے بھی اسے درج کیا ہے اور اس پر کلام نہیں کیا۔ بحوالہ منہاج المسلم، مرتب: للشیخ الجزائری۔ [خلیق]

روایت ہے کہ جس کے ہاں بچہ پیدا ہو وہ اس کے دائیں کان میں
اذان کہے اور بائیں میں اقامت تو اس بچہ کو ام الصبیان (بیماری)
نقصان نہیں دے گی۔ نیز شرح السنۃ میں ہے کہ حضرت عمرؒ ابن
عبدالعزیزؒ نو مولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں
اقامت کہتے تھے۔" (شرح السنۃ ۱۱/۲۷۳)

فقط واللّٰہ اعلم بالصواب، حررہ العاجز ابو محمد عبدالوہاب الفنجابی الجھنکوی ثم الملتانی نزیل الدھلی تجاوز اللہ عن ذنبہ الجلی والخفی۔ (ابو محمد عبدالوہاب رسول الاداب خادم شریعت ۱۳۰۰)

⇦ الجواب صحیح، محمد امیر الدین حنفی واعظ جامع مسجد دہلی۔
⇦ الجواب صحیح، عبداللطیف عفی عنہ سہسپوری ۱۲۹۵ھ
⇦ الجواب صحیح، ابو محمد عبدالرؤف بہاری عفی عنہ ۱۳۰۳ھ
⇦ الثقلین محمد تلطف حسین خادم شریعت رسول ۱۲۹۲ھ
⇦ محمد امیر الدین ۱۳۰۰ھ
⇦ محمد شمس الدین ۱۳۰۵ھ
⇦ سید محمد عبدالاسلام غفرلہ ۱۲۹۹ھ
⇦ ابو محمد عبدالحق لودھیانوی ۱۳۰۵ھ
⇦ عبداللطیف ۱۳۹۰ھ
⇦ عبدالرؤف ۱۳۰۳ھ
⇦ عبدالجلیل عربی

---

[1] عبیداللّٰہ بن ابی رافع عَنْ أبیہ قال: رأیت رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم اذن فی اذن الحسن بن علیؓ بالصلاۃ حین ولدتہ فاطمۃ.......... (مصنف عبدالرزاق ۴/۳۳۶)

قربانی وعقیقہ کی کھال کے تصرف واستعمال کا حکم

سوال:

علماء کرام قربانی اور عقیقہ میں ذبح شدہ جانور کی کھال کے تصرف واستعمال کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ

آیا اس کھال کو اپنے استعمال میں لائے یا فقراء ومساکین کو دے دے، اور اگر فقراء کو دے تو کھال ہی دے یا بیچ کر اس کی قیمت ادا کردے کیونکہ اکثر محتاج عدم واقفیت کی بنا پر ارزاں فروخت کردیتے ہیں، نیز سقے اور دائیہ کو اس کھال کا دینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب:

بصورت مرقوم کھال خواہ اپنے تصرف میں لائے جیسے مصلی وغیرہ بنالے یا فقراء کو دے اگرچہ فروخت کرکے اس کی قیمت ہی ادا کردے۔ دونوں طرح جائز ہے۔ سقے اور دائیہ کو کھال دینا جائز نہیں۔ ھکذا حکم الشرع، مگر کھال کا بیچنا مکروہ ہے۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

يتصدّق بجلدها أويعمل منه غربال وجراب وقربة وسفرة و دلو او يبدله ممّا ينتفع به باقيا كمامرّ، لا بمستهلک کخلّ ولحم و نحوه کدراهم، فانّ بيع اللحم والجلدبه ای بمستهلک اوبدراهم تصدّق بثمنه و مفاده صحّة البيع مع الكراهة و عن الثّانی باطل لانّه كالوقف مجتبی ولايعطی اجر الجزّار منها لانّه كبيع واستفيدت من قوله عليه الصّلاة والسّلام: مَنْ بَاعَ جَلْدَ أُضْحِيَةٍ فَلاَ أُضْحِيَةَ لَهُ۔ (هدایه ۴/۴۴۳، درمختار ۵/۲۳۱)

''(قربانی کی) کھال صدقہ کردے یا اس سے چھلنی، چرمی تھیلا، مشکیزہ، دستر خوان اور ڈول بنالے یا ایسی چیز سے تبدیل کرلے جس چیز سے فائدہ اٹھایا جائے اور وہ چیز اپنی حالت میں باقی رہے، یعنی ختم نہ ہو۔ جیسا کہ گزر چکا، نہ کہ تلف ہونے والی چیز کے ساتھ ہو جیسا سرکہ، گوشت وغیرہ جو کہ دراھم کی مانند ہیں اور اگر گوشت یا چمڑے کی بیع کسی تلف ہونے والی چیز یا دراہم کے ساتھ کی ہو تو اس کی قیمت کو صدقہ کردے تو وہ بیع درست ہے مگر مکروہ۔ اور دوسرے قول کے مطابق یہ بیع باطل ہے اس لئے کہ وقف کی مانند ہے جو کہ پسندیدہ قول ہے۔ اور قصاب کی اجرت اس (کھال و گوشت) سے نہ دے اس لئے کہ یہ بیع کے مفہوم میں ہے جو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے مستفاد ہے کہ: جس نے قربانی کی کھال فروخت کردی، اس کی کوئی قربانی نہیں۔ (ہدایہ، درمختار)

حررہ داجا خاک رہ محمد سعید نقشبندی | محمد سعید نقشبندی مجدد ۱۳۰۵

اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام:

- الجواب صحیح۔ محمد مسعود نقشبندی، امام مسجد فتح پوری۔
- جواب صحیح ہے، محمد اسماعیل عفی عنہ، مدرس اول فتح پوری
- الجواب صحیح، ابوسعید محمد یحییٰ، مدرس دوم فتح پوری۔
- جواب صحیح، ابومحمد عبدالحق۔
- جواب درست ہے مگر سقے وغیرہ کو اجرت میں دینا ممنوع ہے۔ ہاں مسکین سمجھ کر دینا درست ہے۔
- قادر علی عفی عنہ مدرس حسین بخش مرحوم خلف مولوی محمد عبدالرب صاحب مرحوم مغفور مبرور۔

⇦ | محمد ادریس | واعظ مدرسہ حسین بخش مرحوم پنجابی

⇦ | فقیر محمد حسین ۱۲۸۵ھ | مدرس مدرسہ مولوی عبدالرب مرحوم

⇦ | محمد حسن عفی عنہ ۱۳۰۰ھ |

⇦ یہ جواب صحیح ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کھال یا کھال کی قیمت مسکین کو دے دی جائے۔

محمد امیر الدین پٹیالوی ثم الدہلوی واعظ جامع مسجد دہلی مقیم محلہ فرید پارچہ متصل فتح پوری

| محمد امیر الدین ۱۳۰۱ھ |

⇦ یاد رہے کہ جب قربانی کرنے والے نے قربانی کی کھال کو کسی مستھلک چیز سے بدلا یا اس کو روپیہ پیسہ سے فروخت کیا تو ایسی صورت میں اس کی قیمت فقراء پر صدقہ کرنا واجب ہوگی جو کہ فقراء پر ہی تقسیم کرے۔

لأنّ هذا الثمن حصل لفعل مكروه فيكون خبيثا فيجب التصدّق-(عيني شرح هداية) لأنّ معنى التموّل سقط عن الاضحية فاذا تموّلها بالبيع انتقلت القربة الى بدله فوجب التصدّق-(كافى) (عینی ۱۱/۳۶)

''اس لئے کہ یہ قیمت فعل مکروہ سے حاصل شدہ ہے تو وہ ناپاک ہوگی۔ سو اس کا صدقہ ضروری ہوگا۔ (عینی)

اس لئے کہ قربانی سے ملکیت کا مفہوم ساقط ہوگیا تو جب اس نے بیع سے ملکیت حاصل کرلی تو قربت قربانی اس کی بدل کی طرف منتقل ہوجائے گی سو (کھال کا) صدقہ کرنا لازمی ہوا۔

اور عقیقہ کی کھال کا حکم بھی قربانی کی کھال کی مانند ہے۔ هكذا في كتب الفقه-فقط والله اعلم حررہ الفقیر / محمد یعقوب عفا اللہ عنہ الذنوب حنفی دہلوی خلف مولوی کریم اللہ صاحب مرحوم دہلوی۔ | عبد محمد یعقوب وارد امید شفا ۱۲۸۷ھ |

احکام ومسائل صدقۃ الفطر

سوال:

صدقۃ الفطر کے احکام تفصیلاً بیان فرمادیں؟

جواب:

صدقۂ فطر کا حکم:

صدقۃ الفطر ازروئے آیت کریمہ اور احادیث صحیحہ فرض عین ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى۔ ''فلاح پائی جس نے صدقہ فطر ادا کیا۔'' کیونکہ یہاں تزکیہ سے مراد ازروئے حدیث مرفوع صدقہ فطر ادا کرنا ہے اور یہ آیت صدقہ فطر کے بارہ میں نازل ہوئی ہے۔

فَاِنَّ اللّٰه تَعَالٰى قَالَ: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ ولابن خزيمة من طريق كَثِيْرِ بنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ هٰذِهِ الاٰ يَة، فَقَالَ: نَزَلَتْ فِي زَكَاةِ الْفِطْرِ۔ (نیل الاوطار للشوکانی ۴/۱۹۵)

فرمان الٰہی ہے: ''بے شک اس نے فلاح پالی جو پاک ہوگیا اور جس نے اپنے رب کا نام یاد رکھا اور نماز پڑھتا رہا''۔ ابن خزیمہ میں کثیر بن عبداللہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: صدقۃ الفطر کے متعلق نازل ہوئی ہے۔''

حضرت ابوسعید خدری اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت ہے، نیز ابوالعالیہ اور ابن سیرینؒ کے ساتھ ساتھ اور بھی اکثر وبیشتر کا یہی قول ہے، امام بغوی

نے تفسیر معالم میں اس آیت کے تحت فرمایا ہے:

وقال اخرون هو صدقة الفطر، روى عن ابى سعيد الخدرىؓ فِى قوله تعالىٰ: قَدْاَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى، قال اعطى صدقة الفطر، وقال نافع: كان ابن عمر اذا صلّى الغداة يعنى من يوم العيد قال يا نافع اخرجت الصّدقة فان قلت نعم مضى الى المصلّى و ان قلت لاقال فالان فاخرج فانّما نزلت هذه الآية فى هذا، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى، الاية..... وهو قول ابى العالية وابن سيرين، انتهى ملخصا۔ (معالم ۴/ ۴۷۷۔۴۷۶)

''دوسروں نے کہا کہ وہ صدقۃ الفطر ہے حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے فرمان الٰہی قَدْاَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى، سے متعلق روایت ہے فرماتے ہیں کہ: جس نے صدقۃ الفطر ادا کیا اور نافع'' کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جب عید کے دن صبح کی نماز پڑھتے تو کہتے اے نافع! کیا آپ نے صدقۃ الفطر ادا کیا ہے؟ اگر میں کہتا کہ ہاں! تو عیدگاہ کو چلے جاتے اور اگر میں کہتا کہ نہیں تو کہتے، اب ادا کردو، بے شک یہ آیت قَدْاَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى، اس بارے میں نازل ہوئی ہے اور یہی قول ابو العالیہ اور امام ابن سیرین کا ہے۔

اور صحیحین میں اعرابی کے واقعہ میں حافظ ابن حجر العسقلانی'' فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ فلاح اس کے لئے ثابت ہوئی ہے، جو صرف فرائض ادا کرے اور صدقۃ الفطر ادا کرنے والے کو بھی ''افلح'' یعنی (فلاح پائی) فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ صدقۃ الفطر بھی فرض ہے۔ کما لا يخفى على الفطين۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ: "قَدْاَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى" و ثبت انّها نزلت فى زكاة الفطر و ثبت فى الصّحيحين اثبات حقيقة الفلاح لمن

اقتصر علی الواجبات-انتھی (فتح الباری ۳/ ۳۶۸)

''فرمان الٰہی ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى'' زکاۃ الفطر کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور صحیحین میں، فلاح اس کے لئے ثابت ہوئی ہے جو صرف فرائض ادا کرے۔''

ان احادیث صحیحہ موعودہ میں سے ایک یہ ہے:

عَنْ ابن عمرؓ قَالَ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ اَوْصَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى وَالصَّغِيْرِ وَالْكَبِيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَمَرَبِهَا اَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ اِلَى الصَّلَاةِ-رواہ البخاری ومسلم، بخاری زکوۃ حدیث ۱۵۸۰ ۔مسلم ۲/ ۶۷۷، مصابیح السنۃ ۲/ ۲۵)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاع کھجور سے یا ایک صاع جو سے 'یا اس سے جو ان کے سوا اور کھانے کی چیزیں ہیں جن کا بیان ان شاء اللہ آئندہ آئے گا'' ہر مسلمان میں سے غلام اور آزاد، مرد و عورت، بچے اور جوان پر فرض کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ لوگوں کے ''نمازِ عید'' کی طرف نکلنے سے قبل ادا کیا جائے۔'' بخاری ومسلم)

اس حدیث سے صراحۃً فطر کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ حدیث میں لفظ ''فرض'' موجود ہے اور فرض کے دوسرے معنی مراد لینا بغیر کسی قرینہ صارفہ کے صحیح نہیں، کیونکہ فرض کا یہ معنی حقیقت شرعیہ ہے، کما تقرر فی الاصول۔ اس باب میں اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ طوالت کے خدشہ سے ایک پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے صدقۃ الفطر کے فرض ہونے پر ایک باب قائم کیا ہے، مگر اس کی

قضا نہیں ہے اور جو فرضِ عین ہے، اس کی قضا لازم ہو، قاعدہ حکمیہ نہیں ہے، بلکہ محض دلیل ہے۔ کما تقرر فی الاصول۔

صدقۂ فطر کس پر فرض ہے:

صدقۂ فطر ہر مسلمان، مرد وعورت، بچہ و جوان، غلام و آزاد اور امیر و غریب پر فرض ہے جو اس کی استطاعت رکھتا ہو جیسا کہ حدیث مذکورۃ الصدر سے عیاں ہے کہ صاحب نصاب ہونے کی شرط نہیں بلکہ مطلق ہے، جیسے دارقطنی اور احمد کی روایت میں تصریح بھی ہے کہ فقیر پر بھی فرض ہے۔ اس کا استدلال آپ ﷺ کے فرماں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے کیا ہے: کہ

فطرة الصّائم علی انها تجب علی الفقیر کما تجب علی الغنیّ و قد ورد ذلک صریحا فی حدیث ابی هریرةؓ عند احمد وفی حدیث ثعلبة ابن ابی صغیر عند الدّارقطنی۔
(فتح الباری، ۳/۳۶۹، دارقطنی ۲/۱۴۸)

"روزے دار کا صدقۂ فطر جیسا مالدار پر فرض ہے ویسا ہی تنگدست پر بھی ہے اور یہ مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور دارقطنی میں ثعلبہ بن ابی صغیر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں صریحاً منقول ہے۔"

مگر استطاعت ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا...... (الایة البقرہ ۲۸۶)

لڑکی کا اگر مال ہو تو اس کا ولی اس میں سے صدقۂ فطر نکالے اور اگر مال نہ ہو تو اس کی طرف سے اس کا باپ یا جس پر اس کا نفقہ واجب ہو ادا کرے۔ یہی قول جمہور کا ہے، جیسا کہ نیل الاوطار میں ہے:

وجوب فطرة الصّغیر فی ماله والمخاطب باخراجها ولیّه ان کان للصّغیر مال والا وجبت علی من تلزمه

نفقته و الی هذا ذهب الجمهور۔ (نیل الاوطار ۵/۱۹۲)

''بچے کا اس کے مال میں سے صدقۂ فطر کا واجب ہونا اور اس کا ولی اس کے ادا کرنے کا ذمہ دار ہے اگر مال بچے کا ہو، وگرنہ جس پر اس کا نفقہ لازم ہے صدقۂ فطر بھی اس پر واجب ہوگا، یہی جمہور کا قول ہے۔''

چنانچہ حافظ ابن حجرؒ رقمطراز ہیں:

قوله الصّغیر والکبیر: ظاهره وجوبها علی الصّغیر لکنّ المخاطب عنه ولیّه فوجوبها علی هذا فی مال الصّغیر والا فعلی من تلزمه نفقته و هذا قول الجمهور۔ (فتح الباری ۳/۳۶۸)

''ظاہر میں بچے پر اس کا وجوب ہے لیکن مخاطب اس کا ولی ہے تو ایسی صورت میں وہ بچے کے مال میں واجب ہوگا ورنہ وہ اس کے ذمہ ہوگا، جس پر اس کا نفقہ لازم ہے، یہی جمہور کا قول ہے۔''

غلام کا صدقۂ فطر:

غلام کا صدقۂ فطر اس کا مولی ادا کرے گا، کیونکہ مسلم میں ہے کہ مولی کے ذمہ غلام کے صدقۂ فطر کے سوا کوئی صدقہ نہیں ہے، معلوم ہوا کہ غلام کا صدقۃ الفطر مولی ادا کرے گا۔

قوله "عَلَی الْعَبْدِ" آلخ: ظاهره اخراج العبد عن نفسه و لم یقل به الا داؤد و خالفه اصحابه والنّاس احتجّوا بحدیث ابی هریرةؓ مرفوعا لیس فی العبد صدقة الا صدقة الفطر -اخرجه مسلم- و مقتضاه انّها علی السّیدِ۔

(انتهی ما فی فتح الباری ۳/۳۶۸ ملخصا بقدر الحاجة)

''اس سے ظاہر ہے غلام اپنا صدقۂ فطر خود ادا کرے اور یہ قول

صرف داؤد (ظاہری) کا ہے۔ ان کے اصحاب اور دوسرے علماء نے ان کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث سے استدلال کیا ہے کہ: غلام کے ذمہ صدقۂ فطر کے علاوہ کوئی صدقہ نہیں ہے۔ (مسلم ۲/۶۷۶) اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ وہ اس کے آقا کے ذمہ ہے''۔ (فتح الباری)

احناف کے ہاں صدقۂ فطر صاحب نصاف پر واجب ہے یعنی اس پر جس کے پاس زکاۃ کا نصاب ہو اور لڑکے کا صدقہ صرف باپ ادا کرے اور بقیہ امور درج بالا کے موافق ہوں گے۔ ہدایہ میں ہے:

صدقة الفطر واجبة على الحر المسلم اذا كان مالكا لمقدار النّصاب فاضلا عن مسكنه و ثيابه و اثاثه و فرسه و سلاحه و عبيده يخرج ذلك عن نفسه ويخرج عن اولا ده الصّغار و مماليكه-انتهى ملخصا- (اولين:۲۰۸)

''صدقۂ فطر آزاد مسلمان پر واجب ہے جبکہ وہ ایسی مقدار نصاب کا مالک ہو جو اپنے چھوٹے بچوں اور اپنے غلاموں کی طرف سے ادا کرے گا جو کہ اس کی رہائش گاہ، لباس، سامان، گھوڑے، اسلحہ اور غلاموں سے زائد ہو۔ (مختصراً)

صدقۂ فطر کی ادائیگی کا وقت:

صدقۂ فطر کی ادائیگی کا وقت نمازِ عید الفطر سے قبل ہے اور اگر کوئی عید سے دو یا تین یا زیادہ روز قبل ادا کردے تو جائز ہوگا اور اگر نمازِ عید کے بعد ادا کرے گا تو ادا نہ ہوگا۔ کیونکہ آیتِ مذکورہ ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى'' کے بعد ''وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى'' وارد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقۂ فطر نماز پر مقدم ہے، کیونکہ ''فَصَلّٰى'' فائے تعقیب کے ساتھ مذکور ہے جو کہ صدقہ کے بعد نماز کی ادائیگی کا فائدہ دیتی ہے۔ كما لا يخفى من له ادنى تأمل۔

اور حدیث میں ہے:

وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللّٰہ عنھما قَالَ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ زَکَاۃَ الْفِطْرِ طَاھِرَۃً[1] لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَ طُعْمَۃً لِّلْمَسَاکِیْنَ فَمَنْ أَدَّاھَا قَبْلَ الصَّلاۃِ فَھِیَ زَکَاۃٌ مَقْبُوْلَۃٌ وَ مَنْ اَدَّاھَا بَعْدَ الصَّلاۃِ فَھِیَ صَدَقَۃٌ مِنَ الصَّدَقَاتِ۔[2]

(کذا فی منتقی الاخبار ۲/۱۵۶) وَلِلْبُخَارِیِّ وَکَانُوْا یُعْطُوْنَ قَبْلَ الْفِطْرِ بِیَوْمٍ أَوْ یَوْمَیْنِ ۔انتھی ۔(فتح الباری ۳/۳۷۵، ابوداؤد ا/۲۲۷)

وفی موضع آخر، والظّاھر انّ من اخرج الفطرۃ بعد صلوۃ العید کان کمن لم یخرجھا باعتبار اشتراکھما فی ترک ھذہ الصّدقۃ الواجبۃ۔(انتھی فی نیل الاوطار ۵/۱۹۴)

’’حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر فرض فرمایا تا کہ روزے دار فضول اور نازیبا قسم کی باتوں سے پاک ہوجائے اور مسکینوں کو کھانا میسر آجائے، جس نے اسے (عید کی) نماز سے قبل ادا کیا تو وہ قبول ہونے والا صدقہ ہے اور جس نے اسے نماز کے بعد ادا کیا تو وہ صدقات میں سے ایک صدقہ ہے (ابوداؤد، ابن ماجہ) اور بخاری میں ہے کہ وہ عیدالفطر سے ایک یا دو روز قبل ادا کر دیتے تھے۔‘‘

---

[1] اصل لفظ طُھْرَۃً ہے...... [جاوید]

[2] رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ، نیل الاوطار ۵/۱۹۵، حدیث حسن ہے، ابوداؤد ا/۲۲۷، ابن ماجہ حدیث ۱۸۲۷، ارواء الغلیل حدیث ۸۴۳

اور ایک دوسرے مقام پر ہے: پتہ چلتا ہے کہ جس نے صدقۂ فطر نماز عید کے بعد ادا کیا گویا کہ اس نے وہ ادا ہی نہیں کیا، کیونکہ اس واجب صدقہ کے ترک کرنے میں دونوں ہی مشترک ہیں۔ نیل الاوطار)

صدقۂ فطر میں کونسی چیزیں ادا کی جائیں:

جو چیز طعام یعنی قابل قوت ہے اس میں سے صدقۂ فطر ادا کرنا درست ہے، جیسا کہ گیہوں، جو، پنیر، خرما اور ستو وغیرہ، جس طرح کہ حضرت عیاض بن عبداللہ بن ابوسرح العامری سے مروی ہے:

انّه سمع اباسعيد الخدری رضی اللّٰه عنه يقول كنّا نخرج زكاة الفطر صاعا من طعام او صاعا من شعير اوصاعا من تمر او صاعا من اقط او صاعا من زبيب- (رواه البخاری، فتح الباری ۳/۳۷۱)

"کہ انہوں نے حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے سنا وہ کہتے ہیں: ہم (نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم کے زمانہ میں) کھانے یا جو یا کھجور یا پنیر یا کشمش کا ایک صاع (فی کس) بطور صدقۂ فطر دیا کرتے تھے۔" (بخاری)

صدقۂ فطر کی مقدار:

صدقۂ فطر کی مقدار گیہوں سے نصف صاع اور بقیہ چیزوں سے ایک صاع ہے جیسا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں: کہ

خطب ابن عبّاس رضی اللّٰه عنه فی آخر رمضان علی منبر البصرة فقال: اَخرِجُوا صَدَقَةَ صَومِكُم فَكَانَ النَّاسُ لَم يَعلَمُوا، فَقَالَ مَن هٰهُنَا مِن اَهلِ الْمَدِينَةِ قُومُوا اِلٰى اِخوَانِكُم، فَعَلِّمُوهُم فَاِنَّهُم لا يَعلَمُونَ، فَرَضَ رَسُولُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الصَّدَقَةَ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ اَوْ شَعِيْرٍ اَوْ نِصْفِ صَاعٍ مِنْ قَمْحٍ-الحدیث رواہ ابوداؤد/۲۲۹)

''ابن عباس رضی اللہ عنہ نے رمضان کے آخر میں بصرہ کے منبر پر خطبہ دیا اور فرمایا: اپنے روزوں کا صدقہ نکالو اور لوگوں کو اس بات کا علم نہ تھا، سو آپ نے فرمایا: یہاں اہل مدینہ سے کون ہیں؟ اپنے بھائیوں کی طرف اٹھو اور انہیں تعلیم دو وہ بے علم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صدقہ ایک صاع کھجور سے یا جو سے یا نصف صاع[1] گیہوں سے مقرر فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

وقد نمقہ المھین محمد یٰسین الرحیم آبادی ثم العظیم آبادی عفی عنہ سیأتہ

اسم مبارک مؤیدین علماء کرام:

⇦ لقد اصاب من اجاب۔ ابو القاسم محمد عبدالرحمٰن الدھوری۔

⇦ اصاب من اجاب۔ محمد حسین خان خورجوی

⇦ یہ جواب صحیح ہے۔ حررہ ابو العلی محمد بن عبدالرحمٰن الاعظم گڑھی المبارکفوری

⇦ جواب باصواب ہے۔ حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ

⇦ المجیب مصیب۔ محمد فقیر اللہ

⇦ الجواب صحیح۔ والرأی نجیح | محمد شمس الدین ۱۳۱۵ھ |

⇦ | عبدالجلیل عربی |

⇦ | ابو محمد عبدالحق ۱۳۰۵ھ |

⇦ قد صح الجواب۔ ابو محمد عبدالرؤف البہاری المانفوری عفی عنہ

⇦ | خادم شریعت رسول الاداب۔ ابو محمد عبدالوھاب ۱۳۰۰ھ |

---

[1] دیکھیے اسی کتاب کا ص   کا حاشیہ!

- خادم شریعت رسول الثقلین۔محمد تلطف حسین ۱۲۹۳ھ
- سید محمد عبدالسلام غفرلہ ۱۲۹۵ھ
- الجواب صحیح۔عبداللطیف عفی عنہ عبداللطیف
- محمد طاہر ۱۳۰۱ھ
- وہ غریب مسلمان کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو، بہت ہی بھوکا ہو اس کے ذمہ کسی صورت صدقۂ فطر (لازم) نہیں ہے، اگر اس کو دو وقت کا کھانا میسر ہو تو اسے دینا چاہئے اور یہ صدقہ اپنے اقارب اور غیر کو دے سکتا ہے اور صدقۂ فطر جو بھی دے سکتا ہو اس پر فرض ہے۔حررہ محمد امیر الدین حنفی واعظ جامع مسجد دہلی ۱۳۰۱ھ محمد امیر الدین ۱۳۰۱ھ

(واللہ المعین)

احکام صاع
(یعنی پیمانہ)

سوال:

علماء دین ومفتیانِ شرع متین فرمائیں کہ حدیث شریف میں جو صاع کا لفظ وارد ہوا ہے جس سے بہت سے احکام متعلق ہیں اس کا وزن ہندوستانی وزن میں کیا ہوتا ہے؟ بینوا توجروا۔

جواب:

حدیث میں جو ''صاع'' وارد ہوا ہے وہ صاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جسے ''صاع حجازی'' کہتے ہیں۔ اس صاع حجازی سے صدقۂ فطر ادا کرنا چاہئے نہ کہ صاع عراقی سے۔ کیونکہ صاع عراقی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صاع نہیں ہے، چنانچہ اس کی تصریح کتب حدیث میں موجود ہے۔ اور اجراء احکام اسی صاع سے ہونا چاہئے جو صاع نبویؐ ہے اور اس کا وزن سیروں کے حساب سے مندرجہ ذیل ہے جو کہ ''مسک الختام شرح بلوغ المرام'' میں ہے:

> پس صدقہ فطر بسیر پختہ لکھنو کہ نود وشش روپیہ است و روپیہ یازدہ ماشہ نصف صاع از گندم ایک آثار وشش چھٹانک وسہ ماشہ باشد واز جو دو چندان یعنی دو آثار[1] ونیم پاؤ وشش ماشہ کہ وزن صاع ست ونصف صاع بسیر انگریزی کہ ہشتاد روپیہ چہرہ دار است وہر

---

[1] دوگنا وزن دو سیر، بارہ چھٹانک اور چھ ماشہ بنتا ہے جبکہ مؤلف نے ''دو آثار ونیم پاؤ'' تحریر کیا ہے، ممکن ہے وہ ''دونیم پاؤ کم'' یعنی بارہ چھٹانک کہنا چاہتے ہوں وگرنہ عبارت کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم..........(خلیق)

روپیہ یازدہ ماشہ وچہار رتی ست یک سیر نیم پاؤ ونیم چھٹانک و یکتولہ سہ وسہ ماشہ می باشد۔ انتہی

"روپیہ گیارہ ماشہ کا ہوتا ہے، نصف صاع گندم سے ایک سیر، چھ چھٹانک اور تین ماشہ ہے اور جو سے دوگنا یعنی دو سیر آدھ پاؤ اور چھ ماشہ ہے جو کہ صاع کا وزن ہے اور نصف صاع انگریزی سیر کے حساب سے ۸۰ روپیہ بنتا ہے اور ایک روپیہ گیارہ ماشہ اور چار رتی ہے اور ایک سیر آدھ پاؤ نصف چھٹانک ایک تولہ اور تین ماشہ ہے"

اور یہ بھی جان لینا چاہئے کہ اصل صدقہ فطر میں کیل یعنی پیمانہ تاپنے کا ہے اور مقدار وزن کی جو ضرورت پڑتی ہے تو وہ صرف احتیاط اور حفاظت احکام کے لئے بطور استعانت کے ہے، "کما لا یخفی علی الماہر" اور مقدار وزن میں لامحالہ بقدر قلیل اختلاف معلوم ہوتا ہے اور حقیقت میں صاع کا ارطال وغیرہ کے ساتھ ضبط مشکل ہے، کیونکہ صاع جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں تھا جس سے صدقہ فطر ادا کیا جاتا تھا وہ مشہور و معروف تھا اب اس کا اندازہ ومقدار وزناً ہوتا ہے۔ مختلف اجناس مثل چنے ومکئی وغیرہ کا صدقہ تو ایسے پیمانہ ہی سے دینا ضروری ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیمانہ وصاع کے موافق رہے اور جسے یہ میسر نہ ہو تو اس طرح یقین کامل سے ادا کرلے کہ اس سے کم نہ ہو مسک الختام میں ہے:

کہ احتیاطاً صدقہ فطر گندم میں دو سیر انگریزی سے دینا چاہئے اور جو سے صاع دوگنا ہو یعنی دو سیر اور ڈیڑھ چھٹانک اور احتیاطاً جو چار سیر دینا چاہئے۔ انتہی۔ اور صاع کو پانچ رطل اور ثلث رطل (۵ رطل اور ۱/۳ رطل) کے ساتھ مقرر کرنا اقرب الی الصواب ہے۔[1] صاحب الروضۃ کہتے ہیں:

---

[1] یاد رہے صاع ایک پیمانہ ہے جو دو طرح کا ہوتا تھا، ایک حجازی اور دوسرا عراقی، حجازی صاع جس میں ۵ رطل اور ۱/۳ مزید ہوتے ہیں اور یہ وزن ۴ مد (اڑھائی کلوگرام) کے مساوی ہوتا ہے اور ایک مد ۶۲۵ گرام کا۔ ویسے اس کا ضبط ممکن نہیں ہے (کیونکہ یہ ایک پیمانہ ہے ناپنے کا نہ کہ وزن کا) اور عراقی

وقد يشكل ضبط الصّاع بالارطال فانّ الصّاع المخرج
به فى زمن النبىّ صلّى الله عليه وسلّم مكيال معروف
ويختلف قدره وزنا باختلاف جنس مايخرج كالذّرة

صاع ۸ رطل کا ہوتا تھا۔ احناف عراقی صاع کے جبکہ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور دوسرے ائمہ کرام حجازی صاع کے قائل ہیں۔ جن کا استدلال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو صاع استعمال ہوتا تھا۔ اس کا وزن ساڑھے پانچ (۱/۳ ۵) رطل تھا اور پھر اسی صاع پر بعد میں صحابہ کے زمانہ میں بھی عمل رہا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج۳ ص۲۸۰)

احادیث سے یہ امر بالکل واضح ہوتا ہے کہ فطرانہ ایک صاع ہی مسنون ہے۔ خواہ کوئی بھی جنس ہو جب کوئی چیز ہلکے وزن کی ہو تو صاع تھوڑی مقدار سے اور اگر بھاری و ثقیل ہو تو اس میں سے زیادہ وزن سے پورا ہوتا ہے۔ جو خوراک گندم، جو، چاول، کشمش اور پنیر میں سے زیادہ استعمال ہوتی ہو تو صدقۃ الفطر اسی میں سے ادا کیا جائے گا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چھوٹے بڑے آزاد و غلام کی طرف سے ایک صاع طعام یا ایک صاع پنیر یا ایک صاع جو یا ایک صاع کھجور یا ایک صاع کشمش نکالتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں نصف صاع گندم کو پورے صاع جو کے برابر کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو کہنا پڑا:

اما انا فلا ازال اخرجه كما كنت اخرجه فى زمن رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ ولابى داود: لا اخرج ابدا الا صاعا۔

کہ میں تو اتنا ہی فطرانہ ہر جنس سے ادا کروں گا جتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ادا کیا کرتا تھا۔ ابو داوٗد میں ہے کہ: میں تو ہمیشہ ایک صاع ہی نکالوں گا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی نسبت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا ظاہر حدیث پر عمل کرنا یقیناً راجح ہے، جنہوں نے صاع کا اعتبار کیا ہے جنس کی گرانی اور ارزانی کا نہیں، جبکہ دوسرے حضرات نے صاع کا نہیں بلکہ اشیاء کی قیمت کا اعتبار کیا ہے یہی رائے شیخ صفی الرحمٰن حفظہ اللہ نے شرح بلوغ المرام ج۱ ص۴۱۲ میں قائم کی ہے اور مؤلفؒ کا احتیاطاً جو دو گنا یعنی چار سیر والا قول محلِ نظر ہے۔ واللہ اعلم.......... (خلیق)

والحمص و غیرهما، وَالصّواب ماقاله الدّارمی انّ الاعتماد علی الکیل بصاع مغایر بالصّاع الّذی کان یخرج به فی عصر النّبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم و من لم یجده لزمه اخراج قدر تیقّن انّه لا ینقص عنه و علی هذا فالتّقدیر بخمسة ارطال و ثلث تقریبا۔(عون الباری لحل ادلۃ البخاری)
(الروضۃ الندیۃ ۱/۲۱۷،عون الباری ۵۷۰ طبع بھوپال)

''کبھی صاع کا رطل کے ساتھ توازن مشکل ہو جاتا ہے پس جس صاع سے صدقہ فطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کیا جاتا تھا وہ ایک معروف پیمانہ ہے اور اس کے وزن کی مقدار میں جنس کی تبدیلی سے اختلاف ہو جاتا ہے جیسا کہ مکئی اور چنا وغیرہ۔ بہتر رائے امام دارمیؒ کا قول ہے کہ صاع کے معاملہ میں ماپنے کے لئے اعتماد اس متبادل صاع پر کیا جائے گا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں متداول تھا، البتہ عدمِ دستیابی کی صورت میں اندازاً پانچ رطل اور ایک تہائی (۵ ۱/۳) ہوگا۔

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ صاع چار لپ یعنی متوسط آدمی کے چار ُبک ہیں جو مجرب ہے۔ سو یہی صحیح اور صاع رسول کے موافق ہوا۔ (کذا فی القاموس و حکاہ النووی ایضاً فی الروضۃ) اور اہل پنجاب اس امر میں بہت اچھے ثابت ہوئے ہیں کیونکہ ان کے ہاں پیمانہ ''مد'' کی مانند پڑوپی ہے اور ''صاع'' کی مانند ٹوپہ ہے اور وہ اسی پر ہی اجراء احکام کرتے ہیں۔ فقط واللّٰه اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب۔

حررہ العاجز ابو محمد عبدالوھاب الفنجابی الجھنگوی ثم الملتانی نزیل الدھلی- تجاوز اللّٰه عن ذنبه الخفی و الجلی، فی اواخر شھر اللّٰه الذی انزل فیه القرآن۔ ۱۳۰۵ھ

اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام:

⇦ محمد امیر الدین ۱۳۰۱ھ

⇦ خادم شریعت رسول الاداب محمد عبد الوہاب ۱۳۰۰ھ

⇦ خادم شریعت رسول الثقلین محمد تلطف حسین ۱۲۹۲ھ

⇦ سید محمد عبد السلام غفرلہ ۱۲۹۹ھ

⇦ محمد امیر الدین۔ واعظ مذہب حنفیہ جامع مسجد دہلی

⇦ الجواب صحیح۔ محمد طاہر سلہٹی

⇦ جواب صحیح لکھا ہے۔ راقم محمد یٰسین الرحیم آبادی ثم العظیم آبادی

⇦ جواب ھذا صحیح ہے۔ حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ

⇦ جواب صحیح ہے۔ محمد فقیر اللہ .... قد صح الجواب واللہ اعلم بالصواب۔

حررہ الفقیر ابو محمد عبد الرؤف البھاری المانفوری

⇦ اصاب من اجاب۔ محمد حسین خان خورجوی

⇦ الجواب صحیح۔ عبد اللطیف عفی عنہ　　عبد اللطیف

⇦ عبد الرؤف ۱۳۰۳ھ

(واللہ الموفق)

جماعت کھڑی ہونے کی صورت میں سنت فجر ادا کرنے کا طریقہ

سوال:

علماء دین ارشاد فرمائیں کہ جب فجر کی جماعت کھڑی ہو جائے اس وقت دو رکعت سنتِ فجر ادا کر لی جائیں یا جماعت میں شمولیت اختیار کر لی جائے؟ اور شاملِ جماعت ہونے کی صورت میں سنتیں طلوع آفتاب سے قبل یا بعد از طلوع ادا کی جائیں؟ بینوا توجروا۔

جواب:

بموجب فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سنت نہ پڑھے، بلکہ جماعت میں شامل ہو جائے جو کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

پہلی حدیث:

إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ[1]

"جس وقت نماز کی جماعت کھڑی ہو جائے تو اس وقت سوائے فرض نماز کے اور کوئی نماز نہیں ہے۔"

دوسری حدیث:

ثم زاد مسلم بن خالد عن عمرو بن دینار في قوله صلى الله عليه وسلم: إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ،

---

[1] (فتح الباری ۲/ ۱۴۸، مسلم ۱/ ۴۹۳، حدیث نمبر ۶۳/ ۷۱۰، دارمی ۱/ ۲۷۷، مصابیح ۱/ ۳۹۳)

قِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! لَا رَكْعَتَي الْفَجْرِ؟ قَالَ لَا رَكْعَتَي الْفَجْرِ (أخرجه ابن عدى) (مسلم ۱/۴۶_۲۴۴، بیہقی ۲/۴۸۳)

''پھر مسلم بن خالد حضرت عمرو بن دینارؒ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مروی ہے: جب جماعت کھڑی ہو جائے تو اس وقت سوائے فرض نماز کے اور کوئی نماز نہیں ہوتی۔ عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! کیا اس وقت دو رکعت سنت فجر کی بھی نہ پڑھے؟ فرمایا: نہ ہی دو رکعت سنتِ فجر۔ (ابن عدی)

تیسری حدیث:

اور بخاری میں عبداللہ بن بحسینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم رَأٰى رَجُلاً وَقَدْ اُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ فَلَمَّا انْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم اَلصُّبْحَ اَرْبَعًا اَلصُّبْحَ اَرْبَعًا؟ (فتح الباری ۲/۱۴۸)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو جماعت کے کھڑے ہوئے دو رکعت سنت ادا کر رہا ہے تو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے (تو فرمایا) کیا تو صبح کی نماز چار رکعت پڑھتا ہے؟ کیا تم صبح کی نماز چار رکعت پڑھتے ہو؟''

آثارِ صحابہ:

عن ابن عمر رضى الله عنه ابصر رجلا يصلّى الرّكعتين والمؤذن يقيم فحصبه، وقدروى عن عمرؓ انّه كان اذا رجلا يصلّى وهو يسمع الاقامة ضربه، عن طريق عطيّة قدرأيت ابن عمرؓ قضا هما حين سلّم الامام- (بیہقی ۲/۴۸۳)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ دو رکعت ادا کر رہا ہے اور مؤذن اقامت کہہ رہا ہے تو حضرت عبداللہ نے اس کو کنکر مارا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وہ کسی شخص کو دیکھتے کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے درآنحالیکہ وہ اقامت سن رہا ہے تو اس کو مارتے۔ عطیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ فجر کی سنتوں کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کیا۔''

چوتھی حدیث:

اور مزید حضرت قیس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأُقِيْمَتِ الصَّلاةُ فَصَلَّيْتُ مَعَهُ الصُّبْحَ ثُمَّ انْصَرَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَنِيْ أُصَلِّيْ فَقَالَ مَهْلاً يَا قَيْسُ! أَصَلاتَانِ مَعًا قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ لَمْ اَكُنْ رَكَعْتُ رَكْعَتَي الْفَجْرِ قَالَ فَلاَ اِذاً۔ (مسند حمیدی ۲/۳۸۳، مغنی ابن قدامہ ۲/۱۱۹)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف فرما ہوئے اور فجر کی جماعت کھڑی ہوئی تو میں نے آپ کے ساتھ فجر کی نماز فرض پڑھی، سلام پھیرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا! ٹھہر جاؤ اے قیسؓ! کیا تم دو نمازیں ایک ساتھ پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں نے دو رکعت سنت فجر نہیں پڑھی تھی، تو آپ نے فرمایا، اگر ایسا ہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

روایات مذکورہ بالا سے فرض جماعت کے کھڑے ہونے کے وقت جماعت

میں شامل ہونا اور جماعت کے بعد سنتوں کا قبل از طلوعِ آفتاب پڑھنا بھی ثابت ہوتا ہے اگر کوئی طلوعِ آفتاب کے بعد سنتیں پڑھے تو وہ بھی درست ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ محمد عبیداللہ وعبدالحق | محمد عبیداللہ ۱۲۹۱ | فقیر عبدالحق ۱۲۹۱ |

اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام:

⇦ اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلٰوۃُ فَلَا صَلَاۃَ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ ۔نص ست و بمقابلہ نص تعلیلات قیاسیہ باطل است۔ | میر احمد | پشاوری

⇦ واقعی ارشاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم فَلَا صَلَاۃَ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ۔ سنتوں کے پڑھنے کے جواب سے مانع ہے مگر فرضوں کے بعد بلاشبہ درست ہے۔ حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ۔

⇦ قَدْ ثَبَتَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَ غَيْرِهِمَا اَنَّهُ اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلٰوۃُ فَلَا صَلَاۃَ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ اِلَّا رَكْعَتَى الْفَجْرِ لَا اَصْلَ لَهُ ، قَالَهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَ نقل عنه في المحلى شرح المؤطا، و اللّٰه اعلم بالصواب۔

صحیحین اور ان کے علاوہ سے بھی ثابت ہے کہ جب جماعت کھڑی ہوجائے تو سوائے فرض نماز کے اور کوئی نماز نہیں ہوتی اور ''الا رکعتی الفجر'' (یعنی ماسوا فجر کی دو رکعتوں کے) کا اضافہ بے بنیاد ہے (بیہقی ۲۸۳/۲) اور اس سے محلی شرح المؤطا نے نقل کیا ہے۔ حررہ ابو محمد عبدالرؤف البہاری | عبدالرؤف ۱۳۰۲ |

⇦ الجواب صحیح والرائی نجیح ،نمقہ محمد یٰسین الرحیم آبادی عفی عنہ

⇦ مجیب صاحب نے بہت ہی عمدہ جواب دیا ہے حقیقت میں اقامت کے بعد سنتِ فجر ادا کرنا از روئے حدیث صحیح السند ناجائز و نادرست ہے اور کتب فقہ میں بھی اس طرح سنت پڑھنے کو ممنوع لکھا ہے جس طرح کے آج کل ہمارے زمانہ کے جہال صف کے قریب اور مسجد میں ادا کر لیتے ہیں۔ اور فتح

القدیر ص ۳۴۰[۱] مطبوع میں لکھا ہے کہ اس طرح سے جیسا کہ آج کل مروج ہے سنت فجر پڑھتے ہیں، بہت سخت مکروہ اور بڑے اجہل ہیں۔ اور ہدایہ مع الکفایہ صفحہ ۸۶ میں لکھا ہے کہ: سنتِ فجر وقت اقامت مسجد میں ممنوع و نادرست ہے، اگر پڑھے تو خارج از مسجد پڑھے۔ اور مولوی عبدالحیٔ لکھنوی حنفی نے عمدۃ الرعایۃ ص ۲۳۸ و تعلیق الممجد ص ۸۸ میں بعد اللُتیا (یعنی اس اختصار کے بعد) بڑی صراحت سے مذکور ہے کہ صحیح مرفوع احادیث کی رو سے سنتِ فجر تکبیر (اقامت) کے وقت نہ پڑھنی چاہیے۔

خادم شریعت رسول الاداب ابو محمد عبدالوہاب ۱۳۰۰ھ الفنجابی نزیل الدہلی

⇦ الجواب صحیح۔ محمد طاہر سلہٹی ۱۳۰۴ھ

⇦ اکثر جاہل لوگ جو وقتِ اقامتِ فرض، صبح کی سنتیں پڑھتے ہیں یہ درست نہیں، بلکہ جماعت میں شامل ہونا چاہیے۔ محمد امیر الدین حنفی واعظ جامع مسجد دہلی۔

⇦ خادم شریعت رسول الثقلین محمد تلطف حسین ۱۲۹۲ھ

⇦ سید محمد عبدالسلام ۱۲۹۹ھ

⇦ الجواب صحیح عبداللطیف ۱۲۹۸۰ھ

⇦ محمد امیر الدین ۱۳۰۱ھ

---

[۱] ابن ہمام نے تحریر کیا ہے کہ فان صلی من الفجر رکعة ثم أقیمت یقطع و یدخل معهم۔ (فتح القدیر ۱/۲۳۷) اور امام محمد نے اس کی وضاحت یوں کی ہے: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور فرمایا: دو نمازیں ایک وقت یعنی جماعت کے روبرو نفل پڑھنے سے آپ نے منع کیا اور امام محمد نے کہا کہ جب اقامت ہو جائے تو ماسوا دو رکعت فجر کے، اور نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے۔ ان دونوں کے پڑھنے میں کچھ عیب نہیں۔ اگر موذن اقامت کہہ دے تو یہ جماعت کے ہوتے ہوئے نہ پڑھتا رہے یا اقامت سن کر شروع کر دے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ موطا امام محمد ص ۳۷ [جاوید]

سنتِ فجر کے بعد لیٹنا

سوال:

سنتِ فجر کے بعد کروٹ پر لیٹنے کے بارے میں علماء دین و مفتیان شرع متین کیا فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا فرض ہے یا واجب یا سنت یا مستحب؟ بینوا بالدلیل توجروا لکم الثواب۔

جواب:

سنتِ فجر کے بعد داہنی کروٹ پر لیٹنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور ترک بھی ثابت ہے، سو یہ فعل مستحب ہوا۔ کیونکہ مستحب اس فعل کو کہتے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کیا ہو اور کبھی چھوڑ دیا ہو۔

عَنْ عَائِشَةَ رضی اللّٰه عنها قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ اضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ۔ رواہ البخاری [1]

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی دو رکعت (سنت) پڑھتے تو داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے۔"

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا صَلَّى فَاِنْ كُنْتُ مُسْتَيْقِظَةً حَدَّثَنِيْ وَاِلَّا اضْطَجَعَ حَتّٰى يُؤَذَّنَ لِلصَّلَاةِ۔ رواہ البخاری [2]

---

[1] (فتح الباری ۱/۶۲۶، مسلم ۱/۵۰۸، مصابیح السنہ ۱/۴۲۲) [2] فتح الباری کتاب الوتر حدیث ۱۱۶۰، مسلم ۱/۵۰۸، مصابیح السنہ ۱/۴۲۱، شرح السنہ بغوی ۴/۷)

''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے اور میں بیدار ہوتی تو مجھ سے گفتگو کرتے، وگرنہ لیٹ جاتے تا آنکہ نماز کیلئے اذان دی جاتی۔''

معلوم ہوا کہ اس فعل کو فرض یا واجب کہنا صحیح نہیں ہے اور بدعت کہنا بھی درست نہیں ہے، بلکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ترک بھی ثابت ہے تو واجب یا فرض کیونکر ہوسکتا ہے واجب وفرض کا ترک تو ناجائز ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے عدم وجوب پر ایک باب قائم کیا ہے کہ:

بَابُ ''مَنْ تَحَدَّثَ بَعْدَ الرَّكْعَتَيْنِ فَلَمْ يَضْطَجِعْ''......أَشَارَ بهذه التّرجمة الى انّه صلى اللّٰه عليه وسلم لم يكن يداوم عليها وبذلك احتجّ الائمّة على عدم الوجوب وحملوا امر الوارد بذلك في حديث ابى هريرة عند ابى داود وغيره على الاستحباب-(فتح الباری ۳/۴۳، ابوداود ۱/۱۷۹)

''جو کوئی فجر کی دو سنتوں کے بعد گفتگو کرے اور نہ لیٹے'' اس ترجمۃ الباب سے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ اس فعل پر دوام اختیار نہیں کرتے تھے، اس سے ائمہ کرام نے عدم وجوب پر دلیل لی ہے اور اس ضمن میں ابوداؤد اور اس کے علاوہ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ''امر'' منقول ہے۔ جسے استحباب پر محمول کیا ہے۔ (فتح الباری)

سو ابوداؤد وغیرہ میں جو بصیغہ امر ارشاد فرمایا ہے اس امر سے استحباب مراد لینا ہی لازم آتا ہے، ورنہ حدیث ماقبل سے تطبیق ممکن نہ ہوگی۔

اور اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فعل ثابت ہے تو بدعت کیونکر ہوسکتا ہے اور جن بزرگانِ دین سے اس فعل کا انکار و ردّ ثابت ہے اس کی وجہ یہ

ہے کہ ان کو یہ حدیث نہیں ملی ورنہ کوئی مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کا کیونکر رد کرسکتا ہے چہ جائیکہ بندگانِ دین اس کا رد کریں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا انکار:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اس فعل کے استحباب سے انکار کے متعلق حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں رقمطراز ہیں:

وامّا انکار ابن مسعود الاضطباع وقول ابراهیم النَخعیَ هی ضَجَعة الشّیطان، کما أخرجهما ابن ابی شیبة فهو محمول علی انّه لم یبلغهما الأمر بفعله۔ (فتح الباری ۳/۴۳)

''سو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا لیٹنے سے انکار اور ابراہیم النخعیؒ کا یہ قول کہ یہ شیطان کا لیٹنا ہے جیسا کہ یہ ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے یہ اس پر محمول کیا جائے گا کہ ان دونوں حضرات تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل نہ پہنچا ہوگا۔''

اور بعض کا یہ کہنا کہ یہ فعل تہجد گزار کے ساتھ خاص ہے، بلا دلیل ہے، کیونکہ تخصیص بلا دلیل نہیں ہوسکتی۔ **کما لایخفی . واللّٰہ اعلم۔**

قد نمقہ العاجز/محمد یٰسین الرحیم آبادی ثم العظیم آبادی وعفی عنہ سیآتہ۔

اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام:

⇦ المجیب مصیب۔ محمد حسین خان خورجوی۔

⇦ جواب ھذا صحیح ہے۔ مستحب کو بدعت کہنا نہایت مذموم ہے۔ حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ۔

⇦ محمد عبدالسلام غفرلہ۔ ۱۳۹۹ھ

⇦ عبدالرؤف ۱۳۰۳ بہاری

⇦ ابو محمد عبدالحق ۱۳۰۵ لودیانوی

⇦ خادم شریعت رسول الاداب ابو محدم عبدالوهاب ۱۳۰۰ القنجابی الجھنکوی

نزیل الدہلی۔

⇦ محمد طاہر ۱۳۰۴ھ سلہٹی

(واللہ المستعان)

لڑکے اور نابینا کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال:

علماء دین ومفتیان شرعِ متین فرمائیں کہ نابینا اور لڑکے کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب:

نابینا کی امامت شرعاً درست ہے:

اربابِ فہم وذکا پر مخفی نہیں کہ اندھا ہونا قدرتی عیب ہے نہ کہ کوئی ایسا شرعی عیب، جس سے اندھا قابل ملامت ہو کیونکہ شرع میں اس عیب پر ملامت ہوتی ہے جو کسب سے ہو اور یہ عیب کسبی نہیں ہے۔ کمالا یخفی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ (البقرہ/۲۸۶)

"اس کیلئے ہے جو وہ نیکی کرے اور اس پر ہے جو وہ برائی کرے۔"

پس اندھا ہونا کوئی ایسا عیب نہیں ہے جس سے نماز میں کسی قسم کا نقصان ہو کہ اندھا قابل امامت نہ ہو اور نہ فسق ہے کہ اس کے پیچھے نماز ذاتاً یا وصفاً ناقص ہو۔ تو جب تک کوئی دلیل شرعی اس پر قائم نہ ہو کہ اندھے کے پیچھے نماز مکروہ ہے اس کی امامت کی کراہت کا حکم لگانا صحیح نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ اس کی امامت کو مکروہ کہیں ان کو شرعی دلیل لانی چاہئے، ورنہ وہ دوسرے مسلمانوں کی مثل ہوگا اور جیسے بصیر مسلمان کے پیچھے نماز درست ہے اس کے پیچھے بھی درست ہے، مکروہ کہنے اولوں کی دلیل، ان کا مذہب اور اس کی کیفیت بھی حسناً وقبحاً ان شاء اللہ آئندہ ذکر کروں گا۔ اور اگر ان باتوں سے قطع نظر بھی کریں تو اندھے کی امامت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور محققین کے

اقوال بھی اسی کے موافق ہیں۔ احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

۱)...... عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ اِسْتَخْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ابْنَ اُمِّ مَکْتُوْمٍ یَؤُمُّ النَّاسَ وَ ھُوَ اَعْمٰی۔ رواہ ابوداود وکذا فی المشکاۃ۔[1]

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا خلیفہ بنا کر گئے تھے جو کہ لوگوں کی امامت کرواتے تھے اور وہ نابینا تھے۔ (ابوداود، مشکاۃ)

۲)...... شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ترجمہ مشکاۃ میں فرماتے ہیں کہ ایسا اتفاق تیرہ ۱۳ مرتبہ ہوا حالانکہ اور جلیل القدر صحابہ بھی موجود ہوا کرتے تھے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

حضرت علی گفتہ اند کہ: آن سیزدہ بار بود یک باز ازاں وقتیکہ بغزوۂ تبوک رفت با آنکہ امیر المومنین علی در مدینہ بود وخلیفہ بود براہل و عیال و باعث پر استخلاف ابن ام مکتوم برائے امامت ہمیں بود تاعلی اشتغال بامر امامت مانع از قیام بحفظ اہل وعیال نیاید۔[2]

"کہ یہ واقعہ تیرہ دفعہ پیش آیا ایک مرتبہ جب وہ غزوۂ تبوک پر گئے، حضرت علیؓ مدینہ میں موجود تھے اور خلیفہ بھی تھے اور ابن ام مکتومؓ کی جانشینی کا یہی سبب تھا کہ حضرت علیؓ کو اہل وعیال کی نگہداشت سے یہ امر مانع نہ ہو (اشعۃ اللمعات)

اور جیسا کہ منتقی الاخبار ۱/۶۲۶ میں ہے:

---

[1] نیل الاوطار ۳/۱۷۱، معجم کبیر طبرانی ۱۱/۱۸۳، مسند احمد ۲/۱۹۲، ابوداود ۵۹۵ حدیث، ابن حبان ۳/۴۴۱، تلخیص الحبیر ۲۔۴۴، مشکوٰۃ البانی ۱/۳۵۰)

[2] اشعۃ اللمعات للشیخ عبدالحق دہلوی ۲/۴۲۶

۳)...... وَعَنْ محمود بِنِ الرَّبِيعِ عَنْ عِتْبَانَ بَنِ مَالِكٍ رضی الله عنه كَانَ يَؤُمُّ قَوْمَهُ وَهُوَ اَعْمٰى...الحديث.. (رواه البخاری والنسائی، نیل الاوطار۴/۱۷۱)

''محمود بن الربیع سے مروی ہے کہ حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ اپنی قوم کی امامت کرواتے تھے اور وہ نابینا تھے۔''

۴)...... ابو اسحاق مروزی اور امام غزالی نے تو کہا ہے کہ نابینا کے پیچھے نماز پڑھنا افضل ہے کیونکہ کچھ نظر نہ آنے کے باعث اس کا خیال منتشر نہیں ہوتا اور نماز میں خوب دل لگتا ہے، جیسا کہ نیل الاوطار میں مذکور ہے:

وقدصرّح ابو اسحاق المَروزی والغزالی بانّ امامة الأعمی افضل من امامة البصير لانّه اكثر خشوعا عن البصير لما فی البصير من شغل القلب بالمبصّرات۔(نیل۴/۱۷۱،النہایہ۲/۳۹۴)

''ابو اسحاق مروزی اور امام غزالی نے وضاحت کی ہے کہ نابینا شخص کی امامت بینا سے افضل ہے کیونکہ وہ بصیر سے زیادہ خشوع والا ہوتا ہے بسبب اس کے کہ بینا کا دل چیزوں کے دیکھنے میں مشغول نہیں ہوتا۔''

فقہ حنفی سے دلیل:

اور فقہ حنفی میں بھی حدیث کے موافق روایات منقول ہیں جیسا کہ اشعۃ اللمعات میں ہے:

ودر روایات فقہیہ در مذہب مانیز آمدہ است کہ اگر اعمٰی مقتدا قومی باشد جائز است امامت وے وبعض گفتہ اند کہ اعلم باشد پس وے اولی است۔ کذافی شرح الکنز نقلا عن المبسوط، وہم چنیں ست در کتاب اشباہ ونظائر:۲/۱۵۶، انتہی۔

''ہمارے مذہب کی فقہی روایات سے منقول ہے کہ اگر نابینا امام

ہو تو جائز ہے۔ اور بعض کہتے ہیں اگر وہ زیادہ صاحب علم ہو تو امامت میں اولی و مقدم ہے۔ شرح الکنز (حاشیہ ۳۲) بحوالہ المبسوط۔ اس طرح اور کتابوں میں بھی اس کے اشباہ و نظائر پائے جاتے ہیں۔"

البتہ یہ حنفی مذہب میں مکروہ ہے۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے: (۱/۱۲۴)

والاعمى لانه لا يتوقى النجاسة۔

"(اس لئے کہ) اندھا نجاست سے نہیں بچتا۔"

اصحابِ بصیرت ذرا غور کریں کہ کیسی دلیل ہے۔ اول تو یہ قاعدہ کلیہ کہ "نجاست سے نہیں بچتا" مشاہدہ سے غلط ثابت ہوتا ہے کوئی شخص اسے ثابت نہیں کرسکتا۔ اگر مان بھی لیا جائے تو علت، نجاست سے بچنا ہے۔ اندھا بذاتہ علت نہیں۔ سو مطلقا یہ حکم لگانا کہ اندھے کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔ کیونکر صحیح ہوگا۔ جس سے یہ عقیدۂ فاسد عوام میں راسخ ہوگیا کہ اندھا ہونا خود ایسا عیب ہے جس سے نماز مکروہ ہوتی ہے بلکہ یہ حکم لگانا چاہئے کہ: جو نجاست سے نہ بچے خواہ اندھا ہو خواہ نابینا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے۔[1]

---

[1] نابینا کی امامت کے متعلق علماء دیوبند کا موقف، کراہت وعدم کراہت دونوں طرح سے "فتاویٰ دارالعلوم" میں منقول ہے۔ ذیل میں ملاحظہ ہو:

سوال: نابینا کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

جواب: اگر نجاست سے محفوظ رہتا ہے اور مسائل نماز سے واقف ہے تو اس کی امامت درست ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم ۳/۱۰۱)

مزید۔ اندھے وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے یعنی خلاف اولیٰ ہے اور بہتر نہیں ہے، لیکن اگر اندھا مسائل نماز سے واقف اور محتاط ہے تو پھر کچھ کراہت نہیں ہے، چنانچہ ایک صحابی ام مکتومؓ جو نابینا تھے ان کو خود آنحضرت ﷺ نے امام مقرر فرمایا تھا۔ فقط (فتاویٰ دارالعلوم ۳/۱۶۹)

اور تحریر کیا ہے کہ:

امامت کے لئے افضل وہ شخص ہے جو مسائل نماز جانتا ہو اور صالح و متقی ہو اندھا ہونے سے کچھ حرج نہیں جب کہ وہ نیک اور محتاط ہو اور مسائل سے واقف ہو پس اگر وہ امام اندھا مسائل دان ہے اور نیک ہے تو جمعہ کی امامت کے لئے بھی وہی افضل ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم ۳/۹۷) [جاوید]

بھلا اے مسلمانو! آپ کا ایمان چاہتا ہے کہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام بنایا ہو اس کی امامت کو ایسے ویسے خیالات موہومہ سے مکروہ جان لو اور حدیث کا مقابلہ خیالات وہمیہ سے کرو؟

لڑکے کی امامت:

لڑکا جب ہوشیار قرآن پڑھا ہوا ہو تو اس کی امامت صحیح حدیث سے ثابت ہے:

عَنْ عَمرِوْ بْنِ سَلْمَةَ عَنْ اَبِيهِ فِي الْحَدِيثِ الطَّوِيْلِ، فَقَدَّمُوْنِیْ وَ اَنَا غُلاَمٌ وَ عَلَيَّ شَمْلَةٌ لِيْ قَالَ: فَمَا شَهِدْتُ مَجْمَعًا من جَرْمٍ اِلاَّ كُنْتُ اِمَامَهُمْ...... الحدیث (رواہ ابوداؤد ۱/۳۹۵)

"ایک طویل حدیث میں حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے مجھے امامت کے لئے آگے بڑھا دیا جبکہ میں ایک لڑکا تھا اور میں تہہ بند پہنے ہوئے تھا پھر میں جب کبھی جرم قبیلہ کے مجمع میں ہوتا تو میں ہی ان کا امام ہوتا۔ (ابوداؤد)

اور (لڑکے کی امامت کی) مخالفت میں کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، من ادعی فعلیہ البیان۔ قد نمقہ العبد المھین محمد یٰسین الرحیم آبادی ثم العظیم آبادی عفی عنہ۔

اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام:

⇦ جواب ھذا صحیح ہے، قدرتی نابینا ہونے کو عیب جاننا، خود علم سے نابینا ہونا ہے۔ حسبنا اللہ بس حفیظ۔

⇦ محمد یوسف ۱۳۰۲ھ فیروز پوری

⇦ محمد طاہر ۱۳۰۲ھ سلہٹی

⇦ سید محمد عبدالسلام غفرلہ ۱۲۹۹ھ

⇦ محمد عبدالحمید ۱۲۹۲ھ

⇦ ابو محمد عبدالحق لودیانوی ۱۳۰۵ھ

⇦ دونوں سوالوں کا جواب نہایت درست ہے اور اس کی مخالفت معیوب اور ناقابل اعتبار ہے۔ خصوصاً نابالغ لڑکے کو فرض، نفل، جیسے تراویح، میں امام بنانا صحیح و درست ہے، کیونکہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ حضرت عمرو بن سلمہؓ صحابی صغیر السن چھ، سات برس کے تھے، قرآن کریم خوب جانتے تھے اور امامت کرواتے تھے۔ کذا فی البخاری وغیرہ من کتب الحدیث، فقط واللہ اعلم۔

⇦ حررہ العاجز ابو محمد عبدالوھاب الفنجابی الجھنکوی ثم الملتانی نزیل الدھلی۔ خادم شریعت رسول الاداب ابوعبدالوھاب ۱۳۰۰ا

⇦ اصاب من اجاب۔ محمد حسن خانصاب خورجوی

(و اللّٰہ الموفق)

ولد الزنا کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال:

علماء دین ولد الزنا کے بارہ میں کیا فرماتے ہیں کہ وہ دوزخی ہے یا جنتی؟ نیز اس کے ساتھ کھانا، نکاح کرنا، اس کے پیچھے نماز پڑھنا اور اس کے علاوہ دوسرے اسلامی معاملات رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب:

ولد الزنا کیا اسلام سے خارج ہے؟

ماہرین شریعت پر مخفی نہیں ہے کہ ولد الزنا ہونا شرع میں ایسا کوئی عیب نہیں ہے جس سے ولد الزنا احاطۂ اسلام سے خارج ہو یا اسلام کا کوئی حکم اس سے اٹھ جائے یا حقوق المسلمین میں سے اس سے کوئی حق فوت ہو جائے یا اس کے اسلام میں کوئی خلل واقع ہو بلکہ جیسے اور صحیح النسب مسلمان ہیں ویسے ہی وہ بھی مسلمان ہے، سارے احکام اسلام کے اس پر ہیں اور جتنے حقوق مسلمانوں کے ہوتے ہیں سب اس کے بھی ہیں۔ کوئی شرعی دلیل اس پر قائم نہیں ہے کہ ولد الزنا ہونے سے کوئی ایسا عیب پیدا ہوتا ہو جس سے مذکورہ بالا امور میں سوالات لازم آتے ہوں، جو مدعی ہو وہ دلیل لائے۔ "البینہ علی المدعی" اور یوں بھی یہ کیونکر ہو سکتا ہے، گناہ کا ارتکاب تو اس کے ماں باپ نے کیا ہے اس کا الزام ان پر ہے مولود کا اس میں کیا گناہ ہے، ماں باپ کا گناہ لڑکے پر کیونکر ہو سکتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ...... الآیۃ۔ (فاطر:۱۸)

"کوئی بھی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"

اور فرمایا:

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ۔ (طور:۲۱)

"ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا گروی ہے۔"

اور فرمایا:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ......الآية، (البقرہ:۲۸۶)

"اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جو نیکی وہ کرے وہ اس کے لئے اور جو برائی وہ کرے وہ اس پر ہے"

مزید فرمایا:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۳۴)

"یہ جماعت تو گزر چکی جو انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے اور جو تم کرو گے تمہارے لئے ہے، ان کے اعمال کے بارے میں تم نہیں پوچھے جاؤ گے۔"

اس مضمون کی بہت سی آیات اور احادیث ہیں کہاں تک نقل کروں، سمجھنے کے لئے اسی قدر کافی ہے جس کو قرآن و حدیث سے ذرا بھی لگاؤ ہے وہ انکار نہیں کر سکتا۔

ہاں جو گناہ ان کے ذاتی ہیں ان کا الزام ان پر ہوگا اور ان کی سزا پانے کے مستحق ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال:۷۔۸)

"سو جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔"

مزید فرمایا:

فَمَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ

فَلاَ یُجْزٰی اِلَّا مِثْلِهَا-الآیة-(انعام/۱۶۰)

''جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اسکے دس گنا ملیں گے اور جو شخص برا کام کرے گا اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی۔''

ولدالزنا جنتی یا دوزخی؟:

سو ولدالزنا کا جب یہ حال ہے تو اس کا دوزخی یا جنتی ہونا دوسرے مسلمانوں کی طرح اس کے ذاتی اعمال پر منحصر ہے۔ ولدالزنا ہونے پر وہ دوزخی نہ ہوگا، اور مسلمانوں کا اس کے ساتھ کھانا ، پینا ، نکاح کرنا درست ہے، کیونکہ وہ تو دوسرے مسلمانوں کی مثل ہے اس طرح اسلام کے تمام حقوق اس سے منسلک رکھنے چاہئیں، اس سے نفرت کرنی یا اس کا حق اسلام سے ترک کرنا صریح ظلم اور قبیح فعل ہوگا، کیونکہ بغیر کسی سبب شرعی کے کسی مسلمان سے نفرت کرنی یا اس کا حق تلف کرنا ظلم نہیں تو کیا ہے!

فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَما یُضِلُّ بِه اِلَّا الْفَاسِقِیْنَo الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِه وَ یَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَاللّٰهُ بِه اَنْ یُّوْصَلَ...... الآیة-(البقرہ:۲۷)

''اور گمراہ تو صرف فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مضبوط عہد کو توڑ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں کاٹتے ہیں......''

بخاری شریف میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِه وَیَدِه- (فتح الباری کتاب الایمان ۱/۶۳، مسلم ۱/۶۵، مصابیح السنۃ:۱/۱۱۴)

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے (دوسرے) مسلمان محفوظ رہیں۔''

ولد الزنا کی امامت کیسی ہے؟

اور اگر وہ قرآن پڑھا ہوا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنی بلا کراہت درست ہے اور اگر وہ "اِقْرَأْ" (یعنی زیادہ پڑھا ہوا) ہو تو اس کے پیچھے پڑھنا اَولیٰ وانسب ہے۔ بحکم حدیث: يَؤُمُّكُمْ أَقْرَءُ كُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ۔ (فتح الباری ۲/۱۸۴، مسلم ۱/۴۶۵)

تمہاری امامت وہ کرائے جو تم میں سے قرآن کریم کو سب سے زیادہ پڑھنے والا ہو۔ (بخاری و مسلم)

اس کی امامت کے ناجائز ہونے یا کراہت کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، جو لوگ مکروہ کہتے ہیں ان کی یہ بات بلا دلیل ہے جیسا کہ تفصیل آئندہ آئے گی۔

امام بخاریؒ کا مسلک:

چنانچہ امام بخاریؒ نے ولد الزنا کی امامت کی صحت سے متعلق باب قائم کیا ہے۔ صاحب فتح الباریؒ نے جمہور کا درج ذیل مذہب نقل کیا ہے کہ ولد الزنا کی امامت صحیح ہے:

و الی صحّة امامة ولدالزّنا ذهب الجمهور ایضا و کان مالک یکره ان یتّخذ اماما زانیا و علّته عنده انه یصیر معرضا بکلام النّاس فیأ ثمون بسببه و قیل لانّه لیس فی الغالب من یفقه فیغلب علیه الجهل۔ (فتح الباری ۲/۱۸۵)

"جمہور کے نزدیک ولد الزنا کی امامت درست ہے اور امام مالکؒ زانی کی امامت کو مکروہ جانتے تھے اس لئے کہ وہ لوگوں کی گفتگو کا نشانہ بنے گا سو بایں سبب وہ گناہ گار ہوں گے اور کہا گیا ہے کہ غالب خیال ہے کہ اسے کوئی سنبھالنے والا نہ ہو تو اس پر جہالت کا غلبہ ہوگا۔"

اس کی امامت کو مکروہ کہنے والے اور ان پر ردّ:

اب جو لوگ مکروہ کہتے ہیں ان کی دلیل، سنی حنفی مذہب میں یہ ہے کہ جب

اور لوگ بھی ولد الزنا کے سوا پڑھے ہوئے ہوں تب اس کا امام بنانا مکروہ ہے اور جب اور کوئی پڑھا ہوا نہ ہو تب مکروہ نہیں ہے۔

وولد الزّنا هذا ان وجد غيرهم والا فلا كراهة۔(بحر کذا فی در المختار ۱/۵۴/۵۵)

"اور ولد الزنا کے علاوہ اگر دوسرے لوگ پائے جائیں تو وہ امامت کروائیں، اور اگر نہ ہوں تو پھر اس کی امامت میں کوئی کراہت نہیں ہے۔"

اور امام مالکؒ کے نزدیک مستقل امام مقرر کرنا مکروہ ہے، البتہ کبھی کبھار بنا لینا مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا فتح الباری کی عبارت سے مترشح ہے، اب ان کی دلیل دیکھیے!

پہلی دلیل:

ان کی یہ ہے کہ اس کا کوئی مشفق باپ نہیں جو اسے تعلیم دے، سو غالب خیال ہے کہ وہ جاہل ہے۔

یہ ایسی لایعنی دلیل ہے کہ اسے رد کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کراہت کا سبب جہالت ہے۔ سو ولد الزنا ہونے کو کچھ دخل نہ ہوا بلکہ اس کی بنیاد جہالت ہے، تو کلیۃً اس کی امامت کو مکروہ کہنا غلط ہوا بلکہ جیسے اور جاہل مسلمان کی امامت مکروہ ہے، اگر یہ بھی جاہل ہوگا تو اس کی امامت بھی مکروہ ہوگی اس کو الگ بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے بلکہ اس کو الگ بیان کرنا مضر ہے کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات جم گئی کہ ولد الزنا خود ایسا عیب شرعی ہے جس سے امامت مکروہ ہوتی ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے، جو لوگ مکروہ کہتے ہیں ان کا بھی یہ مذہب نہیں ہے تو اسے الگ بیان کرنے سے لوگوں کے دلوں میں کیسا فاسد اعتقاد بیٹھ جائے گا۔ نعوذ باللہ۔ چنانچہ امام طحطاوی حنفی المذہب نے اس دلیل کو لایعنی کہا ہے:

قوله: وولد الزّنا لتنفر النّاس عنه وما قيل لانّه ليس له ابّ

له يؤدبه فيغلب عليه الجهل ، تعليل بارد-(عيني كذا في الطحطاوی)

”ولدالزنا سے لوگ تنفر ہوتے ہیں اور جو اس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ: ”اس کا باپ نہ ہو جو اسے ادب سکھائے پس اس پر جہالت غالب ہوگی“ کمزور علت ہے۔(عینی)

دوسرا اس کا مقدمہ بلا دلیل ہے......فتأمل فيه......

دوسری دلیل:

ان کی یہ ہے کہ: لوگ اس سے نفرت کریں گے اور جماعت میں تفریق پیدا ہوگی۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

ولأنّ في تقديم هؤلاء تنفر الجماعة فكره (ہدایہ/۱۲۲)

”اس کہ ان کی عزت وتکریم جماعت میں باعث نفرت ہوگی جس وجہ سے اس کی امامت ناپسندیدہ ہے ......یہ دلیل بھی پہلی دلیل ہی کی طرح ہے۔“

پالے چوبیں سخت بے تمکین بود

”لکڑی کے پائے سخت ومضبوط نہیں ہیں“

کیونکہ یہ بات تو ثابت ہے کہ لوگوں کی یہ نفرت بے جا وظلم ہے، اس میں کوئی شرعی عیب قابل نفرت نہیں ہے، اور اگر یہ امر فریقین کے ہاں مسلم ہے تو ناحق چیز کو ختم کرنا چاہئے اور لوگوں کو ظلم سے روکنا چاہئے یا موضوع نفرت کو مضبوط ومستحکم کرنا چاہئے اور مظلوم پر ظلم، اور ظالم کی اعانت کرنی چاہئے؟ کوئی صاحب عقل یہ بات کیونکر کہہ سکتا ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سرداری میں بے جا طعن کیا تھا اور ان کی اطاعت سے اظہار نفرت کیا تھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سمجھایا اور اس بے جا نفرت سے ڈرایا اور ظلم سے باز رکھا اور ان کی سرداری بھی قائم رکھی، یہ تو نہ کیا کہ ان کی نفرت قائم اور سرداری باطل

کردی ہو۔ بس ولدالزنا سے متعلق بھی وہی اسلوب اختیار کرنا چاہئے جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا نہ کہ اس کے برعکس رویہ اختیار کیا جائے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن دینار سے مروی ہے کہ انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا وہ فرماتے تھے: کہ

بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْثًا وَ اَمَّرَ عَلَيْهِمْ أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ فَطَعَنَ بَعْضُ النَّاسِ فِي اِمْرَتِهٖ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اِنْ كُنْتُمْ تَطْعَنُوْنَ فِي اِمْرَتِهٖ، فَقَدْ كُنْتُمْ تَطْعَنُوْنَ فِي اِمَارَةِ اَبِيْهِ مِنْ قَبْلُ، وَ اَيْمُ اللّٰهِ اِنْ كَانَ لَخَلِيْقًا لِلْاِمَارَةِ، وَ اِنْ كَانَ لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَيَّ، وَ اِنَّ هٰذَا عَنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَيَّ بَعْدَهٗ۔ (فتح الباری ۷/۸٦)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا اور اسامہ بن زید کو اس پر امیر مقرر فرمایا بعض لوگوں نے ان کی سرداری پر طعن کیا، تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا: کہ اگر تم اس کی سرداری پر طعن کرتے ہو تو اس سے قبل اس کے باپ کی سرداری پر بھی طعن کر چکے ہو، اللہ کی قسم! وہ امارت کا مستحق تھا اور لوگوں میں میرے نزدیک بہت زیادہ محبوب تھا اور اس کے بعد یہ (حضرت اسامہؓ) لوگوں میں سب سے زیادہ میرے نزدیک محبوب ہے۔"

سو جو لوگ ولدالزنا کی امامت کو مکروہ کہتے ہیں وہ لوگ اعانت علی الظلم کرتے ہیں اور اس پر ظلم کرتے ہیں اور لوگوں میں فاسد عقیدہ کی اشاعت کرتے ہیں[1]

كما لا يخفى على من له ادنى فهم۔ واللّٰه اعلم بالصواب. قد

---

[1] تاہم دارالعلوم دیوبند ولدالزنا کی امامت کو بلا کراہت جائز کہتے ہیں۔ تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو:
سوال:۔ جس شخص کے باپ کا حال معلوم نہ ہو کہ کون ہے؟ کیا وہ مسجد کا مستقل امام ہوسکتا ہے یا نہیں؟
جواب:۔ اگر خود لائق امام بنانے کے ہے مثلاً مسائل نماز سے واقف ہے اور قرأت صحیح پڑھتا ہے اور ⇦

نمقه العبد المهین محمد یٰسین الرحیم آبادی، العظیم آبادی۔

اسمائے گرامی و دستخط مؤیدین علماء کرام:

⇦ الجواب صحیح والمجیب نجیح ۔حررہ محمد فقیر اللہ پنجابی۔

⇦ جواب ھذا صحیح ہے۔حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ۔

⇦ المجیب مصیب ۔محمد حسین خان خورجوی۔

⇦ خادم شریعت رسول الاداب ابو محمد عبدالوھاب

⇦ ابو محمد عبدالحق ۱۳۰۵ھ لودیانوی

⇦ محمد طاہر ۱۳۰۴ھ سلہٹی

(سبحان اللہ وبحمدہٖ)

⇦ فسق و فجور سے مجتنب ہے تو وہ امام بنایا جا سکتا ہے۔ شامی میں تصریح ہے کہ اگر ولد الزنا خود صالح و عالم وغیرہ ہو تو اس کی امامت بلا کراہت صحیح ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم ۳/۲۰۴)

دوسری جگہ لکھا ہے کہ حرامی کے پیچھے نماز درست ہے۔ جو مشہور رہے وہ بین الناس، یہ غلط ہے اور صورت مسئولہ میں اس کا امام بنانا بلا کراہت درست اور جائز ہے۔ کیونکہ احکام نماز سے سب سے زیادہ واقف ہے اور فقہاء نے وجہ کراہت یہ تو تحریر فرمائی ہے کہ حرامی کا کوئی باپ شفیق نہیں ہوتا لہٰذا جاہل رہتا ہے، تو معلوم ہوا کہ اگر جاہل نہ ہو تو بلا کراہت جائز ہے۔ بلکہ اس صورت میں سب سے زیادہ حق دار ہے کہ اس کو امام بنایا جائے۔ کما فی الدر المختار۔ (فتاویٰ دار العلوم ۳/۳۲۲) [جاوید]

مفقود الخبر کے بارے میں

سوال:

علمائے دین فرمائیں کہ ایک شخص چار سال سے مفقود الخبر ہے۔ اس کی زوجہ حنفیہ کو امام مالک کے قول کے موافق دوسرا نکاح کرنا درست ہے یا نہیں؟ مزید گزارش یہ ہے کہ اگر نکاح کے بعد زوجِ اول یعنی مفقود الخبر آ جائے تو ایسی صورت میں یہ عورت زوجِ اول کو ملے گی یا زوجِ ثانی کے نکاح میں رہے گی؟ بینوا بالکتاب توجروا یوم الحساب۔

جواب:

زوجہ حنفیۃ المذہب کو امام مالکؒ کے قول کے موافق دوسرا نکاح کرنا درست ہے، کیونکہ امام مالک کا قول خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے مستفاد ہے۔ اور فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةُ خُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ..........

حنفیہ کے نزدیک بھی مسلم ہے:

قَالَ فِي الْمُوَطَّا اِمَامُ مَالِكٍ عَنْ يَحْيٰى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ: اَيُّمَا امْرَأَةٍ فَقَدَتْ زَوْجَهَا فَلَمْ يَدْرِ اَيْنَ هُوَ فَاِنَّهَا تَنْتَظِرُ اَرْبَعَ سِنِيْنَ ثُمَّ تَعْتَدُّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَ عَشْرًا ثُمَّ تَحِلُّ۔ (موطا ۲۳۲/ فاروقی ملتان)

''حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس کسی عورت کا شوہر گم ہو جائے اور وہ لا پتہ ہو تو وہ چار سال انتظار کرے گی پھر چار ماہ دس دن عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے شخص کے لیے

حلال ہوگی۔"

اور نکاح ثانی کے بعد اگر زوجِ اول مفقود الخبر آ جائے تو اس کو نہیں مل سکتی۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: کہ اگر عورت عدت گزارنے کے بعد نکاح کر لیتی ہے وہ اس سے ملا یا نہ ملا، تاہم پہلے شوہر کو نہیں مل سکتی۔"

اور شاہ ولی اللہؒ نے بھی اس کو مسوّی میں اسی طرح تحریر کیا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

⇦ سید محمد نذیر حسین۔ ۱۲۸٦ھ

⇦ ابو محمد عبدالحق ۱۳۰۵ھ

⇦ سید محمد عبدالسلام غفرلہ ۱۲۹۹ھ

⇦ خادم شریعت رسول الاداب ابو محمد عبدالوھاب ۱۳۰۰ھ

⇦ قد صح الجواب۔ واللہ اعلم۔ حررہ ابو محمد عبدالرؤف البھاری المانفوری

⇦ جواب ھذا صحیح ہے۔ عبدالرؤف ۱۳۰۲ھ

⇦ حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ

⇦ جواب صحیح ہے۔ ابو علی محمد عبدالرحمٰن الاعظم گڑھی المبارکفوری

⇦ الجواب صحیح۔ نمقہ محمد یٰسین الرحیم آبادی ثم العظیم آبادی

میں کہتا ہوں:

یہ مذہب حضرت عمر، عثمان، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے امام نخعی، زہری، مکحول، عطا اور شعبی رحمہم اللہ کا ہے۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری وتلخیص امام رافعی وغیرھما۔

اور اس پر محققین حنفیہ مثل طحطاوی، شامی، صاحب جامع الرموز، صاحب خزانۃ العلماء اور صاحب فتاویٰ حسب المفتین کا فتویٰ ہے:

قال في حسب المفتين، قول مالك رحمه الله تعالى معمول به في هذه المسئلة وهو احد قولي الشّافعي و لوافتي الحنفي بذلك يجوز فتواه لان عمر قضى هكذا في الذي استهوته الجن بالمدينة و كفى به اماما ولانّه منع حقّها بالغيبة فيفرّق القاضي بينهما بمضى هذه المدّة اعتبارا بالايلاء في العدد و ملاعنة في السّنة بالشّبهين-انتهى كلامه- لو افتي به في موضع الضّرورة ينبغي ان لابأس به ، كذا في الطحطاوي ورد المختار و خزانة العلماء و غيرها-و ان شئت التّفصيل فلترجع الى الرّسالة المسمّاة بمسائل اربع للاستاذ المحقِق و الحبر المدقِق المشتهر في المشرقين و في المغربين مولانا السيِّد / محمد نذير حسين لازالت فيوضاته هاطلة الى بقاء الملوين-

''حسب المفتین میں ہے کہ: امام مالکؒ کا قول اس مسئلہ میں معمول بہ ہے اور یہی ایک قول امام شافعیؒ کا بھی ہے اور اگر حنفی اسی فتویٰ کو جاری کرے تو اس کا فتویٰ جائز ہوگا کیونکہ حضرت عمرؓ نے اس کے مطابق ہی اس شخص کے متعلق یہی فتویٰ دیا تھا جس کو جنوں نے مدینہ سے برگشتہ کر دیا تھا، اور ان کا امام ہونا کافی ہے اور اس لئے بھی کہ اس مرد کا غیاب عورت کے حقوق کی بجا آوری سے مانع ہے۔ سو قاضی تعداد میں ایلاء[1] اور لعان کی سنیت کا اعتبار کرتے

---

[1] کیونکہ ''ایلاء'' کی مدت ۴ ماہ اور لعان میں ۴ قسمیں ہیں (جبکہ پانچویں میں تو جھوٹے ہونے کی صورت میں اپنے لئے غضب الٰہی کو دعوت دیتا ہے) عدد کا خیال کرتے ہوئے مدتِ انتظار چار سال مقرر کی گئی ہے۔ واللہ اعلم...... [خلیق]

ہوئے شبھین پر عمل کے باعث اس مدت کے گزرنے کے ساتھ ہی ان دونوں کے مابین تفریق کردے گا۔ انتہی۔ اگر بوقت ضرورت اس کا فتویٰ دے دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں (طحطاوی[1]، ردالمختار، خزانۃ العلماء وغیرہ) مزید تفصیل کیلئے استاد، محقق، دقیق عالم، مشرقین ومغربین میں شہرت یافتہ علامہ سید/محمد نذیر حسین صاحب، جن کا فیض شب و روز کے باقی رہنے تک جاری وساری رہے گا، کے رسالہ ''مسائل اربع'' کی طرف رجوع کیجئے''

فقط حررہ ابو القاسم محمد عبدالرحمن الفنجابی الاھور غفر اللہ تعالیٰ لہ و لاساتذتہ و لجمیع المؤمنین۔

اسمائے گرامی ومؤیدین علماء کرام:

⇦ قد اصاب من اجاب۔ حررہ ابومحمد عبداللہ فقیر اللہ المتوطن ضلع شاہپور۔

⇦ المجیب مصیب۔ محمد حسین خان خورجوی

⇦ الجواب صحیح۔ محمد طاہر ۱۳۰۴ھ سلہٹی

⇦ خادم شریعت رسول الثقلین محمد تلطف حسین ۱۲۹۲ھ

(و اللہ المستعان)

---

[1] مفقود اور اس کی جورو (عورت) کے درمیان تفریق نہ کی جائے گی اور جب نوے برس گذر جائیں تو اس کی موت کا حکم دیا جائے گا۔ اسی پر فتویٰ ہے۔ فتاویٰ عالم گیری: عربی ۲/۳۰۰، اردو ۳/۵۱۰ ...... [جاوید]

مساجد میں جگہ مخصوص کرنا

سوال:

علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل دو مسائل سے متعلق کیا فرماتے ہیں:

۱۔ بعض مساجد میں یہ رواج عام ہے کہ نمازِ تراویح اور جمعہ وعیدین میں آنے والا شخص اپنا کپڑا، پگڑی یا چادر وغیرہ رکھ کر اپنے ان احباب کے لئے جو ابھی تک مسجد میں نہ آئے ہوں ان کے لئے دور تک جگہ روک لیتا ہے اور دوسرے شخص کو اس مخصوص جگہ پر بیٹھنے نہیں دیتا اور اگر کوئی اس جگہ بیٹھ جائے تو اس سے جھگڑنا شروع ہو جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات مار پیٹ اور خون خرابہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ تو کیا یہ امر جائز ہے یا نہیں اور جگہ روکنے والا عندالشرع گنہگار ہوتا ہے یا نہیں؟

۲۔ کوئی شخص مسجد میں آ کر بیٹھا اور پھر کسی شرعی حاجت یا کسی کام سے اٹھ کر چلا گیا اور کپڑا وغیرہ صرف اپنی ہی جگہ پر چھوڑ گیا جہاں بیٹھا تھا، اس لئے کہ وہی شخص اس جگہ کا مستحق ہے اور کسی دوسرے کو بیٹھنے نہیں دیتا، کیا یہ امر جائز ہے یا نہیں؟ نیز امام ومتولی مہتمم مسجد جن کو اختیار ہے کہ ایسی خلاف (شرع) حرکات سے نمازیوں کو روک سکتے ہیں اس طرف بالکل توجہ نہیں کرتے، ان کے حق میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ بینوا بالکتاب و افتونا لکم الثواب فی یوم الحساب۔

جواب: مسجد میں جگہ روکنے کا عدم جواز:

ان الحکم الا للّٰہ سبحانک لا علم لنا الا ما علّمتنا۔

اس طرح مسجد میں جگہ روکنا ہرگز جائز نہیں اور ایسا کام کرنے والا خطا کار اور گنہگار ہے اس لئے کہ سب مساجد خالص حق تعالیٰ شانہ کے لئے ہیں ان میں کسی کا

استحقاق دوسرے سے زیادہ نہیں بلکہ سب برابر ہیں۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ: وَ اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلاَ تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۔ (جن ـ ۱۸)

''اور بے شک مسجدیں اللہ ہی کے لئے خاص ہیں سو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔''

اور فرمان الٰہی ہے:

سَوَاءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ط وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ٥ (حج ـ ۲۵)

''مساوی ہے وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے، جو بھی ظلم کے ساتھ وہاں کا ارادہ کرلے ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔''

پہلے سے بیٹھنے والے کو اٹھانا ناجائز ہے:

سو جو کوئی شخص پہلے پہل آیا اور اپنے بیٹھنے کی مقدار جتنی جگہ پر بیٹھ گیا اسی کا وہ مستحق ٹھہرے گا اس کو وہاں سے اٹھانا کسی کے لئے درست نہیں اور اگر وہ زیادہ جگہ روکے گا تو دوسرا آنے والا اس جگہ پر بیٹھ سکتا ہے کیونکہ جگہ کا مخصوص کرنا اس کے لئے جائز نہیں، اور وہ بعد میں آنے والے کا استحقاق ہے، چنانچہ بخاری و مسلم کی حدیث اس کے لئے ناطق ہے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

لاَ يُقِيْمَنَّ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ثُمَّ يُخَالِفُ اِلٰى مَقْعَدِهٖ فَيَقْعُدُ فِيْهِ وَلٰكِنْ يَقُوْلُ تَفَسَّحُوْا۔ (متفق علیہ، مسلم ۴/۱۷۱۵، مصابیح السنہ ۱/۴۷۲)

''جمعہ کے دن تم سے کوئی اپنے بھائی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر قبضہ کرکے بیٹھنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ لوگوں سے کہے، کھلے ہو جاؤ۔''

پس ابتدائے حدیث کے منطوق سے سابق کا استحقاق اور اس کے اٹھانے کی

حرمت ثابت فرمائی اور آخرِ حدیث سے سابق کو زیادہ جگہ لینے کی ممانعت اور بقیہ کا بعد میں آنے والے کو مستحق قرار دیا کیونکہ اگر زائد جگہ کا کوئی مستحق نہ ہوتا تو کلمہ "تَفَسَّحُوْا" کہہ کر اپنی جگہ اس سے کس طرح نکال سکتا ہے جبکہ وہ پہلے سے آیا ہوا تھا۔ سو ظاہر ہوا کہ اگر جگہ کہیں زائد ہو تو موجود شخص اس پر بیٹھ سکتا ہے کیونکہ وہی اس کا مستحق ہے۔

اور اس قوی دلیل کے علاوہ امر مسئولہ میں مزید دلیلِ محکم یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ جب صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں منیٰ میں خاص آپ کے لئے مکان بنانے کی عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "لَا، مِنًى مُنَاخُ مَنْ سَبَقَ" یعنی میرے لئے مکان مت بناؤ کہ منیٰ ہر سابق کے لئے قیام گاہ ہے اور مکان بنانے کے صورت میں "بانی" کی تخصیص ہو جاتی ہے، اور محل کا حصر قبل از حضورِ حاضر لازم آتا ہے اور منیٰ اس حکم مساوات تصرف عامہ میں مسجد کی مانند ہے۔ **کمالایخفی علی الماهر الفطین۔**

خلاصہ کلام:

تو ظاہر ہوا کہ ایسے مقامات میں کسی کو پہلے سے جگہ روکنا روا نہیں، جو شخص آتا جائے اپنی جگہ لیتا جائے نہ کہ اپنے اقارب و احباب کے لئے مقام مخصوص کر لے اور کپڑے ڈال کر روک رکھے، کیونکہ یہ فعل ایک قسم کا ظلم ہے۔ دیکھئے! خود حضرت فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی ذات پاک کے لئے اس کو پسند نہیں فرمایا تو پھر اور کسی کی تو حقیقت ہی کیا ہے۔ نیز ایسے خاص مقاماتِ مطہرہ میں آپس میں مار پیٹ اور خون خرابہ کرنا سراسر نفس و شیطان کی پیروی ہے اور اس کی حرمت و شناعت صاف ظاہر ہے۔ **نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔**

اور مسئلہ ثانی کا جواب یہ ہے کہ جو شخص پہلے سے آکر پھر ضرورت کے لئے اپنا کپڑا رکھ کر چلا جائے۔ سو اگر یہ شخص قریب ہی حوائج ضروریہ کے لئے مثل وضوء واستنجاء کے گیا ہے تو یہ اس جگہ کا پہلے مستحق ہو چکا تھا۔ اب بھی وہی شخص زیادہ حق دار ہے بدلیل محکم حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

اِذَا قَامَ الرَّجُلُ مِنْ مَجْلِسٍ ثُمَّ رَجَعَ اِلَیْهِ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ۔(رواہ ابوداؤد فی سننہ[1])

"جب کوئی شخص مجلس سے اٹھے پھر وہیں لوٹ آئے تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔"

ہاں! اگر وہ بھی جگہ کو روک کر اپنے کاروبار اور دنیاوی لین دین کے لئے چل دیا تو اب وہ مستحق نہیں رہا، بلکہ دوسرے غیر حاضرین کی مثل ہے، چنانچہ "حدیث مثنیٰ" صراحت کرتی ہے جس کے بعد اخفاء نہیں ہے کہ جب ایسے امور منکرہ، شنیعہ وقبیحہ مساجد میں سرزد ہوتے ہوں اور متولی مسجد یا امام و مہتمم جو ایسے امور کو روکنے اور رد کرنے پر قادر ہیں اور عمداً ان کا ازالہ ورد نہ کریں تو وہ گنہگار اور ماخوذ ہوں گے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

مَامِنْ رَجُلٍ یَکُوْنُ فِیْ قَوْمٍ یَّعْمَلُ فِیْهِمْ بِالْمَعَاصِیْ یَقْدِرُوْنَ عَلٰی اَنْ یُّغَیِّرُوْا فَلَا یُغَیِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ بِعِذَابٍ مِّنْ قَبْلَ اَنْ یَّمُوْتُوْا۔[2]

"کوئی شخص کسی قوم میں رہ کر گناہوں کا ارتکاب کرتا ہو اور قوم کے لوگ اس کو تبدیل کرنے پر قادر بھی ہوں اور وہ ایسا نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو مرنے سے پہلے عذاب میں مبتلا کر دے گا۔"

سو ہر قادر شخص پر اس قسم کے فساد کا ازالہ و اصلاح واجب و لازم ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

اسمائے گرامی ومؤیدین علماء کرام:

⇦ الجواب حسن، فقیر محمد مسعود نقشبندی دہلوی امام مسجد فتح پوری

⇦ جواب ھذا صحیح ہے۔ حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ دہلوی

---

[1] ابوداؤد ۱۸۰/۵، مسلم میں ہے: مَن قَامَ مِنْ مجلسہ ابی عوانہ...... ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کے الفاظ اِذَا قَامَ اَحَدُکُمْ...... آلخ (مسلم ۱۷۱۵/۴)
[2] رواہ ابوداؤد ۵۱۱/۴، ابن ماجہ حدیث ۴۰۰۹

⇦ مجیب نے جواب صحیح و درست لکھا ہے، ایسا ہی فتاویٰ عالمگیریہ میں بھی ہے
حررہ محمد یٰسین الرحیم آبادی ثم العظیم آبادی

⇦ اصل الجواب صحیح ۔حررہ الفقیر الحقیر محمد شاہ عفی عنہ، مدرس مدرسہ مسجد فتح پوری دہلی۔ ۱۲۵۳ھ محمد شاہ دردو جہان

⇦ الجواب صحیح، واللہ اعلم بالصواب۔ محمد عبیداللہ ۱۳۹۱ھ

⇦ الجواب ناطق بالصدق و الصواب ۔ابو محمد احمد حسن ۱۳۰۴ھ

⇦ الجواب صحیح۔ فقیر عبدالحق ۱۳۹۰ھ

⇦ واللہ اعلم احمد حسن ساکن بجنور

⇦ قادر بخش ۱۳۰۴ھ

⇦ الجواب صحیح و اللہ اعلم و علمہ اتم عفی عنہ محمد بن ہاشم غفر لھا العالم

⇦ الجواب صحیح والمجیب نجیح ۔حررہ محمد ابو عبدالرحمٰن پنجابی

⇦ الجواب صحیح والرائی نجیح ۔حررہ ابو محمد عبدالرؤف البہاری ۔ عبدالرؤف ۱۳۰۳

⇦ الجواب صحیح ۔محمد نوازش علی ساکن قصبہ کاہلہ

⇦ الجواب صحیح واللہ اعلم۔ محمد عبیداللہ ۱۲۹۱ھ

⇦ وارد امید شفاعت ز محمد یعقوب فقیر/محمد یعقوب عفا اللہ عنہ الذنوب دہلوی

⇦ الجواب صحیح والمجیب نجیح ،حررہ محمد امیر الدین واعظ مذہب حنفیہ جامع مسجد دہلی۔
محمد امیر الدین ۱۳۰۰ھ

⇦ شان محمد یٰسین نازل شدہ در جبل پوری

⇦ محمد عبداللہ عفی عنہ مدرس مدرسہ مولوی عبدالرؤف

⇦ محمد حسن عفی عنہ مدرس مدرسہ مولوی عبدالرؤف

⇦ سید محمد عبد السلام ۱۲۹۹ھ غفرلہ

⇦ خادم شریعت رسول الاداب ابو محمد عبد الوھاب الفنجابی الجھنگوی ثم الملتانی

نزیل الدہلی صدر بازار امام مسجد سراے حافظ بنا۔

⇦ خادم شریعت رسول الثقلین محمد تلطف حسین ۱۲۹۲ھ

⇦ الجواب صحیح۔ محمد طاہر سلہٹی

⇦ محی الدین پوری العظیم آبادی

⇦ الجواب صحیح والرائی نجیح۔ ابو القاسم محمد عبد الرحمٰن الاھوی۔

⇦ لقد اصاب من اجاب۔ ابو عبد اللہ محمد فقیر اللہ المتوطن ضلع شاہ پور

⇦ الجواب صحیح۔ عبد اللطیف عفی عنہ | عبد اللطیف شہپوری

⇦ المسئلۃ صحیحۃ والمجیب نجیح | محمد عبد الرب ۱۲۹۰ھ | بانی مسجد سہارنپوری

⇦ امیدوار شفاعت ز محمد عبد القادر ۱۲۹۸ھ

(واللہ الموفق)

(ضمیمہ: روز مرہ کے ضروری مسائل)

محفل میلاد و فاتحہ خوانی

سوال:

علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ سے متعلق ارشاد فرمائیں کہ:

سرور کائنات صلی اللہ علیہ سلم کی مدح اور مولود خوانی اس انداز سے کرنا کہ مجلس زیب و زینت و شیرینی و بے شمار روشنیوں سے جگمگا رہی ہو اور خوش الحان لوگ اس طرح اشعار پڑھ رہے ہوں گویا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و مخاطب ہیں۔ جائز ہے یا نہیں؟ اور آپ کی ولادت کے ذکر کے وقت قیام کرنا اور مفتیان کا ایسی مجلس میں حاضر ہونا کیسا عمل ہے؟

☆ نیز عیدین و شب برات و پنجشنبہ وغیرہ کے روز آب و طعام سامنے رکھ کر اس پر ہاتھ اٹھا کر فاتحہ وغیرہ پڑھنا اور اس کا ثواب اموات کو پہنچانا جائز ہے یا نہیں؟

☆ اور میت کے سوئم پر لوگوں کو جمع کر کے قرآن خوانی اور بھنے ہوئے چنے کے دانوں پر کلمہ طیبہ اور پانچ آیات پڑھنا حدیث نبوی کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب: محفل میلاد وغیرہ کا انعقاد بدعت ہے:

محل میلاد کا انعقاد اور آنحضرت ﷺ کی پیدائش کے ذکر کے وقت قیام، قرونِ

ثلاثہ سے ثابت نہیں ہے، سو یہ بدعت ہے اور علی ھذا القیاس بروز عیدین و شب برات اور عیدین و پنجشنبہ وغیرہ میں ہاتھ اٹھا کر رسم فاتحہ کہنے کا ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ نیابۃً عن المیت، سوال میں مندرجہ امور کی تخصیص کے بغیر لِلّٰہ مساکین وفقراء کو دے کر ثواب پہنچانا اور دعاء و استغفار کرنے میں امیدِ منفعت ہے، اور یہی حال سوئم، دہم اور چہلم وغیرہ کا ہے اور پانچ آیات، چنے کے دانوں اور شیرینی کا حدیث اور کتب دینیہ سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ خلاصۃً یہ بدعات، مخترعات شرع میں ناپسندیدہ ہیں۔ حسبنا اللہ بس حفیظ۔

اسمائے گرامی و مؤیدین علماء کرام:

- زشرف سید کونین شد شریف حسین ۱۲۹۳ھ
- الٰہی بخش محمد محمود ۱۲۹۲ھ
- مدرس اول دیو بند محمد یعقوب ۱۲۹۰ھ
- محمد عبدالحمید دہلوی ۱۲۹۳ھ
- زاحمد سید ابوالحامد محمد
- اصاب المجیب۔ احمد حسن ۱۲۹۲ھ
- الجواب صحیح۔ کتبہ محمد احسن صدیقی
- الجواب صحیح۔ ھذہ المسئلۃ صحیحۃ ومنکرہ قبیح۔ محمد مراد علی عفی عنہ
- محمد احسن صدیقی
- محمد محمود دیو بندی عفی عنہ
- جوابات سب صحیح ہیں۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَ کُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: یہ بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا انجام دوزخ ہے۔ ھذہ المسئلہ جو ابہا صحیح۔ حسن علی عفی عنہ

---

[1] (مسلم حدیث ۲/۵۹۲، مصابیح السنہ ۱/۱۵۰، نسائی لیسوطیؒ ۳/۱۸۸)

⇦ این مسائل حق اند نزد افقیر محمد موسی

⇦ الجواب صحیح۔ محمد ابوالحسن عفی عنہ

⇦ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا کہ جہاں مولود پڑھا جاتا ہے وہاں تشریف لاتے ہیں، شرک ہے ہر[1] جگہ موجود اللہ تعالیٰ ہے، اللہ سبحانہ نے اپنی صفت و کسی، دوسرے کو عنایت نہیں فرمائی۔ واللہ اعلم۔ عبدالجبار عمر پوری عفی عنہ۔ مدرس مدرسہ مطلع العلوم میرٹھ۔

⇦ ایسی مجلس ناجائز ہے اور اسمیں شریک ہونا گناہ ہے اور جناب فخر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطابات اگر حاضر و ناظر سمجھ کر کرے تو کفر ہے۔ سو ایسی محفل میں جانا اور شریک ہونا ناجائز ہے۔ اور فاتحہ اور سوئم بھی خلاف سنت ہے کہ یہ سب ہنود کی رسوم ہیں۔ البتہ اموات کو بلا قید ثواب پہنچانا جائز ہے اس میں مضائقہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

⇦ الجواب صحیح بعون الملک الوھاب۔ فقیر محمد حسین دہلوی

⇦ ” البتہ یہ امور شرع سے ثابت نہیں ہیں۔ احمد حسن عفی عنہ مدرس ثانی سہارنپوری

⇦ حمد و صلاۃ کے بعد جان لینا چاہیے کہ التزام مجلس میلاد بلا قیام و روشنی و تقسیم شیرینی و قیودات لایعنی کا التزام ضلالت سے خالی نہیں ہے۔ وعلی ھذا القیاس سوئم و طعام پر فاتحہ پڑھنا قرون ثلاثہ میں نہیں پایا گیا، چنانچہ ملا علی قاری فرماتے ہیں:

قال الطّیبی: فیہ من أصرّ علی امر مندوب و جعل عزما و لم یعمل بالرّخصۃ فقد اصاب منہ الشّیطان من الاضلال کیف من أصرّ علی بدعتہ اومنکر ھذا محل فذکر الّذین یصرّون علی الاجتماع فی الیوم الثّالث

---

[1] یعنی اس کی قدرت وتصرف، وگرنہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات تو عرش پر مستوی ہے۔ (موضح القرآن) [خلیق]

للميّت ويرونه ارجح من الحضور للجماعة و نحوه۔

''طیبی کہتے ہیں: اس میں یہ بات عیاں ہے کہ جو کوئی جائز امر پر اصرار کرے اور اس پر پختہ ہو جائے اور رخصت پر عمل نہ کرے تو اس کو شیطان نے کس قدر گمراہ کر دیا ہے، تو پھر اس شخص کا کیا حال ہوگا جو اس جیسی بدعت یا منکر پر مصر ہوا۔ تو وہ زیادہ حیلہ باز ہے۔ پھر ان لوگوں کا تو ذکر ہی کیا جو کہ میت کے سوئم کے اجتماع پر اصرار کرتے ہیں اور اسے نماز باجماعت وغیرہ میں حاضر ہونے سے بھی زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔

سو ایسے مقامات پر اتقیا تو درکنار عام مومنوں کی شمولیت بھی جائز نہیں ہے اور ان امور کے بدعت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ محمد امیر باز خان

⇦ اس کا ثبوت احادیث سے واضح ہے۔ عزیز حسن عفی عنہ

⇦ امور مذکورہ میں شامل ہونا ناجائز ہے، کیونکہ یہ امور منکرات سے ہیں۔ مشتاق احمد

(واللہ المعین)

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کی شرعی حیثیت

سوال:

علمائے دین ارشاد فرمائیں کہ ''یا رسول اللہ'' کہنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض علماء اس کے جواز میں بڑے بڑے دلائل پیش کرتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب:

ارباب علم پر مخفی نہیں کہ کسی کو ندا کرنا یعنی پکارنا اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ وہ شخص بالذات یا بالواسطہ اس پکار کو سنے۔ بالذات یہ کہ اپنے کان سے سنے یعنی وہاں پر حاضر ہو اور بالواسطہ یہ کہ خط میں لکھے اور وہ خط اس شخص کو پہنچے یا کسی کی معرفت سنے، جیسا کہ عرف میں ہے کہ خطوط میں مخاطب کو ندا کرتے ہیں اور جو شخص نہ حاضر ہو نہ بواسطہ خط اور نہ کسی معرفت اس کو خبر دی جائے۔ ایسے شخص کو اگر کوئی پکارے تو ماسوا احمق کے اسے کیا کہا جاسکتا ہے۔ جیسے کوئی شخص دہلی میں رہ کر اس شخص کو پکارے جو لکھنؤ میں ہے کہ ''اے فلاں'' تو لوگ اسے سوائے دیوانے کے اور کیا کہیں گے۔

سو ندا کرنا یعنی ''یا فلاں'' کہنے کے لئے ضروری ہے کہ یا وہ شخص خود اپنے کانوں سے سنتا ہو یا بذریعہ خط، یا کسی شخص کی معرفت اسے اس پکار کی خبر ہو ورنہ ندا صحیح نہیں ہے۔ کما لایخفی۔

علم غیب صرف اللہ کی صفت ہے:

تو ''یارسول اللہ'' کہنا جب ہی درست ہوسکتا ہے کہ یہ امر ثابت ہو کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں اور ان کو غیب کی خبر ہے یا کوئی شخص ان کو اس پکار کی خبر دیتا ہے اور ان دونوں باتوں میں سے ایک بات بھی ثابت نہیں ہے، بلکہ بالکل

غلط ہے۔ اول اس لئے کہ ہر جگہ سے سننا اور غیب کی باتیں جاننا سوائے اللہ کے اور کسی کی صفت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ماسوا اللہ کے دوسرے میں بھی یہ صفت ثابت کرے تو وہ قطعی مشرک ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ......الآیۃ (انعام:۵۹)

''اور غیب کی کنجیاں اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں اور بجز اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہیں اور جو کچھ دریاؤں میں ہیں۔''

اور فرمایا:

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ...... (انعام:۵۰)

''آپ کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔

مزید اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ......الآیۃ (اعراف:۱۸۸)[1]

''آپ فرما دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا، مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ نے چاہا ہو

[1] (۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت کا لگنا اور آپ کا پریشان رہنا (۲) سیدنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہار گم ہونا (۳) ان صحابہ کرامؓ کا قتل کر دیا جانا جن کو دعوتِ اسلام کیلئے بھیجا گیا تھا۔ (۴) قیامت کے بارے میں آپ ﷺ سے سوال کیا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا اللہ ہی جانتا ہے کہ کب قائم ہوگی۔ (۵) طائف اور جنگِ اُحد میں آپ کا زخمی ہونا۔ (۶) انشاء اللہ نہ کہنے کی وجہ سے وحی کا کچھ دن بند رہنا...... اگر آپ ﷺ صاحبِ غیب تھے، ان واقعات کا کیا معنی ہے؟ [جاوید]

اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔"

اور اللہ تعالیٰ اپنے تئیں مدح فرماتا ہے جو اختصاص پر دلالت کرتا ہے ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا......الآية (مجادلہ:۷)

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز سے واقف ہے، تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی، مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ کی مگر ان کا چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کی اور نہ زیادہ کی مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالمِ غیب نہیں:

اور اس مضمون میں بیسیوں آیات و احادیث وارد ہیں کہ ہر جگہ سے سننا اور غیب جاننا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ کسی دوسرے کو اس کی مجال ہی نہیں اور تمام علماء اور اہل سنت اس کو تسلیم کرتے ہیں اور تمام کتب دینیہ اس مضمون سے بھری پڑی ہیں۔ میں کہاں تک نقل کروں کہ یہ مشتے نمونہ از خروار (ڈھیر سے ایک نمونہ) ہے۔

منجملہ ان احادیث کے ایک حدیث کوثر ہے کہ بعض طالبین آبِ کوثر پر وارد ہوں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے، ان کو آنے دو یہ میرے اصحاب ہیں۔ تب فرشتے کہیں گے۔ "لَا تَدْرِيْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ" آپ نہیں جانتے، انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا ہے۔ تو آپ ہی فرمائیں گے "سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِيْ" اللہ کی رحمت سے دوری ہو، دوری ہو جس شخص نے میرے بعد تبدیلی کی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ کو علم غیب نہیں ہے، ورنہ ان کے "محدثات" (نئی ایجاد کردہ چیزوں) کو جان لیتے۔

اور دوسرا امر بھی کہیں ثابت نہیں ہے کہ: جو کوئی "یا رسول اللہ" کہتا ہے تو اس

کی یہ پکار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی جاتی ہے، جو کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے وہ ثبوت مہیا کرے۔ حدیث میں سینکڑوں جگہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ''میں غیب نہیں جانتا'' پھر ''یا رسول اللہ'' کہنا صریح شرک نہیں تو اور کیا ہے، جو اس کے جواز کا مدعی ہے اسے لازم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یا صحابہ کرامؓ سے ثابت کرے ورنہ بے دھڑک دین میں کوئی بات نہ کرے اور جاہلوں کو گمراہ نہ کرے۔ نعوذ باللہ منہا

''یا رسول اللہ'' کہنے والوں کے دلائل اور ان کا رد:

اب ان کٹ ملاؤں کے وہ دلائل ذکر کرتا ہوں جن سے وہ ''یا رسول اللہ'' کہنا درست بتاتے ہیں پھر اس کا شافی جواب بیان کروں گا۔

پہلی دلیل:

یہ کہ قرآن میں ندا ہے۔

جواب:

وہ تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو پکارتا ہے۔ اور اس پکار کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بواسطہ جبرائیلؑ کے ہوتی تھی کیونکہ قرآن حضرت جبرائیل علیہ السلام لے کر آتے تھے اور مسلمان جو پڑھتے ہیں وہ اللہ کا کلام نقل کرتے ہیں، خود مسلمان ندا نہیں کرتے کہ یہ استدلال ممکن ہو، جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کا خط پڑھے تو جو اس خط کا مضمون ہوگا وہ پڑھنے والے کا نہیں بلکہ خط لکھنے والے کا ہوگا پھر اس سے دلیل پکڑنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

دوسری دلیل:

ہم التحیات میں پڑھتے ہیں۔ السلام علیک ایھا النبی۔ یہ ندا نہیں تو اور کیا ہے

جواب:

اس کا جواب بھی وہی ہے کہ یہ بھی کلام، اللہ تعالیٰ کا ہے جو آنحضرت ﷺ کو معراج

میں خطاب کر کے فرمایا تھا۔ مسلمان اسی کی نقل کرتے ہیں، چنانچہ حدیث معراج میں مفصلاً مذکور ہے۔ غرضیکہ کہیں حدیث یا فقہ میں موجود ہو کہ یارسول اللہ کہنا جائز ہے تو ایسا کہنے والا کتب معتبرہ سے دلیل لائے یا پھر عقیدۂ فاسدہ سے رُک جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

⇦ قد حمقہ العبد المساکین محمد یٰسین الرحیم آبادی عفی عنہ

⇦ الجواب صحیح۔ فقیر محمد حسین

⇦ الجواب صحیح۔ ابوالقاسم محمد عبدالرحمٰن تغمدہٗ اللہ تعالیٰ بالغفران

⇦ صورتِ مسئولہ میں معلوم کرنا چاہئے کہ ہر فرد بشر پر یہ لازم ہے کہ تمام افعال و اقوال میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرامؓ کی اتباع کرے اور یہ بھی واضح ہوا کہ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ان جملہ امور میں جو آپ نے کئے ہیں لازم ہے ویسے ہی ان میں بھی لازم ہے جو افعال و اقوال آپ نے نہ تو کئے اور نہ فرمائے اور نہ ہی صحابہ کرامؓ میں بطور درود و وظیفہ کے کسی کو سکھلائے ہوں، کما افادالشیخ /عبدالحق الحقی المحدث الدہلوی۔ اور یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ جس قدر صحابہ کرامؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی کسی شخص کو نہ ہوئی ہوگی، کیونکہ حضرات صحابہ فرماتے ہیں کہ:

لَمْ يَكُنْ شَخْصٌ اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانُوْا اِذَا رَاَوْهُ لَمْ يَقُوْمُوْا لِمَا يَعْلَمُوْنَ مِنْ كَرَاهَتِهٖ لِذٰلِكَ۔ کذافی المشکاۃ وھذا حدیث حسن صحیح۔ (ترمذی احمد شاکر ۵/۴۰، مصابیح السنۃ ۳/۲۸۶)

”کوئی شخص بھی انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر محبوب نہ تھا، اور جب وہ آپ ﷺ کو دیکھتے تھے کھڑے نہ ہوتے تھے، کیونکہ وہ اسمیں آپ کی کراہت کو جانتے تھے۔“

اور یارسول اللہ کہنا نہ صحابہ نہ تابعین نہ تبع تابعین اور نہ ہی چاروں اماموں سے کہنا ثابت ہے اور جو کام قرونِ ثلاثہ میں مروج نہ تھا وہ بدعت ہے اور اس کام کا

کرنے والا گمراہ ہے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے: کہ

مَنْ اَحْدَثَ فِي اَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَرَدٌّ۔(كذافي البخاری و مسلم وغيرهما من كتب الحديث) (بخاری ۳۰۱/۵، مسلم ۱۳۴۴/۳)

''جس نے ہمارے اس (دین) کے معاملہ میں کوئی نیا طریقہ ایجاد کیا جو اس میں نہ ہو وہ مردود ہے۔''

تو لامحالہ غیر اللہ کو خواہ رسول ہو یا ولی ہو یا شہید، مردہ ہو یا زندہ غائبانہ پکارنا ہرگز ہرگز درست نہیں، جو ایسا کرے وہ گمراہ ہے۔

تمام مومنین کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ بھائیو! درود شریف کثرت سے پڑھا کرو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جو ایک بار مجھ پر درود شریف پڑھتا ہے اس پر اللہ کی دس بار رحمت ہوتی ہے۔ یارسول اللہ کہنے میں اللہ و رسول ہرگز راضی نہیں ہوتے۔

حررہ عاجز/ ابو محمد عبدالوہاب الفنجابی۔

اسمائے گرامی مؤیدین علماء کرام:

- محمد طاہر ۱۳۰۴ھ
- سید محمد عبدالسلام ۱۲۹۹ھ
- ابو محمد عبدالحق ۱۳۰۵ھ
- محمد یوسف ۱۳۰۳ھ
- خادم شریعت رسول الاداب ۱۳۰۰ھ ابو محمد عبدالوہاب
- عبدالرؤف ۱۳۰۳ھ
- جواب ھذا صحیح ہے۔ حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ

(واللہ المستعان)

انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگانا

سوال:

علمائے دین ومفتیان شرع متین ارشاد فرمائیں کہ: جب اذان میں ''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ'' یا خطبہ جمعہ میں ''اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صلی اللّٰه علیه وسلم وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صلی اللّٰه علیه وسلم'' کہا جاتا ہے تو اکثر لوگ انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ ایسا کرنا کیسا ہے؟ کیا کتب احادیث و فقہ یا اقوالِ ائمہ سے اس کا کوئی ثبوت پایا جاتا ہے یا نہیں؟ اور اگر اسکا کہیں سے جواز ثابت نہیں تو اس کے کرنے والے کیسے ہیں؟ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اس فعل سے آنکھ کی روشنی تیز ہوتی ہے اور اس کو فرمودۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے ہیں کیا یہ بات حدیث وفقہ میں کہیں موجود ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب:

وھو الموفق للصواب: صورت مرقومہ میں جان لیجئے کہ دنیا فانی ہے، چند روز کی زندگانی ہے مرنا برحق ہے، جہاں تک ہو سکے جمیع امور میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنی چاہیے، کیونکہ فلاح دارین اسی میں ہے اور اپنی طرف سے ہرگز کچھ ایجاد نہیں کرنا چاہیے۔ اگرچہ وہ عندالطبع مرغوب و مستحسن ہو، جیسا کہ یہی امر لیجئے، یعنی تقبیل ابہام وغیرہ، جاہل عوام کالانعام بلکہ بعض خواص کے نزدیک بھی بہتر واحسن شمار کیا جاتا ہے، حالانکہ عندالتاذین یا عندقول الخطیب ''اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صلی اللّٰه علیه وسلم......الخ انگوٹھوں وغیرہ کا چومنا صحابہ کرام نے

نہیں کیا باوجودیکہ ''اَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ شَخْصٌ اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِنْهُ'' یعنی ان صحابہ کرامؓ کے نزدیک کوئی شخصیت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھکر محبوب نہ تھی۔ (الحدیث) اور نہ ہی ائمہ اربعہ میں سے کسی امام نے یہ عمل کیا ہے اور جو فعل نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اور نہ ہی صحابہ کرامؓ سے اور نہ ائمہ اربعہ میں سے تو وہ کام بدعت اور مردود ہوتا ہے۔

انگوٹھے چومنا بدعت ہے:

قال الامام الجلیُ السّیوطیّ الاحادیث الّتی رویت فی تقبیل الانامل و جعلها علی العینین عند سماع اسمه صلی اللّٰه علیه وسلم عن المؤذّن فی کلمة الشّهادة کلّها موضوعات، انتهی ما فی الرسالة المسماة بتیسیر المقال للامام الکبیر الشیخ/جلال الدین السیوطی،

(موضوعات کبریٰ ۳۱۶/۳۱۵ طبع سانگلہ ہل)

''امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ: وہ احادیث جو کہ مؤذن کے کلمہ شہادت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں پر لگانے سے متعلق ہیں وہ تمام تر موضوع ہیں۔

(تیسیر المقال للسیوطی)[1]

شاہ عبدالعزیزؒ اور دوسرے کبائر علماء کے اقوال:

ماہرین فن لکھتے چلے آرہے ہیں کہ یہ احادیث بے اصل ہیں اور پایۂ صحت کو

[1] ردالمختار ۲۹۳/۱، کس قدر ظلم ہے کہ بعض الناس اپنی قدیم کتب کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے جن کی آج یہ تقلید کرتے ہیں انہوں نے دلائل سے رد کیا ہے، جیسے درمختار میں ہے کہ وَلاَ یشتغل بغیر الاجابة۔ ینبغی للسامع ان لا یتکلم ولا یشتغل بشیءٍ فی حالة الاذان والا قامة۔ اذان واقامت سننے والا سوائے جواب دینے کے نہ زبان سے کوئی کلمہ نکالے اور نہ ہاتھ سے کوئی کام کرے۔ (درمختار ۲۹۳/۱) ردالمختار میں علامہ شامی نے نقل کیا ہے کہ لم یصح فی المرفوع من کل هذا شیءٌ ۱۹۳/۱، تمیز الطیب ص۱۸۹ المقاصد الحسنہ ص۴۵۰، کشف الخفاء ج۲ ص۲۰۶۔ جاوید

نہیں پہنچتیں۔ جیسا کہ الشیخ ابن طاہر الحنفی، ملا علی قاریؒ، محدث شیخ شوکانیؒ اور ان کے علاوہ دیگر علماء نے اپنی ان مشہور کتابوں میں ذکر کیا ہے جو ان کی طرف منسوب ہیں۔ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اپنے فتوی تقبیل العینین میں فرماتے ہیں کہ جو شخص اس فعل کو سنت سمجھ کر کرے وہ مبتدع اور اس کا یہ عمل بدعت ہے۔ اور بہت سے علمائے ماہرین اس فعل کو بدعت کہتے ہیں بہ اندیشۂ طوالت ان کا ذکر ترک کر رہا ہوں۔ اور مولانا الشیخ یعقوب حسرخی نے خیر الجاری شرح صحیح بخاری میں اس فعل کو صاف صاف بدعت لکھا ہے۔ الغرض یہ فعل ہرگز درست نہیں ہے بلکہ بدعت ہے۔

میں کہتا ہوں:

ان مسلمان دینداروں پر افسوس صد افسوس ہے کہ جو تعلیم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ یہ کلمات اذان کے وقت یا اس کے بعد کہا کرو اس کو تو ترک کر دیا اور اپنی طرف سے بہت سی باتیں ایجاد کر لیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: جیسا مؤذن کہتا ہے ویسا ہی کہو، تمام قسم کے صغیرہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اذان ختم ہونے کے بعد درود شریف اور یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدَ نِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُوْدَ نِ الَّذِيْ وَعَدْتَهٗ۔ (بخاری)

"اے اللہ! اے اس مکمل دعوت اور قائم رہنے والی نماز کے رب، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مقام وسیلہ[1] اور فضیلت عطا کیجئے، اور انہیں (شفاعت کے) اس "مقام محمود" پر سرفراز فرمایئے جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے"۔

یہاں تک ہی یہ دعا پڑھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش اس کے لئے واجب ہوگی۔ اور بعض لوگ "وَعَدْتَهٗ" کے بعد اور بھی چند کلمات پڑھتے ہیں وہ درست

---

[1] "وسیلہ" جنت کے ایک درجہ کا نام ہے (مشکاۃ) [2] فتح الباری ۲/۹۴ مصابیح السنۃ ۱/۲۷

وثابت نہیں ہیں، کیونکہ وہ کسی صحیح حدیث شریف میں نہیں آئے[1]

اذان کے بعد ''محمد رسول اللہ'' کا اضافہ کرنا:

اور بعض لوگ اذان کے بعد '' لَاۤاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کیساتھ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کا اضافہ کرتے ہیں یہ بھی درست نہیں ہے۔ اگرچہ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' قرآن کریم (وحدیث) وغیرہ میں موجود ہے لیکن خاص اس موقع پر شارع سے ثابت نہیں ہے اور جو امر شارع سے ثابت ہو وہی کرنا چاہئے۔ اپنی طرف سے ایجاد کر لینا بہت مذموم عمل ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں منقول ہے کہ: جب کوئی چھینک لے تو ''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ'' کہے اور سننے والا ''يَرْحَمُكَ اللّٰهُ''، یہ شارع کا حکم تھا۔ تو صحابہ کرامؓ کے وقت ایک شخص نے چھینکنے کے بعد ''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کہا۔ حضرت سالمؒ نے فرمایا ''وَ عَلَيْكَ وَ عَلٰى اُمِّكَ'' یعنی تم پر اور تمہاری ماں پر سلام ہو، تو وہ شخص کچھ خفا سا ہو گیا۔ حضرت سالمؒ نے فرمایا کہ: بھائی خفا کیوں ہوتے ہو، میں نے کوئی بے جا کلمہ تو نہیں کہا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے کہا تھا جیسا کہ تم نے چھینک لینے کے بعد کہا ہے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی جواب دیا تھا جیسا کہ میں نے! اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مقام سلام کہنے کا نہیں ہے۔ (هكذا في الترمذي وابي داؤد والمشكاة وغيرها من كتب الحديث۔ مسلم ۱/۳۸۱۔ مصابیح السنہ ۱/۳۶۳)

---

[1] اذان کے بعد یہ دعا پڑھنا بھی سنت سے ثابت ہے جسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص موذن (کی اذان) سن کر یہ دعا پڑھے تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا۔ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں، تحقیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں اللہ کے رب ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوں۔'' (مسلم ۱/۲۹۰۔ مشکوۃ البانی ۱/۲۰۹، مصابیح السنہ ۱/۲۷۳)۔ جاوید

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص نے چھینک لی اور اس کے بعد "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ" کہا۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ: تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور درود رسول اللہ پر ہیں، لیکن یہ مقام درود وغیرہ کا نہیں ہے، جس طرح آپ ﷺ نے ہمیں تعلیم دی ہے (یعنی الحمد للہ کہنے کی) ویسا ہی کرو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس موقع پر اول الذکر کلمہ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ) کہنے کی تعلیم نہیں دی ہے۔ (کذافی المشکاۃ للالبانی ۱/۳۱۳)

اب ارباب فطانت پر مخفی نہیں ہے کہ معاذ اللہ "محمد رسول اللہ" کا ذرہ بھی انکار نہیں ہے، لیکن عرض یہ ہے کہ یہ اس کا موقع ومحل نہیں ہے۔ اس موقع پر جو اذکار و ادعیہ ہیں انہیں کو پڑھنا چاہئے۔ نیز شیخ عبدالحق حنفی دہلوی نے بھی یہی لکھا ہے کہ "محمد رسول اللہ" کا یہ محل وموقع نہیں ہے اور اسکا کہنا نا درست ہے۔ (کذافی اشعۃ اللمعات شرح مشکاۃ للشیخ عبدالحق حنفی دہلوی) انتہی ۱/۳۸۰

آذان کے جواب کا مسنون طریقہ:

آذان سے متعلق مسنون طریقہ سمجھ لینا چاہئے۔ اولاً مؤذن جب "اللہ اکبر" کہے تو سننے والا بھی اسی طرح کہے اور جب مؤذن "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کہے تو وہ بھی جواب میں یہی کہے، اور جب مؤذن "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کہے تو سننے والا بھی "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کہے اور انگوٹھے وغیرہ نہ چومے کیونکہ یہ بدعت ہے، کمامر، اور مؤذن "حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ" کہے تو سننے والا "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کہے اور جب "حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ" کہے تو سننے والا "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ"[1] کہے۔ جبکہ بعض لوگ ان دو کلموں یعنی "حَيَّ عَلَى

---

[1] مؤلف کو یہاں سہو ہوگیا ہے جبکہ "حی علی الصلوۃ" اور "حی علی الفلاح" دونوں کے جواب میں "لا حول ولا قوۃ الا باللہ" کہنا ہی ثابت ہے۔ (بخاری ومسلم) اور "العلی العظیم" کے کلمات کا اضافہ ←

اَلْفَلَاح" کو سن کر "**مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَالَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ**" (جو اللہ تعالیٰ نے چاہا سو ہوگیا اور جو کچھ نہ چاہا وہ نہ ہوا) کہتے ہیں، یہ کہنا نادرست اور بے اصل ہے (ھکذا فی شرح الشیخ /عبدالحق حنفی الدہلوی[۱]) اور جب مؤذن "اللّٰہ اکبر" کہے تو سننے والا بھی "اللّٰہ اکبر" کہے اور جب وہ "**لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ**" کہے تو سنے والا بھی صرف "**لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ**" کہے اور "**مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ**" کو ساتھ نہ ملائے کیونکہ یہ اس کے کہنے کا مقام نہیں ہے، بلکہ یہاں ایسا کہنا بدعت ہے۔

افسوس جہالت نے ایسا زور پکڑا ہے کہ جو حق بات ہے وہ ناحق اور باطل شمار کی جاتی ہے اور جو بات باطل اور بے اصل ہے وہ مروج اور دائرہ حق میں شمار کی جاتی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ہے کہ: جب سنت کی جگہ بدعت اور بے اصل بات قائم کی جائے تو سنت تو نیست و نابود ہوجاتی ہے اور بے اصل بات محکم اور مضبوط ہوجاتی ہے۔ (مشکاۃ) حقیقت میں یہی حال ہے کہ سنت متروک اور بدعت رواج پا رہی ہے۔

اقامت کے جواب کا مسنون طریقہ:

اقامت کا جواب بھی ویسا ہی دیا جائے جیسا کہ اذان میں مذکور ہوا۔ البتہ مؤذن جب (فجر کی اذان میں) "**اَلصَّلاَةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ**"[۲] کہے تو سننے والا بھی "**اَلصَّلاَةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ**" ہی کہے اور "**صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ**" وغیرہ نہ کہے، تاہم اقامت

⇦ مسند احمد بن حنبل اور نہ ہی سنن نسائی میں ثابت ہے بلکہ یہ منکر اور باطل اضافہ ہے جو کہ صحیح احادیث کے مخالف ہے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: مشکوۃ المصابیح تحقیق البانی حدیث ۶۷۵ [خلیق]

[۱] اشعۃ اللمعات ص ۱/۳۸۱۔ [۲] عام طور پر معروف ہے کہ "**اَلصَّلاَةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ**" کے الفاظ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اذان میں داخل کیے تھے۔ یہ بات سراسر غلط ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو جو اذان سکھائی تھی اس میں یہ الفاظ منقول ہیں: ان كان في صلاة الصبح قلت الصلوة خير من النوم۔ (ابوداؤد ۱/۳۴۰، نسائی ۲/۷، مصابیح السنۃ ۱/۲۶۹)

میں جب "قَدْقَامَتِ الصَّلٰوۃُ" کہا جائے تو سننے والا "اَقَامَھَا اللّٰہُ وَ اَدَامَھَا"[1] کے علاوہ کچھ نہ کہے کیونکہ اس کے علاوہ کا ثبوت حدیث میں موجود نہیں ہے۔

مؤذن کے جواب سے فارغ ہوکر درود شریف اور مذکورہ بالا دعا پڑھے نیز اپنے یا غیر کے لئے جو دعا مانگے قبول ہوگی یہ مسنون طریقہ ہے، باقی بدعت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

حررہ العاجز ابو محمد عبدالوھاب الفنجابی الجھنگوی ثم الملتانی نزیل الدہلی، تجاوز اللہ عن ذنبہ الخفی والجلی فی اواخر شہر اللہ المحرم ۱۳۰۶ھ

اسمائے گرامی مؤیدین علمائے کرام:

- سید محمد عبدالسلام غفرلہ ۱۲۹۹ھ
- خادم شریعت رسول الاداب ابومحمد عبدالوھاب ۱۳۰۰ھ
- عبدالجبار بن عبدالعلی ۱۳۰۰ھ حیدر آبادی
- عبدالرؤف ۱۳۰۳ھ
- ابومحمد عبدالحق لودھیانوی ۱۳۰۵ھ
- جواب صحیح ہے۔ نمقہ محمد یٰسین الرحیم آبادی العظیم آبادی، عفی عنہ
- جواب صحیح ہے۔ حررہ العاجز محمد فقیر اللہ الفنجابی
- جواب ہذا صحیح ہے۔ حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ
- اور بعض (لوگ) آذان کے بعد دعا میں "اَلدَّرَجَۃَ الرَّفِیْعَۃَ" اور "اَلصَّلٰوۃُ

---

[1] تکبیر کے دوران یا بعد میں "اقامھا اللہ و ادامھا" کہنے والی ابوداؤدؒ کی یہ حدیث کو امام نوویؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے ضعیف کہا ہے۔ لہٰذا "قد قامت الصلوۃ" کے جواب میں "قد قامت الصلوۃ" کے الفاظ ہی کہے جائیں۔ باقی کلمات کا جواب عموم حدیث اذان پر عمل کرتے ہوئے دیا جائے۔
مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: مشکوۃ المصابیح تحقیق البانی حدیث ۶۷۰...... [خلیق]

خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" کے جواب میں "صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ وَ بِالْحَقِّ نَطَقْتَ" کہتے ہیں اس کی بھی کوئی اصل نہیں، بلکہ جواب میں بھی ویسا ہی کہنا چاہیے جیسا کہ مؤذن کہتا ہے، مگر جہاں تصریح ہو وہاں ویسا ہی کہے اپنی طرف سے کچھ ایجاد کر کے اضافہ نہ کیا جائے۔

محمد طاہر سلہٹی ۱۳۰۴ھ

محمد یوسف ۱۳۰۳ھ

(واللہ المستعان)

نابالغہ کی ولایت کا حکم

سوال:

علمائے دین ارشاد فرمائیں کہ ایک نابالغہ لڑکی کے دو ولی ہیں، ایک اقرب یعنی باپ اور دوسرا ابعد۔ اور ولی ابعد ہمیشہ اس لڑکی کی خبر گیری کرتا رہا اور ہر طرح سے سلوک و پرورش کی اور نہایت شفقت سے رکھا اور وہ دیندار و عاقل بھی ہے جبکہ ولی اقرب نے کبھی اس سے سروکار نہیں رکھا اور نہ ہی کبھی اس کی خبر گیری کی بلکہ جہاں اس پر کبھی دستِ شفقت نہیں رکھا وہاں فاسق و بے ہودہ بھی ہے۔

اب ولی ابعد اس کا ایک جگہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو ولی اقرب مانع ہے جس میں سراسر لڑکی کا نقصان متصور ہے، کیا اس کا منع کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس کی اجازت کے بغیر ولی ابعد اس کا نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب:

جان لیجئے کہ شرع میں ولایت کی بنیاد صغیرین کی خیر خواہی و شفقت اور ولی کی عقل پر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صغیرین کی عقل ناقص و غیر تام ہوتی ہے۔ اگر ان کو تصرفات کا اختیار حاصل ہو تو وہ اپنی بے عقلی کے سبب اپنا بہت نقصان کر لیں۔ اس لئے ان کو تمام قسم کے تصرفاتِ جانی و مالی جیسے نکاح و بیع اور ہبہ وغیرہ سے شارع نے روک دیا ہے اور ان کی باگ ایک شخص کے ہاتھ میں دی ہے جو ان کا سب سے زیادہ خیر خواہ اور مشفق و عاقل ہے، تاکہ ان کے حق میں اپنی فہم کے مطابق بہتر معاملہ کرے اور ضرر سے محفوظ رکھے۔ اس میں سراسر لحاظ صغیرین کی بہبود کا رکھا گیا ہے اس

سبب سے جو شخص اگر چہ بالغ لیکن مسرف واحمق اور بے عقل ہو تو اس کو بھی شارع نے اسی مآل اندیشی کے لحاظ سے جو صغیرین میں ملحوظ رکھی ہے تمام تصرفات سے منع کر دیا ہے۔ ہدایہ میں ہے:

باب الحجر للفساد: قال ابو حنيفةؒ لايحجر على العاقل البالغ السفيه و تصرّفه في ماله جائز و ان كان مبذّرا مفسدا يتلف ماله فيما لا غرض به فيه ولا مصلحة- وقالا ابو يوسف و محمّد و هو قول الشّافعي يحجر على السّفيه و يمنع من التّصرّف في ماله لانّه مبذّر ماله بصرفه لا على الوجه الّذى يقتضيه العقل فيحجر عليه نظرا له اعتبارا بالصّبي بل اولى لأنّ الثّابت في حقّ الصّبي احتمال التّبذير و في حقّه حقيقة و لهذا منع عنه المال- (هدايه ۳/۳۵۳)

''فساد کے باعث تصرفات سے روکنے کا باب...... امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ: عاقل بالغ نادان کو روکا نہیں جائے گا اور اس کا مال میں تصرف جائز ہے۔ اگر چہ وہ مسرف، مفسد اور اپنے مال کو بلاغرض و مصلحت تلف کرنے والا ہو اور امام ابو یوسفؒ و محمدؒ اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ: نادان کو اپنے مال میں تصرف سے روکا جائے گا اس لئے کہ وہ اپنے مال میں اسراف کرنے والا ہے اور اس میں عقلمندانہ تصرف نہیں کرے گا۔ سو ان باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اور بچے کا اعتبار کرتے ہوئے اسے تصرفات مالی سے روک دیا جائے گا بلکہ اسے روکنا زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ بچے کے متعلق تو اسراف کا احتمال ہے جبکہ اس کے بارے میں اسراف یقینی امر ہے جس کے باعث اسے روک دیا جائے گا۔''

ولی کی تعریف اور اس کی صفات:

اور اس کا نام ولی رکھا، کیونکہ ولی لغت میں دوست و خیر خواہ کو کہتے ہیں، چنانچہ تسمیہ میں بھی مقصود کا خیال رکھا گیا ہے جیسا کہ ہدایہ[1] میں ہے:

باب الولیّ: وھو لغۃ: خلاف العدوّ، وشرعا: البالغ العاقل الوارث- کذا فی درالمختار ملخصا- ولنا ما ذکرنا من تحقق الحاجۃ وو فور الشّفقۃ-

"ولی لغت میں، دشمن کے برعکس بولا جاتا ہے اور شرع میں: بالغ، عاقل اور وارث کے لئے۔" (درمختار)[2]

اور اس وجہ سے غیر عاقل کی بجائے عاقل کو ولی بنایا گیا ہے جیسا کہ درمختار کی عبارت سے ظاہر ہے، **کما لا یخفی علی الماھر بالشریعۃ**۔ اسی لئے ولی کو صرف ان تصرفات کا اختیار ہے جن میں صغیرین کا نفع متصور ہو اور جن میں صغیرین کا سراسر ضرر ہو اس سے ولی کو منع کیا اور اجازت نہیں دی، جیسا کہ صغیرین کے مال کو عاریتاً دینا یا ہبہ کرنا یا اس کے مال سے اپنے ہبہ کا عوض لینا جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

لانّہ یملک علیہ الدائربین النّافع والضّار فاولی ان یملک النّافع-[3]

"اس لئے کہ وہ نفع و نقصان کرنے والی اشیاء کے مابین گردش کرنے والی چیز کا مالک ہے۔ دونوں کا احتمال ہے، سو بہتر ہوگا کہ وہ نفع دینے والے تصرفات کا مالک ہو۔"

اور درمختار شرح تنویر الابصار میں ہے:

ولیس للاب اعارۃ مال طفلہ لعدم البدل-

"باپ کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کا مال ادھار لے کہ اس

---

[1] درالمختار ۲/۱۴۳ [2] درالمختار ۲/۱۴۳ [3] ہدایہ ۴/۲۷۱

کا بدل نہیں ہے۔"

مزید درمختار ہی میں ہے:

لا يجوز للأب أن يعوض عمّا وهب للصّغير من ماله۔[1]

"باپ کے لئے جائز نہیں کہ بچے کے مال سے عوض لے اس کے باعث اس نے جو اسے ہبہ کیا تھا۔"

اسی وجہ سے جب ولی خائن، مفسد اور نقصان کرنے والا ہو۔ یعنی اس کی ولایت میں صغیرین کی حق تلفی کا امکان ہو، اگرچہ وہ باپ ہی ہو تو وہ ولی نہیں رہے گا اسے ولایت سے موقوف کر دیا جائے گا:

الاب ولیّ اشفق مالم یکن مفسدا أو خائنا منهكا۔ (فتاویٰ غیاثیہ)[2]

"باپ مشفق ولی ہوتا ہے، جبکہ وہ مفسد، خائن اور تلف کرنیوالا نہ ہو۔"

کیونکہ ولایت کی غرض مفقود ہو گئی۔ کما مر سابقا، اور اس سبب سے ولایت میں قرب قرابت کا لحاظ رکھا جو کہ ازروئے قرابت صغیرین کے سب سے قریب ہو اس کو ولی بنایا پھر اقرب فالا قرب، کیونکہ اقرب میں باعتبار ابعد کے زیادہ شفقت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ عبارت ذیل سے ظاہر ہے:

والتّرتيب في العصبات في ولاية النكاح كالتّرتيب في الارث فالابعد محجوب بالاقرب۔ (هدايه ۲/ ۳۱۶)[3]

"ولایت نکاح میں عصبات کی ترتیب وراثت میں ترتیب کی مانند ہے، سو قریب والا دور والے کے لئے حاجب ہوگا۔"

خلاصۂ کلام:

خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ جس کو زیادہ شفقت ہو وہی ولی ہوگا ولایت کی بنیاد شفقت ہے، جس میں شفقت کم ہے وہ اسکے مقابلہ میں جس کی شفقت کامل ہے ولی

---

[1]   [2]   [3] ہدایہ ۲/۳۶۱

نہیں بن سکتا۔ اسی وجہ سے بھائی وغیرہ کی ولایت لازم نہیں، کیونکہ اس کی شفقت قاصر ہے جیسا کہ عبارت ذیل سے عیاں ہے:

ولهما انّ قرابة الأخ ناقصة والنّقصان يشعر بقصور الشّفقة ليتطرّق الخلل الى المقاصد۔(هدايه)[1]

"اور دونوں کے نزدیک بھائی کی قرابت ناقص ہے اور نقصان کی خبر شفقت کی کمی سے ہوتی ہے تاکہ خلل مقاصد تک پہنچ سکے۔"

سو جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ولایت کی اساس شفقت اور صغیرین کے فائدہ پر منحصر ہے۔ کمالا یخفی علی من له ادنی درایة......

تو میں کہتا ہوں:

کہ صورتِ مسئولہ میں ولی اقرب کی عدم شفقت اور ولی ابعد کی شفقت کالشمس فی نصف النہار واضح ولائح ہے کیونکہ اگر اس کو تھوڑی سی شفقت و محبت ہوتی تو وہ کبھی کبھار نابالغوں کی خیر گیری ضرور کرتا اور بالکل بے سروکار نہ رہتا۔ اس کا اس طرح بے تعلق رہنا صراحۃً عدمِ شفقت پر دال ہے۔ کمالا یخفی من له ادنی تامل۔ اور نابالغہ کا ضرر بھی اس کی ولایت میں متصور ہے۔ جیسا کہ سوال سے ظاہر ہے اور حالانکہ ولایت سے مقصود صغیرین کا فائدہ ہے نہ کہ ضرر، کما مر مفصلاً مدللاً۔ پس وہ اقرب ولی کیونکر بن سکتا ہے۔ کما لا یخفی علی من فقهه الله فی الدین، نیز وہ فاسق بھی ہے۔ اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

غاب الوليّ اوعضل اوكان الأب والجدّفاسقا[2] فللقاضي ان يزوّجها من كفؤ-(كذا فى الوجيز الكرورى)

"کہ ولی غائب ہوگیا یا علیحدہ ہوگیا یا باپ دادا دونوں فاسق ہیں تو

---

[1] ہدایہ ۲/۳۲۸ (لاہور) [2] [فتاویٰ عالمگیری (عربی) ۱/۲۸۵، اردو ۲/۱۵۹]

قاضی کو حق حاصل ہے کہ اس عورت کا کفو (مساوی) سے نکاح
کردے"

واللہ اعلم بالصواب۔ قد حررہ العاجز المھین محمد یٰسین الرحیم آبادی ثم
العظیم آبادی

اسمائے گرامی مؤیدین علمائے کرام:

⇦ الجواب صحیح۔ کتبہ ابو محمد عبدالرحمٰن الفنجابی

⇦ محمد یوسف ۱۳۰۳ھ

⇦ عبدالرؤف ۱۳۰۳ھ

⇦ ابو محمد عبدالحق ۱۳۰۵ھ

⇦ سید محمد عبدالسلام غفر لہ ۱۲۹۹ھ

⇦ خادم شریعت رسول الاداب ابو محمد عبدالوھاب

⇦ محمد طاہر سلہٹی ۱۳۰۴ھ

⇦ جواب ہذا صحیح ہے۔ حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ

⇦ الجواب صحیح۔ ابو القاسم محمد عبدالرحمٰن غفر لہ الرحمٰن

(واللہ المعین)

رفع الیدین کرنیوالے اور جوتا پہن کر نماز پڑھنے والے کو مسجد سے نکال دینا ثواب ہے یا گناہ!

(اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ)

(سوال و جواب: حق جو حق گو)

سوال:

رفع الیدین کرنے والے اور پاک جوتے پہن کر نماز پڑھنے والے کو اپنی مسجد میں نماز نہ پڑھنے دینا اور مسجد سے نکال دینا، سلام و کلام ترک کر دینا اور برادری سے الگ کر دینا کتنا بڑا ثواب یا گناہ ہے؟

جواب:

مسجد میں نماز پڑھنے سے روکنا چوری وغیرہ سے بھی بڑا جرم ہے:

رفع الیدین اور پاک جوتوں سے نماز پڑھنا کوئی ایسا شرعی جرم تو نہیں جو کہ متفقہ امور شرعیہ محرم میں سے ہو۔ جس کے ارتکاب سے مسجد سے نکالنے کا جواز فراہم ہو بلکہ مسجد میں نماز پڑھنے سے روکنا اتنا بڑا شرعی جرم ہے کہ چوری، زنا کاری اور حرام خوری وغیرہ گناہوں سے کئی درجہ بڑھ کر ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (البقرہ: ۱۱۴)

''اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے (یعنی اس سے بڑا ظالم کوئی

نہیں) جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کئے جانے کو روکے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے (یعنی نمازیوں کو روک کر جو کہ مسجدوں کے آباد کار ہیں) ایسے لوگوں کو خوف کھاتے ہوئے ہی ان میں جانا چاہئے تھا۔ ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔"

ہاں! اگر کوئی مسجد میں "صلاۃ غوثیہ" پڑھے یا "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" کا ذکر کرے یا "المدد یا شیخ فلانی" پکارے یا ایسا ہی کوئی اور شرک کا کام کرے یا کوئی فعل محرم مثل غیبت، گالی گلوچ اور بہتان تراشیوں کا سلسلہ شروع کرے تو البتہ مسجد سے نکالے جانے کا مستحق ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَ اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۝ (جن: ۱۸)

"اور بے شک مسجدیں اللہ کے لئے ہیں سو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔"

مسلمان سے ترکِ کلام پر وعید:

اور شرعی مسلمان بھائی سے بغیر کسی جرم کے سلام و کلام ترک کرنا بہت بڑا گناہ ہے جیسا کہ ابوداؤد اور مسند احمد کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ (رضی الله عنه) اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم قَالَ: لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ، فَمَنْ هَجَرَ فَوْقَ ثَلَاثٍ فَمَاتَ دَخَلَ النَّارَ ـ مشکاۃ۔

(فتح الباری ۱۰/۴۹۲، مسلم ۴/۱۹۸۴، مشکوۃ البانی ۱۳۹۹)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ (سلام و کلام) ترک کرے، سو جس نے تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھا اور مر گیا

دوزخ میں داخل ہوگا۔"

مزید ایک اور حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم : تُفْتَحُ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ، فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ لاَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلاَّ رَجُلاً كَانَتْ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ، فَيُقَالُ: اَنْظِرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا۔ (رواہ مسلم ۴/۱۹۸۴، مشکاۃ البانیؒ ۳/۳۸۳، کراچی طبع۔ ۴۲۷)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کے دروازے سوموار اور جمعرات کے روز کھولے جاتے ہیں اور ہر اس شخص کو بخش دیا جاتا ہے جو اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ مگر اس شخص کو (نہیں بخشا جاتا) جس شخص اور اس کے بھائی کے درمیان کینہ ہو، پھر کہا جاتا ہے کہ ان کو مہلت دو جب تک آپس میں صلح کرلیں۔"

اللہ اور رسول کے کسی حکم کو مکروہ جاننے والا کافر ہے:

رفع الیدین کرنا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور جو امرِ دینی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم میں داخل ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے حکم کو برا جانا وہ کافر ہوا اور اس کے سبب نیک عمل ضائع ہوگئے۔

اَلرّفع ثابت من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم و کلّ ماثبت من الرّسول صلی اللّٰه علیه وسلم فهو حکم اللّٰه و کلّ من کره حکم اللّٰه فهو کافر و کلّ من کره الرّفع فهو کافر۔

"رفع الیدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو تو وہ اللہ کا حکم ہے

اور ہر وہ شخص جو اللہ کے حکم کو ناپسند جانے تو وہ کافر ہے اور ہر وہ شخص جو رفع الیدین کو مکروہ جانے وہ بھی کافر ہے۔“

اس کا نتیجہ بھی ہوا کہ جس نے رفع الیدین کو برا جانا وہ کافر ہوا اور جب کافر ہوا تو اس کا نکاح بھی ٹوٹ گیا اور ہر سنت کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اسی طرح ہی سمجھو اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھ شخصوں[1] پر میں نے اللہ تعالیٰ نے، اور ہر پیغمبر مستجاب الدعوات نے لعنت کی ہے اور ان چھ میں سے ایک تارکِ سنت کو بھی شمار کیا ہے۔

ملا علی قاری حنفی نے اس حدیث کی شرح میں کہا ہے کہ تارکِ سنت سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اسے خفیف اور ہلکا سمجھ کر بے پرواہی سے ترک کرے وہ بے شک کافر وملعون ہے اور جو سستی سے ترک کرے اس پر تغلیظاً وتشدیداً لعنت فرمائی ہے۔ درمختار میں ہے:[2]

پھر میں نے مفتی ابو سعودؒ کی معروضات میں ایک سوال دیکھا، اس سوال کا

---

[1] اصل حدیث اس طرح ہے:

و عن عائشة رضی اللّٰہ عنہا قالت: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ستة لعنهم اللّٰہ و کل نبی یجاب، الزائد فی کتاب اللّٰہ والمکذب بقدر اللّٰہ والمتسلط بالجبروت لیعزّ من اذلّہُ اللّٰہ و یذل من اعزہ اللّٰہ والمستحل لحرمِ اللّٰہ والمستحلُّ من عِترلی ما حرم اللّٰہ و التارک لسنتی، رواہ البیهقی فی المدخل و رزین فی کتابہ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چھ قسم کے لوگوں پر میں نے لعنت کی اور اللہ نے بھی لعنت کی اور نبی کی دعا قبول ہوتی ہے۔ (۱) اللہ کی کتاب میں اضافہ (زیادتی) کرنے والا (۲) اور اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا (۳) جبر کے ذریعہ غلبہ پانے والا کہ جسے اللہ نے ذلیل کیا ہے وہ اسے عزت دے اور جسے اللہ نے عزت دی ہے وہ اسے ذلیل کرے (۴) اور اللہ کے حرام کو حلال سمجھنے والا (۵) اور وہ جو میری اولاد سے حلال سمجھے جو اللہ نے حرام کردیا ہے (۶) اور میری سنت کو چھوڑنے والا (بحوالہ مشکوۃ باب الایمان بالقدر) ترمذی احمد شاکر ۴/۴۵۷، حاکم ۱/۳۶، مصابیح السنۃ ۱/۱۴۴............(خلیق) جاوید

[2] ثمّ رایت فی معروضات المفتی ابی السّعود سؤالا ملخّصہ: انّ طالب العلم ذکر عندی ⇦

خلاصہ یہ ہے کہ: ایک طالب علم کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں سے ایک حدیث کا ذکر آیا اس نے کہا، واہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سب احادیث سچی ہوا کرتی ہیں اور ان پر عمل کیا جائے؟ مفتی نے جواب دیا کہ وہ کافر ہوگیا۔ اول: تو استفہام انکاری کے سبب سے اور دوسرا: اس کلام میں پیغمبر علیہ السلام کی جناب میں عیب لگانے سے پہلے کفر اعتقادی میں تو تجدید ایمان کا حکم کیا جائے قتل نہ کیا جائے اور دوسرے کفر سے اس کا زندیق ہونا ثابت ہوتا ہے۔ گرفتاری کے بعد باتفاق محدثین اس کی توبہ قبول نہیں، اس کی سزا قتل ہے۔ البتہ گرفتاری سے قبل توبہ میں اختلاف ہے۔ حضرت ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کی توبہ قبول کی جائے قتل نہ کیا جائے اور باقی ائمہ کے نزدیک اس کی توبہ قبول نہیں، حداً قتل کیا جائے۔

خدا کے بندو غور کرو! اپنے بزرگوں کو دیکھو! اتنی سوء ادبی پر کیسی بڑی سخت سزا تجویز فرمائی ہے، تم کس خواب غفلت میں سوئے ہو۔ کس ورطۂ خطرناک میں پڑے ہو، سنت کو برا جاننے پر، کس مذہب کی کس کتاب میں تم نے وعدۂ اخروی لکھا پایا ہے۔ برا نہ جاننے میں تمہارا کیا نقصان ہوتا ہے، ملا لوگ پیٹ کے مارے تمہیں طیش میں لاکر اور گرم کرکے کچھ کما لیتے ہیں، کیا خوب حلال کمائی ہے۔ حدیث پر عمل کرنے سے عداوت کرتے ہیں توبہ کرواتے ہیں، اگر عامل بالحدیث نے توبہ کرلی تو ان کا بھائی بنا، نہ کی تو دشمن رہا، موردِ ہزارہا ہزار طعن و تشنیع و بہتان ٹھہرا۔ یہ عداوت دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اگر عامل بالحدیث سے ہوتی تو ترکِ عمل کے بعد زائل نہ ہوتی اور اس کا سبب شہوتِ بطن کی راہ سے اغوائے شیطانی ہے نہ کہ حمایت اسلامی، اگر حمایتِ

⇦ حدیثا من احادیث النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اکلّ احادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم صدق یعمل بھا؟ فاجاب بانّہ یکفر، اوّلا: بسبب استفھا مہ الانکاریّ، و ثانیا: بالحاقہ الشّین للنّبی صلی اللہ علیہ وسلم ففی کفرہ الاوّل عن اعتقادہ یؤمر بتجدید الایمان ولا یقتل، والثّانی یفید الزّندقۃ فبعد اخذہ لا یقبل توبتہ اتّفاقا قبلہ اختلف فی قبول توبتہ، فعند ابی حنیفۃ تقبل فلا تقتل، و بقیّۃ الأئمۃ لا تقبل و تقتل حدا۔ (درمختار ۲/۲۸۲) [مؤلف] (جاوید)

اسلامی ہوتی تو فساق، زانی، شرابی، حرام خور، سود خور، رشوت خور، تارکِ نماز، تارکِ زکاۃ، تارکِ حج، تارکِ تقسیم میراث، رافضی، نیچری، کیسر شاہی، ڈاڑھی منڈا، ہندو آریہ، برھمو بحکم شرع کسی کے مقابلہ میں تو ظہور پکڑتے، سب مخالفین اسلام سے درگذر یا شیرو شکر اور عامل بالحدیث سے عداوت؟ سبحان اللہ حمایت اسلامی اسی کا نام ہے!

ثبوت رفع الیدین:

امام بخاریؒ نے کہا، ہم سے حدیث بیان کی محمد بن مقاتل نے، انہوں نے کہا ہمیں خبر دی عبداللہ بن مبارک نے، انہوں نے کہا ہمیں خبر دی یونس نے، انہوں نے زہری سے، زہری نے کہا ہمیں خبر دی سالم بن عبداللہؓ نے، انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب نماز میں کھڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے یہاں تک ان کے کندھوں کے برابر ہوئے اور ایسا ہی کرتے تھے جب رکوع کے لئے تکبیر کہتے اور ایسا ہی کرتے تھے جب رکوع سے سر اٹھاتے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہتے اور یہ کام سجدہ میں نہیں کرتے تھے۔ (بخاری ۲/ ۲۱۹، مشکوۃ ۔۵۷/طبع کراچی)

اور اسی مضمون کی حدیث مسلم کے صفحہ ۱۶۸ ج اول میں، مؤطا امام مالک کے صفحہ ۲۵ پر ترمذی صفحہ ۳۶ پر، سنن ابی داؤد کے صفحہ ۱۰۳ پر، سنن نسائی کے ۱۴۷، ۱۶۸ پر، سنن ابن ماجہ کے صفحہ ۱۳۱ پر مشکاۃ کے صفحہ ۶۷ میں موجود ہے، قسطلانی شرح بخاری میں ہے کہ اس حدیث کو پچاس صحابہؓ نے روایت کیا ہے، ترمذی نے چودہ صحابہ اور مسک الختام نے چوبیس صحابہ کے نام ذکر کئے ہیں۔ ابن القیمؒ نے زاد المعاد میں کہا: اسے تیس صحابہ نے نقل کیا ہے۔ سفر السعادہ کے ص ۱۵ میں ہے کہ اس سے متعلق چار سو (۴۰۰) احادیث اور آثار صحت کو پہنچتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس جہاں سے رخصت فرمانے تک یہ عمل تھا۔

جس قدر احادیث اس سنت کے بارہ میں کتب احادیث میں موجود ہیں کسی اور سنت کے بارہ میں کم ہی ہوں گی۔ جب اس قدر شافی، کافی و وافی ثبوت انہیں کفایت نہیں کرتے تو خدا جانے کس قدر اور ثبوت ہوں تو یہ لوگ قبول کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم، اللہ کا حکم:

فرمان الٰہی ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا......الآية
(حشر:۷)

''اور جو رسول تمہیں دے سو اسے پکڑ لو اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو۔''

نیز فرمایا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (نجم:۳۔۴)

''یہ (رسول اللہ) اپنے نفس کی خواہش سے کچھ نہیں کہتا جو وہ کہتا ہے وہ سب اللہ ہی کا حکم ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کو برا جاننے سے کفر کا لازم آنا اور اعمال کا ضیاع:

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝ (محمد:۹)

''یہ ان کے اعمال کھو دینا اس لئے کہ انہوں نے اس حکم کو برا جانا جو اللہ نے اتارا، سو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے۔''

جوتے پہن کر نماز پڑھنے کی دلیل:

حضرت ابو سلمہ سعید بن یزید نے کہا میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوتوں میں نماز پڑھا کرتے تھے؟ کہا، ہاں پڑھا کرتے تھے۔ ابو سعید الخدریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ ناگہاں اپنے جوتے اتار دیئے۔ لوگوں نے بھی دیکھ کر

اتار ڈالے۔ نماز سے فراغت پا کر آپ نے پوچھا تم نے اپنے جوتے کیوں اتارے؟ عرض کیا آپ کو دیکھ کر! آپ نے فرمایا: مجھے جرائیلؑ نے آ کر خبر دی کہ آپ کے جوتوں میں ناپاکی لگی ہے میں نے اس لئے اتارے تھے۔ جب تم میں سے کوئی مسجد میں آئے تو جوتوں کو دیکھ لے۔ اگر ان میں نجاست نظر آئے تو ان کو زمین سے رگڑ کر صاف کرلے اور انہیں میں نماز پڑھ لے۔ اس مضمون کی اور بھی احادیث وارد ہیں۔[1]

منیہ[2] کی شرح کبیر میں ہے کہ: جوتوں میں نماز پڑھنا ننگے پاؤں نماز پڑھنے سے یہود کی مخالفت کے سبب زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ اور حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث کے آخر میں ناپاک جوتوں کو پاک کرنے کا بیان بھی ہو چکا ہے۔ بعض لوگ دوستانہ نصیحت کرتے ہیں کہ یہ امور اگرچہ سنت تو ہیں، مگر لوگ ان باتوں سے چڑتے اور شور کرتے ہیں اس لئے ان کا نہ کرنا بہتر ہے۔

اے مہربانوں، تمہیں مہربانی کرو! چڑنا اور شور کرنا چھوڑ دو، چڑنا تو کوئی فرض، واجب، سنت اور مستحب نہیں ہے، جس کے چھوڑنے میں تمہارا کوئی نقصان ہوتا ہو، تمہیں بھی یہی کمزور پہلو نظر آتا ہے۔ شور کرنے والوں کو کیوں نصیحت نہیں کرتے کہ شور نہ کیا کریں۔ امرِ شرع سے چڑنا اور شور کرنا ایمان سے بعید ہے۔ خدا اور رسول پر ایمان لائے ہو یا رواجِ ملک پر؟ تمہاری مصلحتوں نے تو ملک سے دین کا نام بھی کھو دیا۔

سوال دوم:

زید ایک بڑا کامل ولی اللہ ہے، عمرو نے قسم کھائی کہ اگر میں زید سے کلام کروں تو میری بیوی کو طلاق۔ زید کے فوت ہو جانے کے بعد عمرو

---

[1] (مسند احمد ۳/۲۰، ۹۲، دارمی ۱/۳۲۶، ابوداؤد ۱/۴۲۶، مشکوۃ ۷۳، مصابیح السنۃ ۱/۳۰۳)

[2] ومنها، الصّلاة في النّعلين تفضل على الصّلاة الحافي اضعافا مخالفة للّيهود۔ (کبیری شرح منیہ ص۲۷) [مؤلف]

نے نادم ہو کر کہا کہ: اے زید میں تجھ سے کلام کرتا ہوں میرا قصور معاف کر دو۔ اب عمرو کو طلاق ہو گی یا نہیں؟ بینوا توجروا؟

جواب دوم:

فوت ہونے کے بعد کلام کرنے سے قسم نہیں ٹوٹتی اور طلاق واقع نہیں ہوتی۔
کنز[1] میں لکھا ہے کہ: کسی نے قسم کھائی کہ اگر میں تجھے ماروں یا کپڑا پہناؤں یا تجھ سے کلام کروں یا تیرے پاس آؤں تو یہ سب قسمیں زندگی کے ساتھ مقید ہوں گی۔ اگر زندہ سے یہ کام کرے گا تو قسم ٹوٹے گی، مردہ سے کرے گا تو نہ ٹوٹے گی۔
ھدایہ[2] میں ہے: جس نے کہا اگر میں تجھ کو ماروں تو میرا غلام آزاد، اگر زندہ کو مارے گا تو غلام آزاد ہو جائے گا۔ مرنے کے بعد مارے گا تو آزاد نہیں ہوگا۔
مستخلص[3] میں ہے: کہ اگر کسی نے کہا: میں تم سے کلام کروں تو میرا غلام آزاد، پھر اس کے مرنے کے بعد اس سے کلام کی تو قسم نہ ٹوٹے گی اور غلام آزاد نہ ہوگا۔
اور پھر ہدایہ[4] میں ہے: کہ کلام سے مقصود بات سمجھانا ہے اور موت اس کے منافی ہے، مردہ نہ سنتا ہے، نہ سمجھتا ہے۔ اور مستخلص میں ہے کہ: مارنے سے مقصود بدن کو درد پہنچانا ہے اور مردہ اس قابل نہیں، پھر قبر کے عذاب کا اعتراض کر کے اس کا جواب دیا ہے اور جو چاہے فقہ کی ہر کتاب میں کتاب الایمان، باب الیمین فی القتل والضرب وغیرہ سے مراجعت کر سکتا ہے۔

---

[1] ان ضربتک او کسوتک او کلّمتک او دخلت علیک تقیّد بالحیوۃ (کنز)
[2] من قال ان ضرّبتک فعبدی حرّ فھو فی الحیوۃ۔ (ہدایہ)
[3] و کذلک لوقال ان کلّمتک فعبدی حرّ فکلّمه بعد موته لا یحنث۔ (مستخلص)
[4] لانّ المقصود من الکلام، الافھام والموت ینافیه۔ (ہدایہ۲/۵۰۴)

امام ابوحنیفہؒ کا قبروں سے پکارنے والے شخص سے مکالمہ:

اور صاحب[1] الغرائب فی تحقیق المذاہب میں یوں روایت ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس شخص کو دیکھا جو اولیاء کی قبروں پر آتا پھر ان کو سلام کہتا، ان سے مخاطب ہوتا ان سے باتیں کرتا اور کہتا: اے قبروں والو! تمہیں کچھ خبر بھی ہے، تمہارے پاس کچھ اثر ہے کہ تمہارے پاس کئی ماہ سے تم کو پکار رہا ہوں اور میرا سوال تم سے سوا دعا کے اور کچھ نہیں، سو تمہیں کچھ معلوم بھی ہوا یا غفلت ہی میں پڑے ہو؟ حضرت ابوحنیفہؒ نے اس شخص کا قبر والوں سے گفتگو کرنا سنا اور اسے پوچھا کہ ان اولیاء نے تمہیں کچھ جواب دیا؟ اس نے کہا بالکل نہیں! پھر امام صاحب نے اسے بددعا دی کہ تو خدا کی رحمت سے دور ہو، تیرے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں، تم ایسے جسموں سے باتیں کرتے ہو جو جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے، نہ ہی کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ ہی آواز سنتے ہیں۔ اور یہ آیت پڑھی: وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (اور تو قبر والوں کو نہیں سنا سکتا)۔

امام صاحب کی سب کتابوں میں لکھا ہے کہ مردے نہیں سنتے، ولی اور غیر ولی کا کوئی فرق نہیں کیا، دونوں کا ایک حکم بتایا ہے اب جو نہ مانے وہ امام صاحب کی سب فقہ کا منکر ہے۔

کیا شہید اور ولی ایک حکم میں ہیں؟

بعض نادان کہتے ہیں کہ اولیاء کو مردہ کہنا ناجائز ہے۔ اور اس پر دلیل پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شہیدوں کو مردہ کہنے سے منع فرمایا ہے، اور پھر کسی مجہول

---

[1] رأى الامام ابوحنيفة من يأتي القبور لاهل الصّلاح فيسلّم و يخاطب و يتكلّم ويقول يا اهل القبور! هل لكم من خير و هل عندكم من شرّ، انى اتيتكم وما اتيكم من شهور وليس سؤلى منكم الا الدّعاء ، فهل دريتم أم غفلتم؟ فسمع ابوحنيفةؒ يقول بمخاطب بهم، فقال هل أجابوا لك؟ قال لا ، فقال وتربت يداك ، كيف تكلّم اجسادا لا يستطيعون جوابا ولا يملكون شيئا فلا يسمعون صوتا وقرأ: "وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ"۔ (نقل از جامع التفاسیر نواب قطب الدین خان حنفی)

الاسم کتاب کے حوالہ سے یہ بتاتے ہیں کہ شہید اور ولی کا ایک ہی حکم ہے۔ سو ان کا یہ اجتہاد امام صاحب کے اجتہاد کو رد کرتا ہے۔ اس لئے میں امام رحمہ اللہ کی طرف سے ایک ایسا جواب دیتا ہوں جس کا کوئی مقابل نہیں۔

اور وہ یہ ہے کہ......... شہادت ایک اعلیٰ منصب اور مرتبہ ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں بہت بڑے انعامِ اخروی کا وعدہ دیا گیا ہے اور اس کے احکام قرآن، حدیث اور فقہ میں مذکور ہیں اور ''ولایت'' یعنی ولی ہونا کوئی منصب و مرتبہ شرعی نہیں، بلکہ خیال پختہ کرنے کے مراتب میں سے صوفیہ کرام کی اصطلاح میں ایک مرتبہ کا نام ''ولایت'' ہے۔ جس نے اس مرتبہ تک خیال پکا کرلیا اس کا نام ''ولی'' ہے، مگر یہ اصطلاح ہمارے زیر بحث مسئلہ سے خارج ہے، نہ کلام اللہ، نہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کے لئے کوئی انعام اخروی کا وعدہ ہے اور نہ ہی قرآن و حدیث اور فقہ میں اس کے کوئی احکام مذکور ہیں۔ منیہ، کنز قدوری، شرح وقایہ اور ہدایہ کھول کر دیکھیں کہیں کوئی ولایت کا مسئلہ بیان نہیں کیا گیا پھر دونوں کا ایک حکم کیسے ہوسکتا ہے، کس مجتہد کا یہ قیاس ہے؟

شہداء کی زندگی کیسی ہے؟

جہاں شہیدوں کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا ہے وہیں ایک جگہ یہ بھی فرمایا ہے: ''وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ'' یعنی تم ان کی زندگی کو نہیں جانتے۔ اور دوسری جگہ فرمایا ''عِنْدَ رَبِّهِمْ'' یعنی اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں نہ کہ تمہارے پاس۔ تم اپنے ہاتھ سے شہیدوں کو دفن کرتے ہو، اس کا ترکہ وارثوں میں تقسیم کرتے ہو، اس کی عدت پر عدتِ وفات کا حکم لگاتے ہو، عدت کے بعد نکاح ثانی کے جواز کا فتویٰ دیتے ہو، کیا یہ احکام زندوں پر بھی جاری ہو سکتے ہیں؟

یا رب العالمین، ان لوگوں کے دلوں میں تیری عظمت بیٹھ جائے جو تیری پاک کتاب کے معانی خراب کرنے سے ان کو مانع ہو۔ آمین یا رب العالمین

☆......❁......☆

جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے کے کفر سے متعلق

بسم اللہ الرحمن الرحیم و نصلی علی رسولہ الکریم

وقت باقی ہے پڑھو یارو نماز
آستانے پہ رکھو فرق نیاز
وقت باقی ہے اٹھو کر لو وضو
دین دنیا میں بنو با آبرو

نماز کی فرضیت، اہمیت اور وعید:

سب مسلمان جانتے ہیں کہ ایمان کے بعد افضل عبادت نماز ہے اور ہر دن میں پانچ بار فرض ہے اور اس کے ادا کرنے میں بڑی بڑی فضیلتیں وارد ہیں اور اس کے ترک کرنے میں سخت وعیدیں ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پانچ[1] نمازیں فرض کی ہیں، پس جو کوئی ان کے لئے اچھی طرح وضو کرے، اور ان کو اپنے وقت پر ادا کرے اور ان کا رکوع و خشوع پورا کرے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا عہد ہے کہ اس کو بخشے اور جو ایسا نہ کرے سو اللہ کے ہاں اس کا عہد نہیں ہے، خواہ اس کو بخشے خواہ عذاب کرے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[2] نے فرمایا: جو کوئی نماز کی حفاظت کرے گا۔ وہ نماز اس کے لئے قیامت کے روز نور، محبت اور نجات ہوگی اور جو کوئی اس کی حفاظت نہ کرے وہ اس کے لئے نہ نور ہوگی، نہ دلیل ہوگی اور نہ ہی نجات، اور وہ شخص قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا...... اور رسول اللہ صلی

---

[1] مسند احمد ٥/٣١٧، ابوداؤد ١/٢٩٥، مصابیح السنۃ ١/٢٥٢، دارمی ١/١٧٠، نسائی ١/٢٣٠، ابن ماجہ البانی ٢٣٥

[2] مسند احمد ٢/١٩٢، دارمی ٢/٣٠١، بیہقی شعب الایمان ٦/١١٦، مشکل الآثار ٤/٢٢٩

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: روز قیامت سب سے پہلے نماز کا سوال ہوگا۔

اسی طرح اور بھی احادیث و آیات ان مضامین سے بھری پڑی ہیں، مگر اس کے باوجود دیکھا جاتا ہے کہ بہت کم لوگ اس فریضہ کو ادا کرتے ہیں حالانکہ اس میں نہ کچھ خرچ ہوتا ہے اور نہ کوئی بدنی مشقت لاحق ہوتی ہے۔ یہاں کے علماء سے بغرض آگاہی ناواقفین و بیداریٔ غافلین، ذیل میں مرقوم ایک استفتاء کیا گیا ہے، جس کا جواب ہر شخص کو بغور دیکھنا اور اس پر لازماً عمل کرنا چاہیے سو ہم سب کے لئے مناسب ہے کہ اپنی ہمتیں اس عمل خیر میں مصروف کریں اور خود پابندی کر کے اپنے توابع و احباب کو فہمائش کریں اور جو شخص نہ مانے اس سے اختلاط و ملاقات ترک کر دیں اور اسے اپنے کھانے پینے میں شریک نہ کریں، جس شخص سے خدا اور رسول بیزاری ظاہر فرمادیں اس کو کیونکر اپنا دوست سمجھنا اور خورد و نوش میں شامل کرنا گوارہ ہوگا۔ سزا تو بے نماز کی بہت بڑی ہے۔ تاہم اس کی ادائیگی جب ممکن ہے تو اس میں غفلت و کوتاہی نہیں کرنی چاہیے:

بے نمازوں سے بنو اتنے نفور ...... گم ہو ان کی غفلت و خواب و غرور
انکے برتن میں نہ تم پانی پیو ...... اپنے برتن میں نہ پانی ان کو دو
مت کھلاؤ ساتھ میں ان کو طعام ...... خاکروبوں سے بہتر ہیں ان کے کام
ہاتھ کا ان کے نہیں کھانا درست ...... ان کی دعوت میں نہیں جانا درست
حقہ و پان ان کو مت دو زینہار ...... دل جلے شاید اسی پر ایک بار
زرد رو ہیں سرخرو ہوجائیں اب ...... ایک دم میں نمازی ہوگیا عجب

اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس کی توفیق بخشے۔ استفتاء مع جواب ذیل میں درج ہے۔ اس کی اصل عاجز کے پاس جامع مسجد میں موجود ہے۔ شک کی صورت میں تشریف لاکر ملاحظہ فرمائیں۔ فقط

استفتاء

سوال:

علمائے دین حق اس شخص کی متعلق ارشاد فرمائیں کہ: جو بلاعذر شرعی فرض نماز کو ترک کرے شرعاً اس کا کیا حکم ہے اور اس کے ساتھ اختلاط، کھانا ، پینا اور بولنا کیسا ہے؟ اور اگر زوجین میں ایک ایسا ہوتو نکاح باقی رہے گا یا نہیں اور صحبت حلال ہوگی یا حرام اور اولاد کیسی ہوگی؟ اور اگر ایسے شخص کے مرنے کے بعد زجراً اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں تو کیا ہے؟ اور اگر نماز کی نصیحت کو برا مانے یا کوئی کلمہ استخفاف کہے تو اس کا کیسا حکم ہے؟ بینوا توجروا

جواب:

عمداً نماز چھوڑنے والے کے متعلق صحابہ ومحدثین وفقہاء کی آراء:

تَارِکُ الصَّلَاۃَ عَمَدًا کے باب میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ صحابہ کرام میں حضرت عمر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، معاذ بن جبل، جابر بن عبداللہ، ابوالدرداء، ابوہریرہ اور عبدالرحمٰن بن عوف رضوان اللہ علیہم اجمعین اور غیر صحابہ میں سے امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راھویہ، امام نخعی، ایوب السختیانی، ابوداود، الطیالسی، اور ابوبکر بن الشیبہ رحمہم اللہ کا قول ہے کہ: وہ شخص کافر ہوجاتا ہے۔ اور حماد بن زید، مکحول، امام شافعی، اور امام مالک رحمہم اللہ کے نزدیک کافر تو نہیں ہوتا مگر قتل کیا جائے۔ (صلاۃ رسول ص ۲۲۷ تخریج عبدالرؤف)

اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کفر اور قتل کا حکم نہیں کیا جاتا، مگر قید سخت میں رکھنا چاہئے اور خوب سزا دینی چاہئے اور اس قدر مارا جائے کہ بدن سے خون بہنے لگ جائے تاآنکہ توبہ کرلے یا اسی حالت میں مرجائے۔ (تفسیر مظہری ونفع المفتی ودرمختار ص ۱۸۰)

اور اس سے اختلاط وخورد ونوش وگفتگو ترک کردینا چاہئے کہ اس وقت جس کی

بجائے اسی قدر ممکن ہے اور جس کی غرض بھی یہی ہے کہ تنگ ہو کر توبہ کر لے۔ (حدیث کعب بن مالکؓ کے اسباب میں دلیل ہے)

اور حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل جب معاصی میں واقع ہوئے علماء نے منع کیا وہ باز نہ آئے، ان کے پاس بیٹھنے لگے اور ان کے ساتھ کھانے پینے لگے، پس ان کے دلوں کا ان کے دلوں پر اثر پڑ گیا۔ سو ان پر بزبان داؤد اور عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کے لعنت کی گئی یہ اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے تجاوز کرتے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے، اٹھ بیٹھے، اور فرمایا: تمہیں کبھی نجات نہ ہوگی جب تک کہ اہل معاصی کو مجبور نہ کرو گے۔ (ترمذی ۵/۲۵۲ احمد شاکر، ابوداؤد ۴/۵۰۸ تفسیر ابن کثیر ۲/۱۱۴، عربی)

بے نماز کی نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے:

اور جن علماء نے اس شخص کو کافر کہا ہے۔ ان کے نزدیک نکاح باقی نہ رہے گا اور صحبت حرام ہوگی اور اولاد حرامی ہوگی۔ معاذ اللہ منہ............ اور اگر اہل علم و فضل زجر کے لئے اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں تو جائز ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدیون اور قاتل نفس پر نماز نہ پڑھی تھی اور جیسا فقہائے حنفیہ نے قاطع طریق، مکار، باغی اور قاتلِ أَحَدِ الْأَبَوَيْن سے ان کی اہانت کے پیش نظر نماز جنازہ پڑھنے سے منع کیا ہے۔ (در مختار)

اور امام مالک سے منقول ہے کہ اہل فضل، فساق پر (بے نماز کی طرح) جنازہ نہ پڑھیں تاکہ ان کو عبرت ہو (نووی شرح مسلم) اور اگر نماز سے نفرت یا اعراض کا اظہار کیا یا حقارت و استہزاء سے پیش آیا تو کافر ہو جائے گا کیونکہ حکم شرعی کی اہانت کفر ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

کتبہ محمد اشرف علی عفی عنہ | اشرف علی | تھانوی

اسمائے گرامی مؤیدین علمائے کرام:

⇦ ھوالعلیم الخبیر۔ صد آفرین مجیب مصیب کے لئے کہ امر حق نو کریز قلم فرمایا جزاہ اللہ سبحانہ خیر الجزاء۔ حررہ العبد الحامل/محمد عادل

عامله اللّٰه تعالی بفضله الشامل واصلح حاله بلطفه الکامل فی العاجل و والاجل۔ محمد عادل حاکم محکمہ شرع۔ محمد عادل حاکم محکمہ شرع

⇦ صح الجواب۔ حررہ سید محمد احسان الحق عفی عنہ محمد سید احسان الحق

⇦ ھوالمصیب۔ واقعی نماز کا ترک کرنے والا بحیثیت ترک صلاۃ ایسی ہی زجر وتوبیخ کا مستحق ہے جسے مجیب مصیب نے تحریر فرمایا ہے۔ کتبہ عبدالضعیف محمد علی۔ محمد علی

⇦ ذلک الجواب لاریب فیہ۔ حررہ عبدالراجی غفرلہ اللہ القوی / محمد عبدالغفار اللکھنوی عفی عنہ۔ عبدالغفار

⇦ الجواب صحیح والمجیب نجیح۔ احمد حسن عفی عنہ۔ مدرس مدرسہ دارالعلوم کانپور ول مرتضی حسن جان احمد

جن کو ہے حب خدا عشق رسول ...... کیوں نہ کرلیں گے وہ یہ مضمون قبول
کام جو ہوگا دل کے لاگ سے ...... وہ بچائے گا وہاں کی آگ سے

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جو شخص ان لوگوں پر طعن و تشنیع کرے گا جنہوں[1] نے نئی نماز شروع کی ہے وہ مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ میں داخل ہوگا جس کی مذمت قرآن مجید میں ہے بلکہ اس استہزاء سے اس کے زوالِ ایمان کا خوف ہے۔ معاذ اللہ منہ

بر رسولاں بلاغ باشد و بس ...... والسلام علی من اتبع الھدی

التماس:

در حضور مومناں اہل علم و پاکباز ...... عرض کرتا ہے یہ عبداللہ بصد عجز و نیاز
بے نمازی کو سنا دیں پڑھکے یہ پرچہ تمام ...... اور ترغیب نماز ان کو دلائیں صبح و شام
پائیں گے اللہ کی درگاہ سے اجر عظیم ...... اور مومنوں کو جو بتائیں گے صراط مستقیم

المشتہر: خیر خواہ عبداللہ / محمد عبداللہ غفرلہ اللہ، امام جامع مسجد

---

[1] یعنی رفع الیدین کی سنت پر عمل کرتے والے جو شاید لوگوں کے ہاں نئی نماز تصور ہو۔ (خلیق)

یا شیخ عبدالقادر جیلانی کا وِرد، بغداد کی طرف رخ کرکے گیارہ قدم چلنا اور پیرانِ پیر کی گیارہویں دینے والوں کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں:

سوال:

۱)...... ''یا عبدالقادر جیلانی شیئًا للّٰہ'' کو حاضر و ناظر جان کر ورد کرنا جائز ہے یا نہیں اور اس وِرد کا کرنے والا کیسا ہے؟

۲)...... بغداد کی طرف رُخ کرکے اور بعض گلے میں کپڑا بھی ڈال کر دست بدستہ ہوکر گیارہ قدم چلتے ہیں اور پیرانِ پیر سے استمداد و استعانت کرتے ہیں، یہ لوگ کیسے ہیں؟

۳)...... مال میں اضافہ اور مصائب میں استعانت اور استغاثہ کی خاطر گیارہویں دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ اعتقاد محض ایصالِ ثواب کے لئے کیا جائے تو پھر تعیین یوم کیسا ہوگا؟

۴)...... جو شخص ان افعال مذکورہ کا مجوِّز و مفتی، مروج، مثبت اور مصرّ ہو وہ کیسا ہے اس کے پیچھے نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں اور اہل سنت والجماعت اور مذاہب اربعہ سے کسی مذہب میں داخل ہے یا نہیں؟

۵)...... جو لوگ افعالِ مذکورہ کے مرتکب اور معتقد ہوں ان کے ساتھ مخالطت، مجالست، مواکلت، مشاربت اور مناکحت درست ہے یا نہیں، ان کو ''السلام علیکم'' کہنا جائز ہے یا نہیں؟

۶)...... جو شخص ان اعمال مذکورہ سے مانع ہو اس پر تکفیر، اتہام وھابیت اور انکارِ ولایت اولیاء کا فتویٰ لگانا کیسا ہے اور اس مانع کے پیچھے نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں؟ بینوا بالآیات القرآنیہ و الاحادیث النبویة والروایات الفقهیة توجروا۔

الجواب:

۱)...... اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا اللّٰهِ۔ قیود سوالات سائل سے صاف ظاہر ہے کہ جس کا یہ عقیدہ ہے وہ مشرک ہے، کیونکہ غیر اللہ کو حاضر و ناظر جاننا اور اس کے نام کا اسمائے الٰہی کے مثل درود و وظیفہ کرنا اور اس سے حاجات طلب کرنا اور گیارہ قدم بسوئے بغداد بہ نیت توجہ جانب قبر غوث الاعظم (یعنی شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ) آدابِ نماز کی مثل دَست بستہ ہوکر چلنا اور پھر الٹے پاؤں وہی آداب ملحوظ رکھنا جسے اصطلاح مشرکین و مبتدعین میں ''نمازِ غوثیہ'' اور ''ضَربُ الْاَقدام'' کہتے ہیں۔ نیز غیر اللہ سے استمداد و استعانت کرنا اور ان جیسے افعالِ شرکیہ کا مرتکب ہونا مشرکین کا طریقہ ہے، کیونکہ ذاتِ باری عزّ اسمہ علام الغیوب کے سوا علم غیب کے ثبوت کا عقیدہ کسی نبی یا ولی یا غوث یا قطب یا پیر یا مرشد کے ساتھ روا رکھنا، دلیلِ آیات بینات قرآن مجید، احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور روایاتِ فقہیہ کے مطابق عین شرک ہے۔

آیات مبارکہ:

۱)...... قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ○ (نمل:۶۵)

''کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمین والوں میں سے سوائے اللہ کے کوئی غیب نہیں جانتا انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

۲)...... وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْمِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُوْنَo (احقاف:۵)

''اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوسکتا ہے جو اللہ کے سوا ان کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی دعا قبول نہ کرسکیں، بلکہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔''

۳)...... وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ مِنَ الظّٰالِمِيْنَo (ھود:۱۰۶)

''اور اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت مت کرنا جو تجھ کو نہ کوئی نفع پہنچا سکے اور نہ کوئی ضرر پہنچا سکے، پھر اگر ایسا کیا تو تم اس حالت میں ظالموں میں سے ہوجاؤ گے۔''

احادیثِ شریفہ:

۱)...... وہ ''حدیث جاریات'' جس میں ایک بچی نے یہ کہا تھا:

وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ۔

''اور ہم میں ایک نبی ہے جو آئندہ کل کے واقعات سے باخبر ہے''

فَقَالَ: دَعِيْ هٰذِهٖ وَ قُوْلِيْ الَّذِيْ كُنْتِ تَقُوْلِيْنَ۔

''تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسے چھوڑو، اور وہی کہو جو تم پہلے کہہ رہی تھی۔''

۲)...... وَ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللّٰه عنها قَالَتْ : مَنْ اَخْبَرَكَ اَنَّ مُحَمَّدًا يَعْلَمُ الْخَمْسَ الَّتِيْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ...... فَقَدْ اَعْظَمَ الْفِرْيَةَ۔[1]

---

[1] (فتح الباری ۲/۵۲۴، احمد ۲/۱۲۲)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہتی ہیں تم سے جو شخص یہ کہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان پانچ چیزوں کا علم تھا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے آیت میں فرمایا ہے: ''بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش نازل فرماتا ہے، اور ماں کے پیٹ میں جو ہے اسے جانتا ہے، کوئی (بھی) نہیں جانتا کہ کل کیا (کچھ) کرے گا؟ نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ کس زمین میں مرے گا، تو اس نے بہت بڑا جھوٹ باندھا۔

۳)...... قَالَ النَّبِیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: وَاللّٰہِ لَا اَدْرِی وَاللّٰہِ لَا اَدْرِی وَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ۔

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا، اللہ کی قسم میں نہیں جانتا حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔''

۴)...... اور بخاری و مسلم میں ''حدیث الافک'' مصرح ہے کہ جب منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برأتِ عائشہؓ کی تحقیق میں ایک مدت تک کس قدر توجہ و اہتمام رہا اور بارگاہِ اقدس سبحانہ وتعالیٰ سے نزولِ آیاتِ برأت سے قبل، قلب مبارک سے شکِ ذنب رفع نہ ہوا، سو جب آیات برأت نازل ہوئیں تب یقین ہوا، اگر آپ کو علمِ غیب ہوتا تو اس قدر رنج وغم اور حادثہ کا اہتمام کیوں ہوتا۔ حدیث میں یہ واقعہ اسی موضوع کے لئے نذیرِ عریان ہے۔ اس ضمن میں اور بھی بہت سی احادیث موجود ہیں۔

فقہی روایات:

ملا علی قاری ''الفقہ الاکبر'' میں رقمطراز ہیں:

---

[۱] (مشکوۃ فتح الباری ۳/۱۱۴،۱۲/۲۱۰، مصابیح السنۃ ۳/۱۵۱)

ثمّ اعلم انّ الانبیاء لا یعلم المغیبات لمعارضة قوله تعالی: قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ- وقال فی البزّازیه و غیرها من کتب الفتاوی: من قال ارواح المشائخ حاضرة تعلم یکفر، وقال الشّیخ فخرالدّین بن سلیمان الحنفی فی رسالته: ومن ظنّ انّ المیّت یتصرّف فی الامور دون اللّٰه واعتقدبه ذلک، کفر (کذا فی بحر الرائق) فعلم انّ علم اللّٰه سبحانه وتعالی ازلیّ ابدیّ محیط بما کان وما یکون من جمیع الاشیاء بقضّها وقضیضها و قلّها و جلّها و نقیرها و قطمیرها و صغیرها و کبیرها ولا یخرج من علمه و قدرته شیء لأنّ الجهل بالبعض و العجز عن البعض نقص وافتقار، و هذه النّصوص القطعیّة ناطقة لعموم علمه و شمول قدرته فهو بکلّ شیء علیم و هو علی کلّ شیء قدیر- (فقہ اکبر:۱۸۱)

”جان لیجئے! کہ انبیاء کرام غیب نہیں جانتے کیوں کہ وہ اس فرمان الٰہی کے معارض ہے: ”کہہ دیجئے کہ آسمانوں و زمین کا غیب اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا“۔ بزازیہ اور دیگر کتب فتاویٰ میں ہے: جس نے کہا مشائخ کی ارواح حاضر جانتی ہیں وہ کافر ہوگیا۔ شیخ فخر الدین بن سلیمان الحنفی اپنے رسالہ میں کہتے ہیں کہ: جس نے یہ خیال کیا کہ میت اللہ کے سوا امور میں تصرف کرتی ہے اور اس کا عقیدہ بھی یہی ہوا تو وہ کافر ہوگیا۔ (بحر الرائق) تو معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم ازلی و ابدی ہے اور ”ما کان و ما یکون“ قض و قضیض، قلیل و کثیر، نقیر و قطمیر، صغیر و کبیر ہر چیز پر

حاوی ہے اور اس کے علم وقدرت سے کوئی چیز بھی نکل نہیں سکتی اس لئے کہ کسی چیز سے ناواقفیت اور کسی چیز سے عاجزی نقص و عیب ہے اور یہ نصوص قطعیہ باری تعالیٰ کے عموم علم اور اس کے شمولِ قدرت کو قطعی ناطق ہیں، سو وہ ہر چیز کو جاننے والا اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

پس یہ علم اور قدرت ذات باری عالم الغیب، قادر مطلق کا خاصہ ہے، اس میں نبی یا ولی کو شریک کرنا عین شرک ہے۔ اور جو بعض امورِ غائبہ پر انبیاء علیہم السلام یا اولیائے کرام کو انکشاف ہوا ہے وہ محض بذریعہ وحی اور الہام الٰہی کی اطلاع سے ہوا۔

فرمانِ الٰہی ہے:

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ...... (البقرہ:۲۵۵)

"اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جتنا وہ چاہے......"

اور یہ علم جو باعلام حق وسبحانہ وتعالیٰ مقربان خاص الخاص کو ہوتا ہے، اگرچہ یہ ذاتِ سید کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بہ نسبت دوسرے انبیاء عظام اور اولیائے کرام بوجہ اکمل ہے، لیکن علام الغیوب کے علم سے مماثل نہیں ہے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ...... الآية (انعام ۵۰)

"کہہ دیجئے! نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔"

امام فخر الدین الرازیؒ اپنی تفسیر کبیر میں، اس آیت قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ۔ کے تحت رقمطراز ہیں:

انّه لمّابيّن انه المختصّ بالقدرة فكذلك بيّن انه

المختص بعلم الغيب......و الآية سيقت لاختصاصه تعالى بعلم الغيب و انّ العباد لا علم لهم بشيء منهم، و امّا قوله "وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ" صفة لاهل السّموات و الارض نفي ان يكون لهم علم الغيب-انتهى مختصراً،
(تفسیر سورۃ الانعام:۵۰)

''کہ جب اس نے یہ واضح کر دیا کہ تقدیر کے ساتھ وہی مختص ہے ایسے ہی یہ بھی بیان کر دیا کہ علم غیب کے ساتھ بھی وہی خاص ہے، اور آیت اختصاص باری تعالیٰ ہی بتاتی ہے کہ وہ غیب دان ہے اور بندوں کو اس کا کچھ بھی علم نہیں رہا، یہ فرمان باری ہے کہ ''انہیں تو خبر نہیں وہ کب اٹھائے جائیں گے'' آسمانوں اور زمین میں رہنے والوں کی یہ صفت ہے کہ اس نے ان سے علم غیب کی نفی کی ہے۔''

جواب:

۲)...... گیارہ قدم چلنا اصطلاح اہل شرک و بدعت میں ''صلاۃ غوثیہ'' ہے اور اسے ''ضَربُ الْاَقْدَام'' بھی کہتے ہیں، یہ بھی شرک ہے، کیونکہ نماز معبودِ حقیقی کے لئے خاص عبادت ہے۔ اس وحدہ لاشریک لہ کے علاوہ عبادت، بدنی یا مالی شرک ہے اور فاعل مشرک ہے۔

۳)...... گیارھویں جو اہل بدعت کے ہاں معمول بہ مہتم بالشان بہ نیت نذر غیر اللہ اور تقرب غیر اللہ ہے وہ بھی شرک ہے، کیونکہ عبادت مالی بھی غیر معبود برحق کے لئے حرام اور شرک ہے اور اگر نیت ایصالِ ثواب کی ہو تو خالصاً لوجہ اللہ دے کر بلا تعیینِ دن ایصالِ میت کریں اور گیارھویں کا نام زائل کرنا واجب ہے، کیونکہ یہ نام اہلِ شرک و بدعت کا رکھا ہوا ہے۔ اگر کوئی خالص نیت سے گیارھویں کا نام رکھ کر ایصال کرے تو بھی اہل توحید و سنت کے نزدیک محل تہمت ہے اور مواضع تہمت سے بچنا بھی ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

۴)...... جو شخص ان امور کا مجوِّز، مفتی اور مروّج ہے۔ العیاذ باللہ منہ، وہ رأس المشرکین ہے یعنی اپنے تابعین مشرکین کا رئیس ہے اس کے پیچھے نماز درست نہیں اور جبکہ وہ دائرہ توحید و سنت سے خارج ہوگیا تو مذاہب اربعہ میں سے کس مذہب میں داخل رہا۔

۵)...... جن لوگوں کا یہ عقیدہ بد اور ایسے افعال شرکیہ بدعیہ ہیں، جب تک وہ تائب نہ ہو جائیں ان سے معاملہ ترک کرنا چاہئے۔ حدیث میں ہے:

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰهِ و اَعْطٰى لِلّٰهِ وَ مَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ۔ (ابوداؤد کتاب السنہ حدیث ۴۶۸۱ و جامع الصغیر ۶/۲۹)

۶)...... جو شخص ان افعالِ شنیعہ سے مانع ہے وہ موحد سنی محب اولیاء ہے، قابل امامت ہے اور اس کی امامت اولی اور انسب ہے اور اس کی تکفیر خود مکفر کی تکفیر ہے۔

واللہ تعالی اعلم و علمہ اتم

حررہ الفقیر / محمد حسین الدہلوی عفا اللہ عنہ | فقیر محمد حسین |

اسمائے گرامی مؤیدین علمائے کرام:

⇦ كيف يكون عبدا مسا ويا لله جل جلاله و عزّ اسمه لانّ الله كبيرا المتعال ذالعظمة والجلال موجد و معطى العلم للعباد و هم الآخذون منه و المحتاجون اليه فى الدّنيا والآخرة۔ كتبه محمد ابراهيم الدهلوى

”کوئی بندہ اللہ جل جلالہ وعز اسمہ کے مساوی کیونکر ہوسکتا ہے، اس لئے کہ اللہ کریم کبیر المتعال، ذوالعظمۃ والجلال، موجد اور اپنے بندوں کو علم عطا کرنے والا ہے اور وہ اسی سے اخذ کرنے والے اور دنیا و آخرت میں اس کے محتاج ہیں۔ يقال له ابراهيم

⇦ قادر علی عفی عنہ | قادر علی عفی عنہ |

⇦ اولاً معلوم ہو کہ قرآن، فرقان و کلام رحمٰن جو اشرف المخلوقین پر نازل ہوا تو محض اسی عقیدہ کی درستگی کے لئے نازل ہوا ہے۔ مشرکین کے عقائد، اللہ تعالیٰ و رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک برے تھے ورنہ وہ۔ في زعمهم الباطل۔ اپنے آپ کو تابعین ابراہیم علیہ السلام کہلاتے تھے اور حج بیت اللہ اور طواف وصوم وغیرہ عبادات کرتے تھے، لیکن ان کے عقائد برے تھے کہ انبیاء و اولیاء کی تصاویر بنا کر ان کی تعظیم اور نذر و نیاز کرتے تھے۔ كما اخبر الله سبحانه في عدة مواضع و ليست بمخفية على من له ادنى مسّ من القرآن و الحديث۔ جس طرح کہ آج کل کے مسلمان تمام عبادات یعنی صوم و صلاۃ و حج وغیرہ بجالاتے ہیں اور اولیاء و انبیاء کے حق میں ایسے عقائد رکھتے ہیں جیسا کہ سائل نے بیان کیا اور مجیب۔ استعمله الله لما يحبّ و يرضى۔ نے جواب دیا تو حقیقت میں یہ لوگ مشرک باللہ ہیں۔ وَ اِنْ صَلُّوْا وَ صَامُوْا وَ زَعَمُوْا اَنَّهُمْ مُسْلِمُوْن۔ جس طرح سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مشرکین مکہ کی عبادات قبول نہیں فرمائیں اور عقیدہ کی درستگی کا حکم دیا ویسے ہی جب تلک آج کل کے مسلمان بھی فرمانِ خدا و رسول کے موافق عقیدے درست نہ کریں گے کوئی عبادت قبول نہ ہوگی۔ واللہ اعلم.........

حرره العاجز /ابو محمد عبدالوهاب الفنجابي۔

⇦ ایسا عقیدہ رکھنے والا سرے سے اسلام میں داخل نہیں چار مذاہب کا کیا ذکر ہے.........کریم الدین عظیم آبادی

⇦ ردشرک اور نداء غیر اللہ کے سلسلہ میں دونوں مجیبوں کا جواب واقعی صحیح ہے نیز غیر اللہ کی طرف جھکنا اور جھک کر سلام کرنا یا جواب دینے کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے سختی سے منع کیا ہے اور لکھا ہے کہ بعض علماء کو جھکتے دیکھ کر دھوکہ میں نہ آئیں۔ حسبنا الله بس حفيظ الله

ابو محمد عبدالوهاب رسول الا داب خادم شریعت

⇦ ایسا عقیدہ صریح کفر اور شرک ہے۔ عبدالکریم بنگالی

⇦ الجواب صحیح۔ عبدالحمید عفی عنہ عظیم آبادی

⇦ الجواب صحیح۔ محمد زین الدین ساکن شہر بدایون حنفی المذہب

⇦ جواب بہت صحیح ہے، جو شخص ایسا عقیدہ رکھے یا رواج دے وہ بلا ریب مشرک ہے۔ ولی محمد فیض آبادی

⇦ مصطفیٰ خان سوتری

⇦ غلام حسین، ضلع مونگیر غلام حسین

⇦ ھذا الجواب صحیح۔ محمد دبیر الرحمٰن بنگالی

⇦ ابو محمد تائب علی

⇦ اس طرح کا اعتقاد رکھنے والا، فتویٰ دینے والا چاروں مذاہب میں لاریب ولا شک فیہ کافر اور مشرک ہے۔ ابو اسماعیل یوسف خان پوری پنجابی

⇦ ھذا الجواب صحیح۔ بخش پوری ثم اعظم گڑھی

⇦ جواب صحیح ہے۔ ائمہ اربعہ کے نزدیک ایسا عقیدہ بے شک کفر اور شرک ہے۔ محمد عبدالحکیم عفی عنہ

⇦ محمد عبدالغفور غزنویؒ امرتسری

⇦ سید محمد عبدالسلام غفرلہ

⇦ سید محمد ابوالحسن

⇦ محمد عبدالحمید جلیسری

⇦ ایسا عقیدہ رکھنا سراسر شرک اور کفر ہے اس کے معتقد کو اسلام میں ہرگز کوئی حصہ ونصیب نہیں ہے۔ رحیم اللہ پنجابی۔

⇦ اس عقیدہ والا شخص جیسا کہ سائل نے لکھا ہے بے شک کافر اور مشرک ہے،

چاروں مذاہب سے خارج ہونا تو برکنار ہے.....................نور محمد

⇦ جس شخص کا یہ عقیدہ ہے وہ شخص بلاشبہ مشرک ہے۔کما ثبت۔رحمت اللہ دنیاپوری

⇦ المجیب مصیب۔نمقہ علی احمد بن مولوی محمد سامرودی عفی عنہ الصمد

⇦ جس کا یہ اعتقاد ہے بلاشک سب اماموں اور صحابہ کے نزدیک کافر ہے۔ مسکین فضل الٰہی

⇦ الجواب صحیح والرائی نجیح۔محمد حمایت اللہ عفی عنہ جلیسری

(واللہ الموفق)

ایک امام کی تقلید کرنیوالے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:

۱)...... علمائے دین ومفتیان شرع متین ارشاد فرمائیں کہ: یہ گروہ مقلدین جو ایک ہی امام کی تقلید کرتے ہیں وہ اہل السنت والجماعت میں داخل ہیں یا نہیں؟

۲)...... اور ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

۳)...... اور ان کو اپنی مسجد میں آنے دینا اور ان کے ساتھ مخالطت اور مجالست جائز ہے یا نہیں؟

جواب:

۱)...... ہندوستان میں ایسے مقلدین جن کی ظاہری علامات عاملین بالحدیث سے بغض وعداوت رکھنا، ان پر افتراء وبہتان لگانا، آمین بالجہر، رفع الیدین نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا، امام کے پیچھے الحمد پڑھنا، جو کہ احادیث صحیحہ غیر منسوخہ اور اخبار مرفوعہ غیر مؤولہ سے ثابت ہیں، ان سے [1] چڑنا اور مولود وعرس وچہلم جیسی اکثر بدعاتِ شنیعہ کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ اہل سنت

---

[1] بلکہ آمین سے چڑنا یہود کی علامت ہے جیسا کہ ابن ماجہ کے "باب الجہر بآمین" میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہود نے تم پر کسی چیز میں ایسا حسد نہیں کیا جیسا کہ آمین کہنے پر کیا ہے۔ پس آمین کہنے میں زیادتی کرو۔ (یعنی خوب زور سے کہو) (ابن ماجہ، البانی ۱/۱۴۲، وصلاۃ الرسول تخریج۔ ۲۵۷، مولانا عبدالرؤف) [جاوید]

والجماعت سے خارج ہیں اور دیگر فرق ضالہ جہمیہ و مرجہ وغیرہما کی مثل ہیں، کیونکہ یہ لوگ صدہا مسائل میں عقیدہ وعملاً دونوں طور سے اہل سنت والجماعت کے مخالف ہیں، بلکہ ان کے بعض عقائد و اعمال تو صریح جھمیہ اور مرجئہ کی طرح معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ رسالہ ہذا کے ناظرین پر مخفی نہ رہے گا۔ ذیل میں ان کے چند مسائل، عقائد وعملیات کو بطور مشتے نمونہ از خروارے (ڈھیر سے ایک نمونہ) اپنے دعویٰ کی تصدیق پر بیان کئے جاتے ہیں۔

عقائد:

ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی، بلکہ فاسق، فاجر، انبیاء کرام اور فرشتوں کا ایمان برابر اور یکساں ہے، اور یہ مذہب مرجئہ کا ہے جو کہ فرق ضالہ میں سے ایک فرقہ ہے جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے رسالہ عقائد میں تحریر کیا ہے۔

دوم:

کہ جمیع مسائل میں ایک ہی امام کی تقلید واجب اور فرض جانتے ہیں۔ اگرچہ قرآن وحدیث کے خلاف ہو، حالانکہ ایسی تقلید کو علمائے احناف کرام نے شرک لکھا ہے اور آیت کریمہ ''اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' (توبہ۔۳۱) کے تحت مندرج کیا ہے۔

سوم:

جیسا کہ تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجتہاد ائمہ اربعہ پر ختم ہوگیا ہے اب کوئی دوسرا مجتہد نہیں ہوسکتا، جیسا کہ فتاویٰ درالمختار میں موجود ہے۔

چہارم:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائیں گے تو امام اعظم کی تقلید کریں گے، یہ مسئلہ بھی درالمختار ۱/۳۴ میں موجود ہے۔ نعوذ باللہ من ھذہ العقائد الفاسدة۔

عملیات:

۱) دارالحرب میں مسلمانوں کو کافروں سے سود لینا درست ہے۔(شرح وقایہ ۳/۱۳۰اردو) جیسا کہ ہدایہ مترجم فارسی مطبوعہ نولکشور جلد۳ ص۹۶ میں ہے۔ (درمختار اردو۳/۱۴۹عربی۱/۴۳)

۲) اگر کسی کو نکسیر پھوٹے اور خون نہ بند ہو تو اس کو شفا کے لئے اپنی پیشانی پر خون یا پیشاب کے ساتھ قرآن شریف کا لکھنا درست ہے...... تعظیم قرآن کی ہو تو ایسی ہی ہو!! جیسا کہ (عالمگیری طبع دہلی ج۵ ص۱۳۴ ،عربی۱/۱۵۴، درمختار ۱/۱۲۰اردو، عالمگیری ۳/۴۰۴)

۳) مشت زنی سے روزہ نہیں ٹوٹتا، جیسا کہ فتاویٰ قاضی خان جلد اول ص۱۰۰ میں موجود ہے۔ (قاضی خان۴/۳۶۱)

۴) اگر کوئی شخص نہایت مضطر ہو اور زنا کا خوف ہو تو اس کو جلق لگانا واجب ہے جیسا کہ ردالمختار حاشیہ درالمختار مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی کے ص۱۵۶ میں ہے۔

۵) اگر کوئی شخص ذکر پر کپڑا لپیٹ کر روزے کی حالت میں عورت سے جماع کرے، اگر کپڑا سخت ہے تو روزے کی قضا لازم ہے اور نہ ہی غسل واجب ہے جیسا کہ فتاویٰ بُرہَنہ مطبوعہ مطبع حسامی لاہور ج۲ ص۱۸ میں ہے۔ واہ رے روزے!!

۶) اگر کسی شخص نے ایک مغربی مرد اور عورت شرقیہ سے (ایک سال کی مسافت پر ہو) نکاح کرادیا اور نکاح کے بعد چھ ماہ بعد عورت نے بچہ جنا تو اسی مغربی کی طرف منسوب ہوگا اور اسے کرامت کہا جائے گا۔ اگرچہ میاں بیوی میں ملاقات نہیں ہوئی۔ کرامت ہو تو ایسی ہی ہو!! جیسا کہ فتح القدیر حاشیہ ہدایہ مطبوعہ مطبع نولکشور ج۲ ص۳۲۸ میں موجود ہے۔ (تبلیغی بہشتی زیور ص۲۴۰ لاہور)

۷) وہ جانور جو سور کے گوشت سے پالا گیا ہو وہ حلال ہے جیسا کہ غایۃ الاوطار ترجمہ اردو درالمختار مطبع نولکشور ۴/۱۹۶ میں موجود ہے۔

۸) زنا کی خرچی درست ہے۔ جیسا کہ چلپی حاشیہ شرح وقایہ مطبوعہ مطبع نولکشور ص۲۹۸ کے حاشیہ میں ہے۔

۹) سور کا چمڑا دباغت دینے سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کی بیع جائز ہے جیسا کہ منیۃ المصلی مطبع لاہور ص۳۲ میں ہے۔ (عربی ص۴۹ طبع مجتبائی)

۱۰) زکاۃ میں حیلہ سازی درست ہے یعنی اگر کوئی شخص اپنے مال کو سال گزرنے سے قبل اپنی بیوی یا کسی اور کو ہبہ کردے اس نیت سے زکاۃ نہ دینی پڑے، پھر سال پورا ہونے کے بعد واپس کرے تو جائز ہے۔ امام ابو یوسف ایسا ہی کیا کرتے تھے جیسا کہ (احیاء العلوم عربی نولکشور ۱/۱۱، درمختار ۱/۵۰۵، عالمگیری ۱۰/۳۳۴، ۳۳۵)

۱۱) اگر کوئی شخص چوپائے یا مردے میں دخول کرے اور انزال نہ ہو تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا اور نہ ہی غسل واجب ہوتا ہے جیسا کہ فتاوی قاضی خان مطبع نولکشور ج۱ ص۱۰۵ میں ہے۔

۱۲) قضائے قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی کی عورت پر دعویٰ کرے کہ یہ میری بیوی ہے اور قاضی کے سامنے جھوٹی گواہی پیش کر کے مقدمہ جیت لیا اور وہ عورت اس کو مل جائے تو وہ عورت عنداللہ وعندالناس حلال ہو جائے گی اور اس سے صحبت جائز ہوگی اور خدا کے نزدیک مواخذہ میں گرفتار نہ ہوگا۔ (ہدایہ مطبع مصطفائی ۲/ ۱۲۵، شرح وقایہ ۳/۵۹)

۱۳) اگر کوئی شخص تشہد کے بعد قصداً گوز مارے تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ جس طرح کہ (شرح وقایہ عربی مطبع نولکشور میں ۴۳، اردو ۱/۱۰۴)

۱۴) اگر کوئی شخص کسی کی لونڈی گروی رکھے پھر اس سے زنا کرے تو اس پر حد نہیں آتی اگرچہ وہ جانتا ہو کہ یہ لونڈی مجھ پر حرام ہے...... زنا ہو تو ایسا ہو!! جیسا کہ ہدایہ مترجم فارسی چھاپہ نولکشور ج ۲ ص۳۰۲۔۳۰۳ میں ہے۔

جواب:

۲)...... نماز ایسے مقلدین کے پیچھے جائز نہ ہوگی، کیونکہ مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے عقائد اور اعمال اہل سنت والجماعت کے مخالف ہیں، بلکہ بعض عقائد اور اعمال موجب شرک اور بعض مفسد نماز ہیں۔

۳)...... ایسے مقلدوں کو اپنی مسجد میں آنے دینا بہ حکم آیت "اَخْرِجُوْهُمْ مِنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ" (البقرہ/۱۹۹) شرعاً درست نہیں ہے اور بحکم آیت کریمہ "فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ" (انعام/۶۰) ان سے مخالطت، مجالست اور شادی وغمی کے مراسم رکھنا حرام ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

واضح ہو کہ دہلی شہر میں کمشنر صاحب نے باہم ہر دو فریق میں صلح کرادی تھی اور اس مضمون کی ایک تحریر جانبین میں طے پائی تھی کہ کوئی شخص دوسرے سے متعرض نہ ہو اور بشرط عدم مفسدات نماز کی رعایت کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لیا کریں، مگر ان مقلدین نے پھر اس صلح نامہ کے نہ مانتے ہوئے چند لایعنی قسم کی وجوہات قائم کرکے پھر دہلی شہر میں سابقہ حالات کی مانند موحدین کے خلاف اشتہارات اور رسالہ جات شائع کرنا شروع کردیئے اور اپنے عہد نامہ کا ذرہ خیال نہ کیا۔

حررہ محمد عبداللہ الحسنی المحمدی الدہکاوی۔

اسمائے گرامی مؤیدین علمائے کرام:

محمد عبداللہ ۱۲۹۸ھ	خادم حسین ۱۲۸۰ھ
محمد ابراہیم ۱۲۹۶ھ	غلام الرحمٰن ۱۲۹۹ھ
محمد کیوڑہ ۱۲۹۷ھ	عبدالرحمٰن ۱۲۹۰ھ
محمد مہدی ۱۲۹۹ھ	الٰہی بخش ۱۲۹۹ھ
کریم بخش ۱۲۹۹ھ	عبدالصمد ۱۲۹۸ھ
عبدالقیوم ۱۲۹۷ھ	خدا بخش ۱۲۹۹ھ
محمد جمیل ۱۲۹۰ھ	عبدالرحیم ۱۲۹۰ھ
عبدالعزیز ۱۲۹۹ھ	محمد عبدالرؤف ۱۲۹۹ھ
محمد اسماعیل ۱۲۹۹ھ	محمد عبدالغفور ۱۲۹۹ھ

(واللہ المستعان)

جماعت کھڑی ہو جانے کے بعد سنتوں کے پڑھنے کا حکم

سوال:

علمائے دین اس مسئلہ کے متعلق فرمائیں کہ نمازِ فجر کی فرض جماعت کے کھڑے ہو جانے کے بعد دو رکعت سنتِ فجر مسجد کے اندر خواہ صف کے قریب ہو یا دور پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں؟ حنفی کتب کی معتبر کتب سے اردو زبان میں جواب تحریر فرمائیں، اور اس باب میں کوئی صحیح حدیث کراہت یا عدم کراہت پر وارد ہوئی ہے یا نہیں؟ بیان فرمائیں ثواب پائیں۔

جواب: جماعت قائم ہونے کے بعد سنتیں پڑھنے کا عدم جواز:

(فقہاء کی نظر میں)

جب مسجد میں جماعت قائم ہو تو اس کے بعد فجر کی سنتیں مسجد میں پڑھنا مکروہ ہیں خواہ صف کے پاس پڑھے یا دور، دونوں صورتوں میں مکروہ ہیں، کیونکہ اس میں یہ مخالفت پائی جاتی ہے کہ امام جماعت کرا رہا ہے اور یہ شخص جماعت سے علیحدہ سنتیں پڑھ رہا ہے۔ جیسا کہ ہدایہ، فتح القدیر حاشیہ ہدایہ، درمختار، فتاویٰ دلواجیہ، فتاویٰ عالمگیری اور محیط رضوی سے سمجھا جاتا ہے، جہاں ہدایہ فقہ حنفی کی بہت معتبر کتاب ہے وہاں فتح القدیر بھی معتبر ہے جو کہ علمائے احناف پر مخفی نہیں ہے اور صف کے قریب سنتیں پڑھنے میں اشد کراہت ہے جیسا کہ جہلاء کا اس پر عمل درآمد ہے۔ ایسا ہی فتح القدیر میں ہے، اور کراہت کی دلیل بموجب حدیث ہے۔ حدیث آئندہ ذکر ہوگی۔ ہدایہ کی عبارت درج ذیل ہے:

و من انتهى الى الامام فى صلوة الفجر و هو لم يصل ركعتى الفجر ان خشى ان تفوته ركعة و يدرك الاخرى يصلى ركعتى الفجر عند باب المسجد ثمّ يدخل وان خشى فوتهما دخل مع الامام لأنّ ثواب الجماعة اعظم والوعيد بالتّرك الزم والتّقييد بالاداء عند باب المسجد يدلّ على الكراهة فى المسجد اذا كان الامام فى الصلاة- (هدایه۱/۱۵۲، فتح القدیر ابن همام۱/ ۳۳۹)

''جو شخص مسجد میں آیا اور امام جماعت کرا رہا ہے اور آنے والے نے فجر کی سنت نہیں پڑھی تو اگر اسے اندیشہ ہو کہ ایک رکعت نکل جائے گی اور دوسری رکعت مل جائے گی تو فجر کی سنت اگر جگہ ملے تو مسجد کے دروازہ کے نزدیک ادا کر کے جماعت میں مل جائے اور اگر یہ خدشہ ہو کہ سنتیں ادا کرنے میں فرض کی دونوں رکعتیں جماعت سے فوت ہوجائیں گی تو جماعت میں شامل ہوجائے اور سنتیں چھوڑ دے اس لئے کہ جماعت کا ثواب بہت زیادہ ہے اور اس کے ترک سے سخت وعید لازم آتی ہے اور سنت کے ادا کرنے میں مسجد کے دروازے کے نزدیک کی شرط سنتوں کے مسجد میں ادا کرنے کی کراہت پر دلالت کرتی ہے جبکہ امام جماعت کرا رہا ہے۔''

اور ایسا ہی فتح القدیر اور در مختار وغیرہ کا مفہوم ہے اور ''دروازہ مسجد سے نزدیک'' سے مراد خارج مسجد ہے۔ یعنی مسجد کے دروازہ سے قریب مسجد سے باہر اگر کوئی جگہ ہو تو وہاں سنت ادا کر کے جماعت میں شامل ہوجائے اور اگر کوئی جگہ نہ ہو تو فرض جماعت میں مل جائے اور مسجد میں سنت ادا نہ کرے کہ مسجد کے اندر سنت ادا کرنے میں کراہت لازم آئے گی، کیونکہ ادائیگی سنت پر مکروہ کا ترک کردینا مقدم ہے، اکہ فتح القدیر در مختار وغیرہ سے صاف معلوم ہو رہا ہے۔

قوله: والتّقييد بالاداء عند باب المسجد يدلّ على الكراهة فى المسجد اذا كان الامام فى الصّلاة لما روى عنه عليه الصّلاة والسّلام "اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلاَةُ فَلاَ صَلاَةَ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ" و لانّه يشبه المخالفة للجماعة والانتباز عنهم فينبغى ان لا يصلّى فى المسجد اذا لم يكن عند باب المسجد مكان لانّ ترك المكروه مقدّم على فعل السّنّة غير انّ الكراهة تتفاوت فان كان الامام فى الصّيفى فصلاته ايّاها فى الشّتوى اخفّ من صلاتها فى الصّيفى وعكسه اشدّ مايكون كراهية ان يّصلّيها مخالطا للصّفّ كما يفعله كثير من الجهلة (فتح القدير)

واذاخاف فوت ركعتى الفجر لاشتغاله بسنّتها تركها لكون الجماعة اكمل والا بان رجا ادراك ركعة فى ظاهر المذهب و قبل التشهّد واعتمده المصّنف والشّرنبلانى تبعا للبحر لكن ضعّفه فى النّهر لا يتركها بل يصلّيها عند باب المسجد ان وجد مكانا والا تركها لان ترك المكروه مقدم على فعل السنة- (درمختار)

قوله: عندباب المسجد اى خارج المسجد كما صرّح به القهستانى(كذانى الشامى) يصلّى ركعتى الفجر عند باب المسجدثمّ يدخل و ان خشى فوفتهما ادخل مع الامام(عالمگيرية ١ / ١٢٠)

وذكر الولوالجى امام يصلّى الفجر فى المسجد الدّاخل فجاء رجل يصلّى الفجر فى المسجد الخارج، اختلف المشائخ فيه: قال بعضهم لا يكره وقال بعضهم

یکرہ لانّ ذلک کلّہ کمکان واحد بدلیل جواز الاقتداء لمن کان فی المسجد الخارج من کان فی المسجد الدّاخل و اذا اختلف المشائخ فالاحتیاط ان لا یفعل -(انتھی بحرالرائق ۲/ ۴۸)(داری ۱/ ۲۷۷، فتح القدیر ۱/ ۳۴۰، درمختار ۱/ ۵۳۰، فتح الباری ۲/ ۱۴۸، مسلم ۱/ ۴۹۳)

''مسجد کے دروازے کے پاس سنت فجر ادا کرنے کی شرط مسجد میں ادا کرنے کی کراہت پر دلالت کرتی ہے امام جبکہ جماعت کروا رہا ہو۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ: جب نماز (جماعت) کھڑی ہو جائے یعنی جب مؤذن اقامت شروع کرے تو اس وقت نماز پڑھنی درست نہیں ماسوا فرض نماز کے''، اور اس لئے کہ وہ جماعت سے مخالفت اور ان سے علیحدگی کے مشابہ ہے، تو جب مسجد کے دروازہ کے پاس جگہ نہ ہو تو لازمی ہوا کہ مسجد میں (سنت) نماز نہ پڑھی جائے اس لئے مکروہ کا ترک کرنا سنت کے عمل پر مقدم ہے۔ البتہ کراہت میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ سو امام کی سرما کی نماز گرما کی نماز سے خفیف ہوگی اور اس کے برعکس کراہت شدت اختیار کر جائے گی جبکہ نماز صف ہی میں کھڑے ہو کر پڑھے گا جیسا کہ بیشتر جاہل ایسا کرتے ہیں۔ (فتح القدیر)

اور جب دو سنتوں کے پڑھنے سے نمازِ فجر کی دونوں رکعتوں کے نکل جانے کا اندیشہ ہو تو انہیں ترک کر دے اس لئے کہ جماعت زیادہ کامل ہے، وگرنہ ظاہر مذہب میں اسے ایک رکعت کے پائے جانے اور تشہد سے قبل کی توقع ہو، مصنف اور شرنبلانی نے بحر کی پیروی میں اسی پر اعتماد کیا ہے لیکن اسے ''النہر'' میں ضعیف قرار

دیا ہے اس لئے کہ مکروہ کا ترک کرنا سنت کے عمل پر مقدم ہے،
(درمختار) قولہ: ''مسجد کے دروازے کے پاس'' یعنی مسجد سے باہر
جیسا کہ قہستانی کے تصریح کی ہے (شامی) فجر کی دو سنتیں مسجد کے
دروازے کے پاس ادا کرے گا پھر اندر چلا جائے (عالمگیری)

اور ولوالجی نے ذکر کیا ہے کہ: امام مسجد کے اندر فجر کی
نماز پڑھا رہا ہو تو ایک شخص آ کر مسجد کے باہر فجر ادا کرے، مشائخ
کا اس میں اختلاف ہے: بعض نے کہا مکروہ نہیں ہے اور بعض
کے نزدیک مکروہ ہے۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ہی جگہ کے حکم
میں ہے، بدلیل کہ جو خارج از مسجد ہے اس کے لئے مسجد سے
اندر والے کی اقتداء جائز ہے۔ سو جب علماء کا اختلاف ہے تو
احتیاط اسی میں ہے کہ ایسا نہ کیا جائے۔ (بحرالرائق)

اور جماعت کے کھڑے ہو جانے کے بعد سنت فجر ادا کرنے کی کراہت کی
دلیل صاحب ہدایہ اور صاحب فتح القدیر وغیرہ کے نزدیک یہ حدیث شریف ہے: اِذَا
اُقِيْمَتِ الصَّلاَةَ فَلاَ صَلاَةَ اِلاَّ الْمَكْتُوْبَةَ (ترجمہ) ''جب نماز کھڑی ہو جائے یعنی
مؤذن اقامت شروع کرے تو اس وقت ماسوا فرض نماز کے نماز پڑھنی درست نہیں''۔
جیسا کہ اس حدیث کو مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد بن حنبل، ابن حبان اور
بخاری نے ترجمۃ الباب میں نقل کیا ہے۔ اور محدث ابن عدی نے حسن سند کے ساتھ
اس کے بعد یہ نقل کیا ہے کہ: ''اے خدا کے رسول اور نہ دو رکعت سنت فجر کی؟'' یعنی کسی
نے پوچھا کہ اقامت کے وقت فجر کی سنت بھی نہ پڑھے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ ''جب اقامت ہونے لگے تو فجر کی سنت بھی نہ پڑھے۔''

جماعت کھڑی ہونیکے بعد سنتوں کی ممانعت احادیث کے تناظر میں:

۱)...... مؤطا امام مالک میں اس طرح سے روایت ہے کہ: چند شخص مؤذن کی
اقامت سن کر دو رکعت سنتِ فجر پڑھنے لگے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

گھر سے مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا: کیا دو نمازیں سنت اور فرض اکٹھی ایک خاص وقت میں؟ کیا دو نمازیں سنت و فرض اکٹھی ایک خاص وقت میں؟ یعنی از راہ انکار و توبیخ اور سرزنش کے طور پر یہ فرمایا، کیا تم لوگ اقامت کے بعد دو نمازیں سنت اور فرض اکٹھی پڑھتے ہو؟ جیسا کہ محلی شرح موطا میں منقول ہے۔

۲)...... اور جماعت کھڑی ہونے کے وقت فجر کی سنتیں پڑھنے کے انکار کی دوسری حدیث جو کہ حضرت عبداللہ بن بُحینہؓ سے مروی ہے کہتے ہیں:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأٰى رَجُلاً وَقَدْ اُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ فَلَمَّا انْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاثَ بِهِ النَّاسُ، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصُّبْحَ اَرْبَعًا؟![1]

"کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جماعت کھڑی ہونے کے وقت فجر کی سنتیں پڑھ رہا ہے پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز سے فارغ ہوئے تو لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے توبیخ و انکار فرمایا کہ: کیا تم نمازِ فجر چار رکعت پڑھتے ہو؟

۳)...... اور صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن بُحَینہ رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے کہتے ہیں کہ:

اُقِيْمَتْ صَلَاةُ الصُّبْحِ فَرَأٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلاً يُصَلِّي وَالْمُؤَذِّنُ يُقِيْمُ فَقَالَ اَتُصَلِّي الصُّبْحَ اَرْبَعًا؟[2]

"صبح کی نماز کی اقامت ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] رواہ البخاری، فتح الباری ۲/ ۱۴۸ [2] مسلم ۱/ ۲۴۷، محلی ابن حزم ۳/ ۱۰۷، مصابیح السنۃ ۱/ ۳۹۲

ایک شخص کو دیکھا وہ فجر کی سنتیں پڑھنے لگا اور مؤذن اقامت کہہ رہا ہے، سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرمایا: کیا تو صبح کی چار رکعت پڑھتا ہے؟"

۴)...... اور صحیح مسلم، ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں:

دَخَلَ رَجُلٌ الْمَسْجِدَ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي صَلَاةِ الْغَدَاةِ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ فِي جَانِبِ الْمَسْجِدِ ثُمَّ دَخَلَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا سَلَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَا فُلَانُ بِأَيِّ الصَّلَاتَيْنِ اِعْتَدَدْتَ أَبِصَلَاتِكَ مَعَنَا؟ (ابن ماجہ ۱/ ۱۹۰، ابوداود ۱/ ۱۸۰، مسلم ۱/ ۲۴۴، نسائی ۱/ ۱۸۸)

"کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ صبح میں تھے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ صبح کی امامت کروا رہے تھے، پھر اس شخص نے دو رکعت سنتِ فجر مسجد کے ایک جانب ہو کر پڑھی، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جماعت میں داخل ہوا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا فرمایا: اے فلاں تو نے ان دونوں نمازوں میں سے کونسی نماز کو فرض شمار کیا، کیا وہ نماز جو تو نے تنہا پڑھی اس کو فرض ٹھہرایا یا جو تم نے ہمارے ساتھ پڑھی اس کو؟

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بطور سرزنش و انکار کے یہ بات فرمائی۔

پس اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جماعت کھڑی ہونے کے وقت سنتوں کا پڑھنا مکروہ وممنوع ہے۔

۵)...... ایک اور روایت حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم اور ابن

ماجہ میں ہے کہ:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِرَجُلٍ یُصَلِّی وَ قَدْ اُقِیْمَتِ صَلاۃُ الصُّبْحِ فَکَلَّمَہُ بِشَیْءٍ لاَ نَدْرِیْ مَاھُوَ، فَلَمَّا انْصَرَفْنَا اَحَطْنَابِہٖ نَقُوْلُ لَہٗ مَاذَا قَالَ لَکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ؟ قَالَ لِیْ: یُوْشِکُ اَنْ یُّصَلِّیَ اَحَدُکُمُ الصُّبْحَ اَرْبَعًا۔ (مسلم ۱/۴۹۳، ابن ماجہ ۱/۱۹۰)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے وہ فجر کی سنتیں پڑھ رہا تھا اس حال میں کہ صبح کی نماز قائم ہو چکی تھی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے گفتگو فرمائی، ہمیں نہیں معلوم آپ نے اس سے آہستہ سے کیا فرمایا، پھر جب ہم لوگ نماز سے فارغ ہوئے تو ہم اس کے گرد جمع ہوئے اور کہا: تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا؟ اس نے کہا کہ آپ نے مجھے یہ فرمایا تھا کہ: "قریب ہے کہ تم سے کوئی شخص صبح کے چار فرض پڑھے گا۔"

یعنی جماعت کے کھڑے ہونے کے وقت سنتوں کا پڑھنا فرائض کے برابر ٹھہراتا ہے۔ آخر کار آہستہ آہستہ سنت کو بمنزلہ فرض کے سمجھو گے اور اس طرح کا اعتقاد سنت کو فرض کے درجہ کے برابر پہنچا دے گا، سنت اور فرض میں امتیاز نہ رہے گا اور ایسا اعتقاد میری مرضی کے خلاف ہوگا اور جو کسی کا اعتقاد میری مرضی کے خلاف ہوگا وہ مردود اور بدعت وضلالت ہوگا۔"

"اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلاۃُ فَلاَ صَلاۃَ اِلاَّ الْمَکْتُوْبَۃَ" حدیث مرفوع أخرجه مسلم والاربعة عن ابی هريرة وأخرجه ابن حبان بلفظ: اِذَا اَخَذَا الْمُؤَذِّنُ فِی الْاِقَامَۃِ، وَأَحْمَدُ بِلَفْظٍ: فَلاَ صَلاۃَ اِلاَّ الَّتِیْ اُقِیْمَتْ وَھُوَ الْأَخَصُّ۔ وزادابن

علیٰ بسند حسن: ... یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَلَا رَکْعَتَی الْفَجْرِ؟ قَالَ: وَلَا رَکْعَتَی الْفَجْرِ، (تور پشتی)-(ارشاد الساری ۲/۳۴-۳۵)

وھکذا فی القسطلانی مالک عن شریک بن عبداللّٰہ بن ابی نمر انہ سمع قوم الاقامۃ فقاموا یصلّون ای التّطوّع، فخرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال: اُصَلٰوتَانِ ای السّنّۃ والفرض معا ای موصولا فی وقت واحد، اُصَلٰوتَانِ مَعًا، وذلک فی صلوۃ الصّبح فی الرّکعتین اللّتین قبل الصّبح-(مسلم مختصر البانی ٦٧، ابن حبان ۳/ ۳۰۷)

"اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوۃُ ....الخ" مرفوع حدیث ہے (مسلم) اور چاروں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے جب مؤذن اقامت شروع کردے تو کوئی نماز نہیں ہوتی ماسوائے فرض کے اور احمد نے: وہی نماز ہوگی جس کے لئے اقامت کہی گئی ہے، کے ساتھ خاص کرتے ہوئے روایت کیا ہے۔ اور ابن عدی ۱/۲۳۴ نے "حسن سند" کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: "کہا گیا اے اللہ کے رسول نہ ہی فجر کی دو رکعتیں، فرمایا، نہ ہی فجر کی دو رکعتیں" تور پشتی اور ایسے قسطلانی میں مالک نے شریک بن عبداللہ بن ابی نمر سے روایت کیا ہے کہ: انہوں نے ایک جماعت میں اقامت سنی، تو وہ اٹھ کر نوافل پڑھنے لگے، سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور فرمایا: کیا دو نمازیں، سنت اور فرض ایک ساتھ، یعنی ایک ہی وقت میں ایک ساتھ دو نمازیں؟ اور یہ بات فجر میں پہلی دو سنتوں سے متعلق ہے۔

فقہاء کے اقوال:

اعلم انّہ قد اختلف فی اداء سنّۃ الفجر عند الاقامۃ،

فکرهه الشّافعیّ و احمد عملا بتلک الأحادیث- و قالت المالکیّة لا یبتدء الصّلوة بعدالاقامة لا فرضا ولا نفلا لحدیث "اِذَااُقِیْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَاصَلَاةَ اِلَّا الْمَکْتُوْبَةَ" واذا اقیمت فی الصّلاة قطع ان خشی فوت رکعة والا اتمّ-واستدلّ بعموم الحدیث من قال بقطع النّافلة، اذا اقیمت الفریضة، وبه قال ابوحامد وغیره- (مغنی ۲/۱۱۹)

"جان لیجئے کہ اقامت کے وقت فجر کی سنتوں کی ادائیگی میں اختلاف ہے: امام شافعی اور امام احمد نے انہیں احادیث پر عمل کرتے ہوئے اسے مکروہ جانا ہے اور مالکیہ کہتے ہیں کہ حدیث "اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلَاةُ ....الخ" پر عمل کرتے ہوئے اقامت کے بعد نہ فرض اور نہ ہی نفل نماز کی ابتداء کرے اور جب اقامت کہہ دی جائے اور وہ نماز میں ہو اور اسے رکعت کے ضائع ہو جانے کا خدشہ ہو تو نماز توڑ ڈالے، وگرنہ پورا کرے اور جس نے یہ کہا کہ نفل توڑ ڈالے اس نے عمومِ حدیث "اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلَاةُ ....الخ" سے استدلال کیا ہے، یہی قول ابو حامد وغیرہ کا ہے۔"

و خصّ أخرون النّهی بمن ینشأ النّافلة عملا لقوله "وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَکُمْ" ثمّ زاد مسلم بن خالد عن عمرو بن دینار فی قوله صلی اللّٰه علیه وسلم اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ اِلَّا الْمَکْتُوْبَةَ ، قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَلَا رَکْعَتَی الْفَجْرِ؟ قَالَ وَلَا رَکْعَتَی الْفَجْرِ، اَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِیٍّ وَ سَنَدُهُ حَسَنٌ- (کامل ۱/۲۹۱_۳۱۰،۲/۶۷۸)

"اور دوسروں نے آیت "اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو" سے

استدلال کرتے ہوئے نہی کو نماز کی ابتداء کرنے والے کے لئے خاص کیا ہے۔ پھر مسلم بن خالد نے عمرو بن دینار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں زیادہ کیا ہے: جب نماز کھڑی ہو جائے تو فرض نماز کے سوا کوئی نماز نہیں ہوتی، کہا گیا اے اللہ کے رسول اور نہ ہی فجر کی دو سنتیں؟ فرمایا، نہ ہی فجر کی دو سنتیں۔" ابن عدی بسند حسن۔

سنت فجر کا استثنیٰ اور حدیث کے طرق:

و امّا زیادة "اِلَّا رَكعَتَى الصُّبحِ" فِي الْحَدِيثِ، فقال البیھقیّ: هذه الزّيادة لا اصل لهما، كذا في المحلّٰى عن ابی هريرة رضى الله عنه قال: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلاةُ فَلاَ صَلاَةَ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ-و فی الباب عنّ ابن بُحَيْنَة و عبدالله بن عمر و و عبد الله بن سرجس وابن عبّاس و انس رضى الله عنهم، قال ابوعیسٰی: حدیث ابی هريرة حديث حسن- و كذا روى ايّوب و وَرْقَاءُ ابن عمرو و زياد بن سعد و اسماعيل بن مسلم و محمّد بن جحادة عن عمرو بن دينار عن عطاء عن ابی هريرة رضى الله عنه عن النّبیّ صلى الله عليه وسلم، وروى حمّادبن زيد و سفيان بن عُيَيْنَةَ عن عمرو بن دينار ولم يرفعاه والحديث المرفوع اصحّ عندنا-و قدروى هذا الحديث عن ابی هريرة عن النّبیّ صلى الله عليه وسلم من غير هذا الوجه، رواه عيّاش بن عبّاس القُتبانیّ المصریّ عن ابی سلمة عن ابی هريرة عن النّبیّ صلى الله عليه وسلم عند اهل العلم من

اصحاب النبیّ صلی اللّٰہ علیه وسلم وغیرھم: اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوۃُ اَنْ لَّا یُصَلِّیَ الرَّجُلُ اِلَّا الْمَکْتُوْبَةَ و به یقول، سفیان الثّوریّ وابن المبارک والشّافعیّ و احمد و اسحاق-ترمذی (عرف الشذی ۱/۹۷، محلی ابن حزم ۳/۱۰۶)

''اور حدیث میں (اذا اقمیت الصلوۃ والی روایت میں) اِلَّا رَکْعَتَی الْفَجْرِ، یعنی فجر کی دو رکعتوں کے علاوہ کا اضافہ بے اصل ہے۔ ایسا ہی محلّٰی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب فرض نماز کھڑی ہوجائے تو فرض نماز کے سوا کوئی نماز نہیں ہوتی۔ اور اس باب میں حضرت ابن بُحینہ، عبداللہ بن عمرو، عبداللہ بن سرجس، ابن عباس، اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے۔ ابو عیسیٰ'' نے کہا: حضرت ابوہریرہؓ کی روایت حسن ہے۔ اسی طرح ایوب، ورقاء بن عمرو، زیاد بن سعد، اسماعیل بن مسلم اور محمد بن جحادہ نے عمرو بن دینار سے اور انہوں نے عطاء بن یسار سے، انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ حماد بن زید اور سفیان بن عینیہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے مرفوع نہیں کہا اور مرفوع حدیث ہمارے نزدیک زیادہ صحیح ہے اور یہی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طریق کے علاوہ سے بھی مروی ہے۔ عیاش بن عباس القتبانی المصری نے ابوسلمہ سے، انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور دیگر اہل علم کا اسی پر عمل رہا ہے

کہ: جب جماعت کھڑی ہو جائے تو آدمی ماسوائے فرض نماز کے دوسری نماز نہ پڑھے۔ یہی قول سفیان ثوری، ابن مبارک، امام شافعی، احمد اور اسحاق کا ہے۔ (ترمذی)

عن عطاء بن یسار عن ابی هریره رضی اللّٰه عنه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال اُقِیْمَتِ الصَّلاةُ اَنْ لاَّ یُصَلِّی الرَّجُلُ اِلاَّ الْمَکْتُوْبَةَ ، و حدیث محمد بن حاتم و ابن رافع قالا حدثنا شبابه قال حدثنی ورقاء بهذا الاسناد- و حدثنی یحیی ابن حبیب الحارثی قال حدثنا روح قال حدثنا زکریا ابن اسحاق قال حدثنا عمرو بن دینار قال سمعت عطاء بن یسار یقول عَنْ اَبِی هُرَیْرَة رضی اللّٰه عنه عَنِ النَّبِیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم اَنَّهُ قَالَ: اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلاَةُ فَلاَ صَلاَةَ اِلاَّ الْمَکْتُوْبَةَ-

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب جماعت کھڑی ہو جائے تو ماسوائے فرض کے اور نماز نہ پڑھو۔“

(ایک اور دوسری سند سے یہی حدیث مروی ہے)

حدثناه عبد بن حمید قال حدثنا عبدالرزاق قال اخبر نا زکریّا بن اسحاق لهذا الاسناد مثله -وحدّثنا حسن الحلوانی قال حدّثنا یزید بن هارون قال اخبرِنا حماد بن زید عن ایّوب عن عمرو بن دینا رعن عطاء بن یسار عن ابی هریرة رضی اللّٰه عنه عن النّبیّ صلی اللّٰه علیه وسلم بمثله-

(مذکورہ حدیث دو اور اسناد کے ساتھ مروی ہے)

قال حمّاد ثمّ لقیت عمروا فحدّثنی به و لم یرفعه (صحیح مسلم مختصرا)

''حماد نے کہا پھر میں عمرو سے ملا تو انہوں نے مجھے حدیث بیان کی لیکن مرفوع نہیں کہا۔ (مسلم)

قوله: ''قَالَ حَمَّادُ ثُمَّ لَقِیتُعَمْروا فَحَدَّثَنِی بِهِ وَ لَمْ یَرْفَعْهُ''

هذا الکلام لایقدح فی صحّة الحدیث و رفعه لانّ اکثر الرّواة رفعوه-وقال التّرمذیّ و روایة الرّفع أصحّ، و قد قدمنا فی الفصول السّابقة فی مقدّمة الکتاب انّ الرّفع مقدّم علی الوقف علی المذهب الصّحیح و ان کان عدد الرّفع اقلّ فکیف اذا کان اکثر (نووی شرح مسلم، وهکذافی تدریب الرّاوی ۱/۲۴۷)

''ان کا یہ کہنا: کہ حماد نے کہا پھر میں عمرو کو ملا تو مجھے انہوں نے بیان کیا اور اس کو مرفوع نہیں کہا'' یہ صحت حدیث اور مرفوع ہونے میں مضر نہیں ہے، اس لئے کہ اکثر رواۃ نے اس کو مرفوع بیان کیا ہے، ترمذی نے کہا: مرفوع ہونا زیادہ درست ہے۔ اور یہ بات مقدمۃ الکتاب کی سابقہ فصول میں بیان ہو چکی ہے کہ: صحیح مذہب میں مرفوع، موقوف پر مقدم ہے اگرچہ مرفوع کی تعداد کم ہو، تو اس کا حال کیسا ہوگا جہاں مرفوع کی تعداد بھی زیادہ ہو۔ (تدریب الراوی)

گوشۂ مسجد میں سنتیں پڑھنے کی دلیل اور اس کا جواب:

یاد رہے کہ ابراہیم حلبی شارح منیة المصلی تلمیذ ابن الہمام وغیرہ نے طحاوی وغیرہ سے جو نقل کیا ہے کہ: صحابہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوالدرداءؓ اور تابعین میں سے مسروق، حسن بصری اور ابن جبیر وغیرہ نے جماعت کھڑی ہو جانے کے بعد سنتِ فجر گوشۂ مسجد میں پڑھ کر جماعت میں شامل ہوئے تو اس دلیل سے مسجد میں

اقامتِ صلاۃ کے بعد سنت کا پڑھنا جائز معلوم ہوتا ہے، سو یہ نقل صاحب ہدایہ اور صاحب فتح القدیر جو کہ محقق حنفی المذہب ہیں اسے ضرور نقل کرتے بلکہ اس کے برعکس حدیث "اِذَا اُقِيمَتِ الصَّلاةُ فَلا صَلاةَ اِلَّا الْمَكْتُوبَةَ" سے فجر کی سنت مسجد میں پڑھنے کو مکروہ لکھا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ طحاوی وغیرہ کا قول جو ابراہیم حلبی نے ذکر کیا ہے صاحب ہدایہ اور صاحب فتح القدیر کے ہاں پایہ اعتبار سے ساقط ہے ورنہ وہ اسے ضرور نقل کرتے۔

بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مخالف عمل مذکور ہے، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ جماعت کے قائم ہونے کے بعد سنتِ فجر پڑھ رہا ہے تو اسے مارا اور تعزیر دی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ مؤذن کی اقامت کے وقت فجر کی سنت پڑھنے لگا تو اسے کنکر مارا۔(بیہقی ۲/۴۸۳، مجلی شرح مؤطا)

ابن مسعودؓ کے عمل کا جواب:

اگر بالفرض عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ نے فجر کی سنت پڑھی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ان کی حدیث نہ پہنچی ہو اور نہی کی حدیث ان تک نہ پہنچنا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ عبداللہ بن مسعودؓ کے لئے رکوع میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھنا مخفی رہا اور وہ ہمیشہ پہلے دستور کے مطابق دونوں ہاتھ ملا کر ران میں رکھتے تھے اور اس مسئلہ میں انہوں نے تمام صحابہؓ کی مخالفت کی، چنانچہ صحاح میں مذکور ہے کہ دونوں ہاتھ ملا کر ران میں رکھنا منسوخ ہو چکا ہے مگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو نسخ کی حدیث نہیں پہنچی، حالانکہ ہر نماز میں رکوع کے وقت گھٹنوں پر ہاتھ رکھنا مدام معمول ہے اور ایسا مشہور فعل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر مخفی رہا۔ سو اسی طرح جماعت کھڑی ہو جانے کے وقت مسجد کے اندر سنتِ فجر ادا کرنے کی نہی والی حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوالدرداءؓ کو نہ پہنچی۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوالدرداءؓ "وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى" قرأت کی بجائے "وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى" پڑھتے تھے حالانکہ قرأت

"وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى" جمہور صحابہ کے نزدیک متواتر ہے اور یہی قرأت متواترہ اسی طرح ہر قرآن کریم اور مصحف عثانی میں مذکور ہے اور یہ قرأت متواترہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور ابوالدرداءؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پہنچی، جیسا کہ فتح الباری ۸/۷۰۷ وغیرہ میں یہ قصہ مذکور ہے۔

سو اس حدیث نہی کے لاعلمی کے سبب اگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ نے فجر کی سنت کبھی مسجد میں جماعت کے قائم ہونے کے وقت پڑھی ہو تو وہ معذور ٹھہریں گے اور جو صحیح حدیث چھ سات صحابہ کرامؓ سے منقول ہے اور آیت کریمہ "وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا" (الحشر:۷) کے موجب، ہمارا سنتیں پڑھنا حجت نہیں ہو سکتا۔

حضرت عمرؓ کا عمل:

تو امت پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل اور تقریر واجب الاتباع ہے اور حضرت عمرؓ کی بابت پیچھے گزر چکا ہے کہ:

وقدروی عن عمرؓ: اَنَّهٗ كَانَ اِذَا رَاٰى رَجُلًا يُصَلِّي وَهُوَ يَسْمَعُ الْاِقَامَةَ ضَرَبَهٗ، وَ عَنِ ابْنِ عُمَر رضی اللہ عنهما اَنَّهٗ اَبْصَرَ رَجُلًا يُصَلِّي الرَّكْعَتَيْنِ وَالْمُؤَذِّنُ يُقِيْمُ فَحَصَبَهٗ (محلی)(ابن حزم ۳_۱۰۹)

"انہوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اقامت سننے کے بعد نماز پڑھ رہا ہے تو اسے مارا اور تعزیر دی۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ مؤذن کے اقامت کہنے کے بعد دو رکعتیں پڑھ رہا ہے تو اسے کنکر مارا۔" (سنن کبریٰ بیہقی ۲/۴۸۳)

احناف کا نہی کی تاویل اور ان کا ردّ:

اور بعض علمائے احناف نہی کی حدیث کا یوں جواب دیتے ہیں کہ: اس شخص نے مسجد کے کنارہ کی اوٹ میں (سنت) نہیں پڑھی تھی اس لئے زجر وانکار فرمایا وہ اگر

دور یا اوٹ میں پڑھتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ تو صحیح مسلم کی حدیث ان کے قول کو رد کرتی ہے جیسا کہ محلی میں ہے:

و من الحنفيّة من قال انّما انكر النّبى صلى اللّٰه عليه وسلم و قال: اَلصُّبْحَ اَرْبَعًا؟ لانّه صلّى الفرض أو لانّ الرّجل صلاها فى المسجد بلا حائل فشوّش على المصلّين، و يردّ الاحتمال الاوّل قوله صلى اللّٰه عليه وسلم كما فى الكتاب: أَصَلٰوتَانِ مَعًا؟ و ما للطّبرانىّ عن ابى موسٰى اَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأٰى رَجُلاً يُصَلِّى رَكْعَتَى الْغَدَاةِ وَالْمُؤَذِّنُ يُقِيْمُ فَأَخَذَ مَنْكِبَيْهِ وَقَالَ: اِلَّا كَانَ هٰذَا قَبْلَ هٰذَا-ويردّ الثّانى ما فى مسلم عن ابن سرجسؓ، دَخَلَ رَجُلٌ الْمَسْجِدَ وَهُوَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى صَلٰوةِ الْغَدَاةِ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ فِى جَانِبِ الْمَسْجِدِ ثُمَّ دَخَلَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا سَلَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَافُلَانُ بِأَيِّ الصَّلٰوتَيْنِ اعْتَدَدْتَّ، أَبِصَلٰوتِكَ وَحْدَكَ أَمْ بِصَلٰوتِكَ مَعَنا؟ انتهى- فانّه يدلّ على انّ أداء الرّجل كانت فى جانب لا مخالطا للصّفّ- و فى المحيط الرّضوى، اختلفوا فى الكراهة فيما اذا صلّى فى المسجد الخارج والامام فى الدّاخل، فقيل: لايكره و قيل: يكره لأنّ ذلك كلّه كمكان واحد، فاذا اختلف المشائخ فيه كان الأحوط ان لا يصلّى (كذا فى المحلى ۳۔۱۰۷، نیل الاوطار ۳/۹۲)

"احناف میں سے بعض نے کہا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ "کیا صبح کی چار رکعتیں ہیں؟" انکار فرمایا تھا،

کیونکہ آپ کو علم ہو گیا تھا کہ اس نے فرض پڑھ لئے ہیں، یا پھر اس لئے کہ آدمی نے مسجد میں بغیر اوٹ کے نماز پڑھ لی تھی، جس سے نمازیوں کو تشویش لاحق ہوئی، تو پہلے احتمال کو آپ کا یہ فرمانا ردّ کرتا ہے ''کیا دو نمازیں ایک ساتھ؟'' اور جو طبرانی میں حضرت ابو موسیٰؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ فجر کی دو رکعت پڑھ رہا ہے جبکہ موذن اقامت کہہ رہا ہے، تو آپ نے اس کے دونوں کندھوں کو پکڑا اور فرمایا: کیا یہ (سنتیں) اس (فرض نماز) سے پہلے نہ ہو سکتی تھیں؟ اور دوسرا احتمال اس سے مسترد ہوتا ہے جو کہ مسلم میں ابن سرجسؓ سے روایت ہے کہ: ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز ادا کر رہے تھے، سو اس نے مسجد کے گوشے میں دو رکعت پڑھیں پھر وہ حضرت کے پاس شامل ہو گیا جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا: اے فلاں! تم نے اپنی دو نمازوں میں سے کون سی نماز شمار کی ہے۔ کیا وہ جو تم نے تنہا پڑھی ہے یا جو ہمارے ساتھ ادا کی ہے؟ انتھی۔ تو یہ اس بات کی عکاسی ہے کہ آدمی ایک کونے میں نماز پڑھ رہا تھا نہ کہ صف میں شامل تھا۔ المحیط الرضوی، میں ہے کہ: جب خارج از مسجد نماز پڑھے اور امام داخل مسجد ہو، تو ایک کے مطابق مکروہ نہیں ہے، جبکہ دوسرے قول کے مطابق مکروہ ہے اس لئے کہ یہ ایک ہی جگہ کے حکم میں ہے تو جب اس میں مشائخ کا اختلاف ہے تو احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ سنت نماز نہ پڑھی جائے۔'' (المحلی)

احادیثِ مذکورہ بالا سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ فجر کی سنت، فرض نماز کھڑی ہونے کے بعد مطلقاً نہ پڑھے نہ ہی مسجد کے اندر اور نہ ہی مسجد سے باہر۔

اور یہی مذہب تمام اہل علم اور سفیان ثوریؒ، ابن مبارکؒ، شافعیؒ، محلی شرح مؤطا سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ہدایہ، فتح القدیر اور در مختار کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ اقامت کے وقت مسجد میں سنت پڑھنا مکروہ ہے اور خارج از مسجد پڑھنا درست ہے بشرطیکہ فرض کی دونوں رکعت نہ چھوٹ جائیں، لیکن حدیث کے مضمون سے جماعت کھڑی ہونے کے وقت سنت کا مطلق نہ پڑھنا معلوم ہوتا ہے۔ خواہ مسجد میں ہو یا مسجد سے خارج۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

فيه دليل على انّه لا يصلّي بعد الاقامة نافلة و ان كان يدرك الصّلوة مع الامام وردّ على من قال، ان علم انّه يدرك الرّكعة الأولى او الثّانية يصلّي النّافلة-[1]

"اس میں دلیل پائی جاتی ہے کہ اقامت کے بعد نفل نہ پڑھے جائیں، اگرچہ نماز امام کے ساتھ پائی جا سکتی ہو اور اسی سے اس پر رد کیا جائے گا، جو یہ کہے کہ اسے معلوم ہے کہ نفل پڑھنے کی صورت میں پہلی یا دوسری رکعت پا لے گا۔"

جماعت کھڑی ہونے کی صورت میں سنتیں نہ پڑھنے میں حکمت:

اور جماعت کھڑی ہونے کے بعد سنت نہ پڑھے اس میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ: فرض جماعت میں ابتداء ہی سے دل جمعی سے مل جائے اور تکبیر اولی اور تکمیل فرض کے ثواب کو حاصل کر لے اور اختلاف کی صورت ظاہر نہ ہو پس فرض کی حفاظت علی وجہ الکمال مقتدی کو ضرور کرنی چاہیے۔

جیسا کہ امام نووی رقمطراز ہیں:

انّ الحكمة فيه ان يتفرّغ للفريضة من اوّلها فيشرع فيها عقيب مشروع الامام، و اذا اشتغل بنافلة فاته الاحرام وفاته بعض مكملات الفريضة، فالفريضة اولى بالمحافظة

---

[1] نووی شرح مسلم ۱/۲۴۷، طبع کراچی

علی اکمالها، قال القاضی: و فیه حکمة اخری و هو النّهی عن الاختلاف علی الائمة۔ (شرح مسلم ۱۔۲۴۷)

''اس میں حکمت یہ ہے کہ: (نمازی) ابتداء ہی سے فرض کے لئے خالی الذہن ہو، سو امام کے آغاز کے بعد شروع کرنے والا جب سنتوں میں مشغول ہو جائیگا تو اس کی تکبیر تحریمہ چھوٹ جائے گی اور فرض کے کچھ مکملات بھی چھوٹ گئے، پس فرض کی تکمیل کی حفاظت مقدم ہے۔ قاضی نے کہا: اس میں ایک دوسری حکمت بھی ہے: وہ، امام کی مخالفت سے روکنا ہے''۔ (نووی)

فجر کی سنتیں رہ جانے کی صورت میں ان کی ادائیگی کا وقت:

طلوع آفتاب کے بعد:

رہا یہ مسئلہ کہ جس نے فجر کی سنت نہ پڑھی ہو تو انہیں کب ادا کرے، کیا طلوع آفتاب سے قبل یا طلوع آفتاب کے بعد! حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے دونوں طرح ہی منقول ہے خواہ طلوع آفتاب سے قبل پڑھ لے یا بعد میں جیسا کہ مؤطا میں ہے: کہ

مالک انّه بلغه، ان عبداللّٰه بن عمر فاته رکعتا الفجر فقضا هما بعد ان طلعت الشّمس (مؤطا امام مالک ۱/۱۲۴)

و هکذا اسنده ابن ابی شیبة عن نافع عن ابن عمرؓ جاء الی القوم و هم فی الصّلوة و لم یکن صلّی الرّکعتین فدخل معهم ثمّ جلس فی مصلاه فلمّا أضحی اقام فصلاهما، و له من طریق عطیّة قال رأیت ابن عمرؓ قضاهما حین سلّم الامام (محلی ۳/۱۱۴)

"حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فجر کی سنتیں چھوٹ گئیں تو انہوں نے انہیں طلوع آفتاب کے بعد ادا کیا۔ (موطا)

اس طرح ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ قوم کے پاس اس وقت آئے جبکہ وہ نماز (باجماعت) پڑھ رہے تھے تو ان کے ساتھ مل گئے اور دو رکعتیں سنت نہ پڑھی، پھر اپنی جائے نماز پر ہی بیٹھے رہے تا آنکہ چاشت کا وقت ہوگیا، سو اٹھے اور ان کو ادا کیا۔ مزید عطیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کو دیکھا انہوں نے ان (فوت شدہ سنتوں کو) امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کیا۔ (محلی)

اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا نقل کیا ہے کہ سنت کی قضا طلوع آفتاب کے بعد بھی ثابت ہے: کہ

مَنْ لَمْ يُصَلِّ رَكْعَتَي الْفَجْرِ فَلْيُصَلِّهِمَا بَعْدَ مَا تَطْلُعُ الشَّمْسُ، قال التّرمذیؒ: و العمل علٰی هذا عند بعض أهل العلم، و به يقول الثّوری ابن مبارک والشّافعی و احمد و اسحاق۔ (ترمذی ۱/۲۸۷، ابن ماجہ البانی ۱/۱۹۰)

"جس شخص نے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوں تو ان کو طلوع آفتاب کے بعد پڑھ لے۔ ترمذی نے کہا اسی پر اہل علم کا عمل ہے، اور یہی قول سفیان ثوریؒ، شافعیؒ، احمدؒ، ابن مبارکؒ اور اسحاقؒ کا ہے۔"

سنتوں کی ادائیگی فرضوں کے بعد:

ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ سے فرضوں کے بعد طلوع آفتاب سے قبل بھی پڑھنا ثابت ہے کہ: حضرت قیس بن عمروؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جماعت کی اقامت کے وقت نماز میں شامل ہوئے اور فرضوں کی ادائیگی کے بعد جلدی سے فجر کی سنتیں پڑھنے لگے، اتنے میں رسول اللہ ﷺ جماعت سے فارغ ہوئے اور

قیسؓ کو سنتیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اے قیسؓ! ٹھہر جا! کیا دو نمازیں اکٹھی پڑھتے ہو؟ تو قیسؓ نے کہا، اے اللہ کے رسول میں نے فجر کی سنتیں پہلے نہیں پڑھی تھیں تو میں نے یہ دو رکعت سنتِ فجر ادا کی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اس وقت کوئی مضائقہ نہیں۔ یعنی جبکہ تم نے پہلے فجر کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں اور فرض ادا کرنے کے بعد پڑھی تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (ابن ماجہ، الالبانی ۱/۱۹۰، ابوداؤد ۲/۵۱، ترمذی ۲/۲۸۴)

تو اس فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح ہوا کہ فجر کی جماعت کے بعد فجر کی سنتیں پڑھنا جائز ہے اور نفل پڑھنا مکروہ ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ سو نہی کی حدیث سے فجر کی سنتیں مستثنیٰ اور خارج ہوئیں اور اس پر نہی وارد نہیں ہوگی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیسؓ کے سنت پڑھنے پر خاموش رہے، ایک روایت میں فرمایا: ''کیا حرج ہے'' مزید ایک روایت میں ہے ''مسکرائے'' اسی لئے علمائے مکہ معظمہ کی ایک جماعت قیسؓ کی حدیث پر عمل کرنے کی قائل ہے۔ اب جو شخص فرض کی ادائیگی کے بعد فجر کی سنتیں پڑھنے کو شدت سے منع کرتا ہے تو اس کا قول بموجب حدیث قیس رد کیا جائے گا، کیونکہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وسعت پائی گئی ہے۔

مرسل حدیث احناف کے ہاں حجت ہے:

آخر کار انتہاء پسند اس حدیث کو مرسل کہیں گے اور مرسل حدیث حنفی اور مالکی مذہب میں حجت ہے، چنانچہ نور الانوار اور توضیح وغیرہ میں مذکور ہے:

بَابُ مَنْ فَاتَتْهُ مَتٰی یَقْضِیهَا...... حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ اَبِی شَیْبَةَ نَا ابْنُ نُمَیْرٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ سَعِیْدٍ حَدَّثَنِی محمدُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ عَنْ قَیْسِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَجُلاً یُصَلِّی بَعْدَ صَلٰوةِ الصُّبْحِ رَكْعَتَیْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةُ الصُّبْحِ رَكْعَتَانِ فَقَالَ الرَّجُلُ، اِنِّیْ لَمْ اَكُنْ صَلَّیْتُ الرَّكْعَتَیْنِ اللَّتَیْنِ قَبْلَهُمَا فَصَلَّیْتُهُمَا الْاٰنَ ،

فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ ؎۱

’’باب: جس سے (سنت) چھوٹ جائے وہ اُسے کب ادا کرے......

حضرت قیس بن عمروؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا صبح کی نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھ رہا ہے، تو آپ نے فرمایا: صبح کی نماز کی دو رکعتیں ہیں۔ آدمی نے کہا: میں نے پہلی والی دو رکعت نہیں پڑھی تھیں۔ سو میں نے اب پڑھی ہیں۔ سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔‘‘

حدّثنا حامد بن يحيى البلخي قال،قال سفيان كان عطاء بن ابى رباح يحدّث بهذا الحديث عن سعد بن سعيد، قال ابوداؤد روى عبد ربّه و يحيى ابنا سعيد، هذا الحديث مرسلا انّ جدّهم زيدا صلّى مع النبىّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم (انتهى ما فى ابى داؤد ؎۲)

ابوداؤد کہتے ہیں کہ اس روایت کو عبد ربہ اور یحییٰ نے جو کہ دونوں سعید کے بیٹے ہیں اس حدیث کو مرسل بیان کیا ہے کہ: ان کے دادا زید نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔

بَابُ: مَاجَاءَ فِيْمَنْ تَفُوْتُهُ الرَّكْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ يُصَلِّيْهِمَا بَعْدَالْفَجْرِ......حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَمْرٍو السَّوَّاقِ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ جَدِّهٖ قَيْسٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَصَلَّيْتُ مَعَهُ الصُّبْحَ ثُمَّ انْصَرَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَنِيْ اُصَلِّيْ فَقَالَ مَهْلاً يَا قَيْسُ، أَصَلاَتَانِ مَعًا؟ قُلْتُ يَارَسُوْلُ

؎۱ ابوداؤد ۱/۱۸۰، ابن ماجہ ۱/۳۶۵، فواد عبدالباقی ؎۲ ابوداؤد ۲/۵۲

اللّٰهِ اِنِّیْ لَمْ اَكُنْ رَكَعْتُ رَكْعَتَیِ الْفَجْرِ قَالَ: فَلَا اِذًا-ان قال ابو عیسٰی حدیث محمّد بن ابراهیم لا نعرفه مثل هذا الا من حدیث سعد بن سعید-و قال سفیان بن عیینة سمع عطاء بن ابی رباح من سعد بن سعید هذا الحدیث، و انّما یروی هذا الحدیث مرسلا، و قد قال قوم من أهل مکّة لهذا الحدیث لم یروا بأسا ان یصلّی الرّجل الرّکعتین بعد المکتوبة قبل ان تطلع الشّمس- قال ابو عیسی و سعد بن سعید هواخو یحیٰی بن سعید الأنصاری، و قیس هو جدّ یحیٰی بن سعید و یقال هو قیس بن عمر و و یقال هو قیس بن فهد و اسناد هذا الحدیث لیس بمتّصل، محمّد بن ابراهیم التّیمیّ لم یسمع من قیس-وروی بعضهم هذا الحدیث عن سعد بن سعید عن محمّد بن ابراهیم ان النّبیّ صلی الله علیه وسلم خرج فرای قیسا-انتهی ما فی الترمذی۱/ ۲۸۵، ابن ماجہ۱/ ۳۶۵ فواد)

"باب ہے کہ: جس سے قبل از فجر دو سنتیں چھوٹ جائیں انہیں فجر کی نماز کے بعد پڑھے...... محمد بن ابراہیم اپنے دادا قیس سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو نماز کی اقامت کہی گئی تو میں نے آپ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی، پھر جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو مجھے دیکھا کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں، تو فرمایا: رُک جاؤ اے قیس! کیا دو نمازیں ایک ساتھ؟ تو میں نے عرض کیا، میں نے فجر کی پہلی دو سنتیں ادا نہیں کی تھیں، تو آپ نے فرمایا: تو کوئی حرج نہیں!

ابو عیسیٰ نے کہا: کہ ہم محمد بن ابراہیم کی روایت سعد بن سعید ہی

کے واسطے سے جانتے ہیں۔سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ: عطاء بن ابی رباح نے یہ حدیث سعد بن سعید سے مرسل روایت کی ہے، اہل مکہ میں سے علماء کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ: اس میں کوئی حرج نہیں کہ آدمی فرض کے بعد طلوع آفتاب سے قبل دو سنتیں پڑھ لے۔ابو عیسیٰ نے کہا: سعد بن سعید وہ یحییٰ بن سعید انصاری کے بھائی ہیں اور قیس یحییٰ کے دادا ہیں کہا جاتا ہے کہ وہ، قیس بن عمرو ہیں یا قیس بن فہد ہیں، محمد بن ابراہیم کا قیسؓ سے عدم سماع کی بنا پر ہی اسے غیر متصل کہا ہے اور بعض نے عن سعد بن سعید عن محمد بن ابراہیم روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور قیس کو دیکھا...... (ترمذی، ابن ماجہ)

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک فجر کی سنتوں کی قضا نہیں ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک زوال تک قضا کر لے اور بعض کہتے ہیں کہ: جو قضا کر لے گا تو وہ شیخین کے نزدیک نفل ہوں گے اور سنت شمار ہوں گے ،اور امام محمدؒ کے نزدیک قضا کر لینا چھوڑنے سے بہتر ہے، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا۔

ولا يقضيهما اى سنّة الفجر الا حال كونه تبعا للفرض قبل الزوال او بعده على اختلاف المشائخ، كما فى السمرتاشي- يقضي بعد اجماعا-والكلام دالّ على انها اذا فاتت وحدها لا تقضي و هذا عند هما، و امّا عند محمّد فيقضيهما الى الزّوال استحسانا، و قيل لا خلاف فيه فانّ عنده لو لم يقض فلا شيء عليه و امّا عندهما فلو قضي لكان حسنا، و قيل الخلاف في انّه لو قضى كان نفلا عندهما سنّة عنده- كما في جامع الرّموز-

”سنت فجر کو ماسوائے فرائض کی اتباع کے قضا نہ کرے، مگر مشائخ

کے نزدیک اختلاف کے باعث، قبل از زوال یا بعد از زوال ادا کرے جیسا کہ سمرتاشی میں ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ بعد از زوال ادا کرے جیسا کہ سمرتاشی میں ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ بعد از زوال پر اجماع ہے۔ اور کلام اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شیخین کے مذہب کے مطابق قضائی نہ دے، البتہ امام محمد کے نزدیک زوال تک قضا کرنا بہتر ہوگا اور ایک قول یہ ہے کہ: اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ان کے ہاں یہ بھی ہے کہ اگر قضائی نہ بھی دے کوئی حرج نہیں، تاہم شیخین کے نزدیک قضائی دینا بہتر ہوگا۔ ایک قول کے مطابق اختلاف اس میں ہے کہ شیخین کے نزدیک اگر قضا دے گا تو وہ نفل ہوں گی اور امام محمد کے ہاں سنت ہی ہوں گی۔ (جامع الرموز)

واللہ اعلم بالصواب ...... فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَلْبَابِ۔ حسبنا اللہ بس حفیظ اللہ۔

⇦ حررہ سید شریف حسین

⇦ محمد اسد علی

⇦ سید محمد نذیر حسین

محمد
سید
نذیر حسین

(واللہ الموفق)

حاصل:

نماز فرض ہوتے ہوئے دو رکعت پڑھنے کے جو آثار وارد ہیں وہ سند کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں۔ اگر کوئی صحیح بھی ہو تو اس حدیث کی مخالف ہے کہ اذا أقیمت الصلاۃ فلا صلاۃ الا المکتوبۃ .... [جاوید]

عورتوں کیلئے سونا چاندی پہننا

سوال:

علمائے دین اس مسئلہ کے متعلق ارشاد فرمائیں کہ سونے کا زیور عورتوں کو پہننا درست ہے یا نہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں اس کے پہننے کی ممانعت آئی ہے؟

جواب:

عورتوں کیلئے سونا و چاندی پہننے کے جواز میں کتاب وسنت سے دلائل:

اربابِ فطانت پر مخفی نہیں کہ سونے اور چاندی کا زیور عورتوں کے حق میں قرآن مجید کی چند آیات سے دلالۃً واضح ہوتا ہے، چنانچہ سورۂ زخرف میں فرمانِ ربانی ہے:

أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ○ (زخرف:۱۸)

"آیا آں را کہ پرورده می شود زیور واو در صفت خصومت ظاہر نمیگردد"[۱]

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: اور ایسا شخص کہ گہنے (زیور) میں پلتا رہے اور جھگڑے میں بات نہ کہہ سکے۔ تفسیر ابن عباس میں مذکور ہے۔

أو من ينشّؤ يغذّى و يربّى فى الحلية حلية الذّهب والفضّة و هو فى الخصام فى الكلام غير مبين غير ثابت الحجّة، و هنّ اللنّساء- انتهى، قال الكِياَ: فيه دليل على اباحة الحليّ للنّساء-[۲]

"کیا جو سونے، چاندی کے زیور میں پلتا اور پرورش کیا جاتا ہے،

---

[۱] فتح الرحمٰن: ۵۹۰ ج ۲ ۳۰۴/طبع فاروقی ملتان

وہ کلام میں حجت کو ثابت نہیں کرسکتا۔ وہ عورتیں ہیں۔ کیا کہتے ہیں: اسمیں عورتوں کے لئے زیور کے مباح ہونے کی دلیل ہے۔"

و اخرج ابن ابی حاتم عن ابی العالیۃ انہ سئل عن الذّھب للنّساء فلم یربہ باسا و تلا ھذہ الآیۃ۔[1]

"ابو العالیہ سے عورتوں کے زیور پہننے سے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں"، اور قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت تلاوت کی۔

المسئلۃ الثالثہ: دلّت الآیۃ علی انّ الحلیّ مباح للنّساء۔[2]

"تیسرا مسئلہ: آیت عورتوں کے زیور پہننے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔"

پس لفظ "یُنَشَّؤُفِی الْحِلْیَۃِ" سے حاصل ہوا کہ زیور کی زینت سے آراستگی پر حرص عورت کی جبلت اور خلقت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حرص میں ان کو معذور قرار دیا اور اس کی نہی نہیں فرمائی، بلکہ اس میں دلالۃً اباحت پائی جاتی ہے۔ کمالا یخفی علی المتامل المتفطن۔ اور اس زینت کا بیان سورۂ نور میں بخوبی مذکور ہے:

قَوْلُہٗ تَعَالٰی: وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا...... الآیۃ (نور/۳۱)

فسّرہ ابن عبّاس بالوجہ و الکفّین۔ اخرجہ بن ابی حاتم، فاستدلّ بہ من اباح النّظر الٰی وجہ المرأۃ و کفّیھا حیث لا فتنۃ، و فسّرہ ابن مسعود، بالثّیاب و فسّر الزّینۃ بالخاتم و السّوار و القرط و القلادۃ و الخلخال، اخرجہ ابن ابی حاتم ایضاً۔[3]

"اور عورتیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو ظاہر ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر چہرہ اور دونوں

---

[1] الدر المنثور ۷/۳۷۰ [2] التفسیر الکبیر مختصراً ۷/۴۲۶ [3] ابن عباس: ۲۱۹ طبع ملتان

ہاتھوں سے کی ہے (ابن ابی حاتم) سو اس سے اس نے استدلال کیا ہے جس نے عورت کے چہرہ اور ہاتھوں کی طرف دیکھنے کو جائز قرار دیا ہے، جبکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ اور اس کی تفسیر ابن مسعودؓ نے: لباس سے کی ہے۔ اور زینت کی تفسیر: انگوٹھی، کنگن، بالیاں، ہار اور پازیب سے کی ہے۔"

اور فرمانِ الٰہی ہے:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ...الآية(نور/۳۱)

فيه، نهي ان تضرب برجلها ليسمع صوت الخلخال۔

(الاكليل للسيوطی ۱۸۶/۶)

"اور زور زور سے اپنے پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی پوشیدہ زینت معلوم ہو جائے۔ اس میں اس بات کی ممانعت ہے کہ اپنی پازیب کو یوں عمداً حرکت دے کر چلیں کہ اس کی آواز سنی جا سکے۔"

اور تفسیر ابن عباس ص ۲۱۹ میں مذکور ہے کہ:

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ، اَلدَّمْلُوْجَ وَالْوِشَاحَ وغير ذلك وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ احداهما بالأخرى ليقرع الخلخال بالخلخال ۔انتهى ۔قَالَ اكثر المفسّرين الزّينة ههنا أريدبها امور ثلاثة:

اَحَدُهَا: اَلْاِصْبَاغُ ۔كَالْكُحْلِ وَالْخِضَابِ بِالْوَسْمَةِ فِي حَاجِبَيْهَا وَالْغُمْرَةُ فِي خَدَّيْهَا وَالْحِنَاءُ فِي كَفَّيْهَا وَ قَدَمَيْهَا۔

وَثَانِيْهَا: اَلْحُلِيُّ كَالْخَاتَمِ وَالسِّوَارِ وَالْخَلْخَالِ وَالدَّمْلَجِ وَالْقِلَادَةِ وَالْاِكْلِيْلِ وَالْوِشَاحِ وَالْقُرْطِ۔

وَثَالِثُهَا: اَلثِّيَابُ (انتهى فی تفسير النيسا فوری و الكبير)

"وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ" سے مراد بازو بند اور حمیل (گلے میں پہنا

جانے والا زیور) وغیرہ ہے اور اپنے ایک پاؤں کو دوسرے پر نہ ماریں، تاکہ ایک پازیب دوسرے سے مل کر نہ چھنچھنائے۔ اور اکثر مفسرین نے کہا ہے: کہ یہاں زینت سے مراد تین چیزیں ہیں:

ایک: ''رنگ ہے، جیسے سُرمہ لگانا، ابروں میں رنگ بھرنا، رُخساروں پر زعفران لگانا، ہاتھوں اور پاؤں پر مہندی کا لگانا ہے۔''

دوسری: ''زیور ہے، جیسے انگوٹھی، کنگن، پازیب، بازو بند، ہار، تاج، حمیل اور بالیاں ہیں۔''

تیسری: ''لباس ہے۔'' (تفسیر نیساپوری، کبیر)

اور سورۂ رعد میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ ..الآية (رعد/۱۷)

''وازانچہ میگداز ندش در آتش بطلب پیرایہ یا بطلب رخت خانہ۔'' (فتح الرحمٰن)

''اور جن چیزوں کو زیور یا دوسرے سامان بنانے کے لئے آگ میں تپاتے ہیں''

اور تفسیر ابن عباس میں ہے:

ابتغاء حلية، طلب حلية تلبسونها، يقول: مثل الحقّ مثل الذّهب والفضّة ينتفع بها، كذلك الحقّ ينتفع به صاحبه۔

'' اِبْتِغَاءُ حِلْيَةٍ، سے مراد، زیور کی خاطر جنہیں تم پہنتے ہو، کہتے ہیں: حق کی مثال اس سونے چاندی کی سی مثال ہے جس سے استفادہ کیا جائے ایسا ہی حق ہے جس سے صاحبِ حق فائدہ اٹھاتا ہے۔''

اور تفسیر کبیر میں ہے:

''اِبْتِغَاءُ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ'' أي بِطَلَبِ اتِّخَاذِ حِلْيَةٍ وَهِيَ مَا يُتَزَيَّنُ

بِهٖ وَ يُتَجَمَّلُ بِهٖ كَالْحُلِيِّ الْمُتَّخَذَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، قَوْلُهٗ: اِبْتِغَاءُ حِلْيَةٍ قَالَ اَهْلُ الْمَعَانِي: اَلَّذِيْ يُوْقَدُ عَلَيْهِ لِاِبْتِغَاءِ حِلْيَةٍ الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ وَالَّذِيْ يُوْقَدُ عَلَيْهِ لِاِبْتِغَاءِ الْاَمْتِعَةِ، اَلْحَدِيْدُ وَالنَّحَاسُ وَالرَّصَاصُ وَالْاَسْرُبُ۔ (۵۔۲۸۹)

''زیور یا اسباب کی خاطر۔ یعنی ایسا زیور بنانا جس سے زینت و خوبصورتی حاصل کی جاتی ہو اور وہ سونے و چاندی کے زیورات ہیں، ابتغاء حلیه: اہل معانی کہتے ہیں کہ، جو زیور کی خاطر تپایا جاتا ہے وہ سونا اور چاندی ہے اور جو اسباب کی خاطر تپایا جاتا ہے وہ لوہا، تانبا، قلعی اور سیسہ ہے۔ (تفسیر کبیر)

وقال البیضاوی: والمقصود من ذلک بیان منافعها(۱/۵۱۷)

''اس سے مقصود ان کے فوائد کا بیان کرنا ہے۔ (بیضاوی)

(قال النواب صدیق حسن):

وَالْحُلِيِّ: بِضَمِّ الْحَاءِ وَ كَسْرِ اللَّامِ وَالْيَاءِ الْمُشَدَّدَةِ اَصْلُهٗ حَلُوْىَ فَعْلَلَ جَمْعُ حَلْيٍ بِالْفَتْحِ اِسْمُ الْحُلِيِّ لِكُلِّ مَا يُتَزَيَّنُ بِهٖ مِنْ مَصَاغِ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ۔ كذا فی النهایه الجزری ۱/۴۳۵

''حُلِيّ: اس کی اصل حَلُوْیَ بروزن فَعْلَلَ، جو کہ حَلْیٌ فتح کے ساتھ، کی جمع ہے۔ ہر اس سونے چاندی کے زیور کو کہا جاتا ہے جس سے زینت حاصل کی جاتی ہو''۔ (نهایہ جزری)

اور چاندی کو خاص کرنا تخصیص بلا مخصص اور قرآنی آیات کی سلاست کے مخالف ہے۔ کما لا یخفی علی المتامل الماھر۔ اور صحیح بخاری و مسلم سے عورتوں کو سونے کے زیور کی اباحتِ عمومی ثابت ہوتی ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

بَابُ الْعَرْضِ فِي الزَّكٰوةِ...... وَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللّٰہ علیه

وسلم : تَصَدَّقْنَ وَ لَوْمِنْ حُلِيِّكُنَّ، فَجَعَلَتِ الْمَرْأَةُ تُلْقِي خُرُصَهَا وَ سِخَابَهَا۔ (فتح الباری ۳/۳۱۲)

"زکاۃ میں اسباب لینے کا باب۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (عورتوں سے) فرمایا: صدقہ دو، اگرچہ تمہارے زیور ہی کیوں نہ ہوں، چنانچہ عورتیں اپنی اپنی بالیاں اور اپنے اپنے ہار ڈالتی تھیں۔

حُلِيٌّ یعنی زیور، خواہ وہ سونے کا ہو یا چاندی کا عموم پایا جاتا ہے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلاً جَسَداً......الآیۃ (اعراف/۱۴۸)

اپنے زیور سے بچھڑا بنایا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو فرمایا: صدقہ یعنی زکاۃ ادا کرو خواہ اپنے زیوروں سے دو۔ اور زیور دونوں اقسام سے ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے:

اَلْخُرص بِالضَّمِّ وَ بِكَسْرٍ، حَلَقَةُ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ أَوْحَلَقَةُ الْقُرْطِ وَالْحَلَقَةُ الصَّغِيرَةُ۔

"خرص ضمہ و کسرہ کے ساتھ، سونے اور چاندی کا کڑا (کنگن اور چوڑی) یا بالی کے کڑے اور چھوٹے کڑے (چھلے) کو کہتے ہیں۔"

اَلصَّراح میں یوں ہے: خرص: بضم وکسر، حلقہ زرونقرہ۔

سخاب: بکسر سین مہملہ وخاء معجمہ، قلادہ، فارسی میں: گردن بند یعنی ہر عرف میں جو زیور گلے میں پہنا جاتا ہے۔ پس سخاب بھی عام ہے خواہ سونے کا ہو یا چاندی کا، جو کہ ہر شخص حسب مقدور بغرض زینت بنواتا ہے۔

قرط: ضمہ کے ساتھ، گوشوارہ، (کان کی بالی) بھی عام ہے خواہ چاندی کا ہو یا سونے کا، مرصع جڑاؤ ہو یا نہ ہو۔

اور امام بخاریؒ نے کتاب اللباس میں ذکر کیا ہے:

بَابُ، لِخَاتَمِ لِلنِّسَاءِ وَ كَانَ عَلَى عَائِشَةَ خَوَاتِيمُ

ذَهَبٍ: حَدَّثَنَا اَبُو عَاصِمٍ اَخْبَرَنَا ابْنُ جَرِيْجٍ أَخْبَرَنَا الْحَسَنُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ طَاؤُسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمَا شَهِدْتُ الْعِيْدَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَصَلّٰى قَبْلَ الْخُطْبَةِ، قَالَ اَبُوْ عَبْدِاللّٰهِ، وَ زَادَ ابْنُ وَهْبٍ عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ فَأَتَى النِّسَاءَ فَجَعَلْنَ يُلْقِيْنَ الْفَتَخَ وَالْخَوَاتِيْمَ فِي ثَوْبِ بِلَالٍ۔(فتح الباری ۱۰/ ۳۳۰)

''عورتوں کے انگوٹھی پہننے کا بیان اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ہاں سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔

ابو عاصم، ابن جریج، حسن بن مسلم، طاؤس، حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازِ عید میں موجود تھا آپ ﷺ نے خطبہ سے پہلے نماز پڑھی: اور ابن وھب نے بواسطہ ابن جریج اتنا زیادہ کیا ہے: کہ عورتوں کے پاس تشریف لائے تو عورتیں بلال کے کپڑے میں انگوٹھیاں اور چھلے ڈالتی تھیں۔''

صحیح مسلم میں ایسے ہے:

قال ابن درید کلّ ما علّق من شحمة الاذن فهو قرط سواء كان من ذهب او خرز۔(نووی شرح مسلم، مسلم، البانی ۴۳۸)

''ابن دُرید کہتے ہیں کہ: ہر وہ چیز جو کان کی لو میں لٹکائی جائے وہ بالی ہے، خواہ وہ سونے کی ہو یا موتی کی۔''

زیور کے معاملہ میں آنحضرت ﷺ کا اپنے تئیں ابوزرع سے تشبیہ دینا:

اور امام بخاریؒ نے: بَابُ حُسْنِ الْمُعَاشَرَةِ مَعَ الْأَهْلِ (بیوی کے ساتھ حسنِ معاشرت کا باب) قائم کیا ہے۔ پھر گیارہ عورتوں کے واقعہ میں گیارہویں عورت نے کہا:

زَوْجِی اَبُوْ زَرْعٍ فَمَا اَبُوْ زَرْعٍ؟ أَنَاسَ مِنْ حُلِيِّ اُذُنَیَّ۔

''میرا شوہر ابوزرع ہے اور ابوزرع کیا خوب شخص ہے، اس نے زیورات سے میرے دونوں کانوں کو بھاری کردیا اور ہلا کے رکھ دیا ہے۔'' (فتح الباری ۹/ ۳۱۷)

پھر اختتام حدیث پر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم كُنْتُ لَكِ كَابِیْ زَرْعٍ لِاُمِّ زَرْعٍ۔انتهى مافى فتح البارى ۹/ ۳۱۷ و صحیح مسلم ۴/ ۱۹۰۱)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تیرے لئے ایسے ہوں جیسے ابوزرع ام زرع کے لئے تھا۔''

سو ابوزرع کے قصہ سے صاف ظاہر ہوا کہ اس مرد مخیر، صاحب ثروت اور صاحب دولت نے ام زرع کے دونوں کانوں میں سونے و چاندی کی بالیاں بنوا کردی تھیں، بلکہ یہ مقام مدح و زینت، سونے کے زیور کے اہتمام کا مقتضی ہے۔ اور ہر صاحب قدرت چاندی کے زیور کو معیوب سمجھتا ہے خصوصاً جبکہ زیور کان کا ہو۔ اسی بنا پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس سونے کی انگوٹھیاں تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات مبارک کو ابوزرع کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

اور امام نووی جملہ أَنَاسَ مِنْ حُلِيِّ اُذُنَیَّ کے تحت رقمطراز ہیں:

مَعْنَاه حَلَّانِي قِرَطَةً وَ شُنُوْفًا فَهِيَ تَنُوْسُ اَیْ تَتَحَرَّكُ لِكَثْرَتِهَا۔انتهى كلام الشارح۔و فی روايةِ ابْنِ السِّكِّيت: "اُذُنَیَّ وَ فَرْعَیَّ" وَ فَرْعَا الْاِنْسَانِ يَدَاهَا، وَالْحُلِيُّ حِيْنَئِذٍ يَعُمُّ الْقُرْطَ وَ الشَّنَفَ وَالسِّوَارَ وَالْمُعْضَدَ، وَ تَنْكِيْرُ حُلِيٍّ وَ شَحْمٍ لِلتَّكْثِيْرِ كُلِّهِ مِنَ الْفَائِقِ۔(مسلم ۲/ ۲۸۸ طبع کراچی)

''اس کا یہ معنی ہے کہ اس نے مجھے بالیاں اور کانوں کا زیور اس قدر پہنایا ہے کہ وہ اس کے بوجھ سے جھولتے رہتے ہیں۔ اور

ابن السکیت کی روایت میں "اُذُنِی و فَرعی" ہے اور انسان کے فروع اس کے دونوں ہاتھ ہوتے ہیں۔ سو زیور بالی، کانوں میں پہنا جانے والا کنگن اور بازو بند کے لئے عام ہوا۔"

قرط، شنف اور بالی کی وضاحت:

نفائس اللغات میں ہے:

بالی نوعی از زیور کہ از سیم و زر سازند و در گوش آویزند پس اگر در نرمہ گوش آویزند بعربی آنرا "قُرط" بضم قاف وسکون راء مہملہ و طاء مہملہ گویند و اگر در اعلائے گوش آویزند بعربی آنرا "شنف" بفتح شین معجمہ وسکون نون و فادر آخر گویند و فارسی ہمہ را گوشوارہ و آویزہ گوش گویند۔ (کذافی النفائس)

"بالی زیور کی ایک قسم ہے جو کہ سونے و چاندی سے بناتے ہیں اور کان میں لٹکاتے ہیں، پس اگر اس زیور کو کان کی لو میں لٹکایا جائے تو عربی میں اسے "قرط" کہتے ہیں، جو کہ قاف کے ضمہ اور را وطا کے سکون سے ہے، اور اگر اس کو کان کے اوپر والے حصہ میں لٹکایا جائے تو عربی میں اس کو "شنف" شین کی فتح اور نون کی جزم سے کہتے ہیں اور فارسی میں تمام کو بالی یا کان میں لٹکائے جانے والے زیور کو کہتے ہیں۔"

حُلِیّ: سونے چاندی کیلئے عام ہے:

صحیح بخاری و مسلم کی حدیث سے "حُلِیّ" عموم کو ظاہر کرتا ہے، خواہ وہ سونے کی قسم ہو یا چاندی کی۔ اور چاندی کی تخصیص، بلا مخصص اور بلا مرجح باطل تصور ہوگی، بلکہ سونے کی تائید میں تو مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

جیسا کہ ابوداؤد میں باب الکنز میں ہے:

مَاھُوَ زَکَاۃُ الْحُلِیِّ۔

حَدَّثَنَا اَبُوْكَامِلٍ وَ حميد بن مَسْعَدَة المعنى اَنَّ خَالِدَ بْنَ الْحَارِث حَدَّثَهُمْ قَالَ حَدَّثَنَا حُسَيْنٌ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْب عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ اَنَّ امْرَءَ ةً اَتَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم وَ مَعَهَا ابْنَةٌ لَهَا وَفِي يَدِابْنَتِهَا مِسْكَتَانِ غَلِيْظَتَانِ مِنْ ذَهَبٍ- فَقَالَ لَهَا اَتُعْطِيْنَ زَكَاةَ هٰذَا؟ قَالَتْ لاَ، قَالَ: اَيَسُرُّكِ اَنْ يُّسَوِّرَكِ اللّٰهُ بِهِمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ؟ قَالَ ، فَخَلَعَتْهُمَا فَاَلْقَتْهُمَا اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَتْ هُمَا لِلّٰهِ وَ لِرَسُوْلِهِ-انتهى و هكذا (رواہ النسائی ۲/۲۸۰، ابوداؤد ۱/۲۱۲، سلفیہ)

زیور کی زکاۃ کیا ہے!

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے داداد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی، جس کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا، کیا تم اس کی زکوۃ دیتی ہو؟ اس نے جواباً عرض کیا: ''نہیں'' اس پر آپ نے فرمایا: کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ان کے بدلے آگ کے دو کنگن پہنائے؟ اس عورت نے وہ دونوں کنگن پھینک دیئے، اور بولی کہ یہ دونوں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے ہیں۔'' (النسائی)

قال الحافظ عبد العظيم المنذریّ: لعلّ التّرمذیّ قصد الطّریقین الّذین ذکر هما و الا فطریق ابی داؤد لا مقال فیها ثمّ بیّنها رجلا رجلا، کذا فی المحلی شرح مؤطا مالک، رواه ابو داؤد۔

"امام منذری کہتے ہیں کہ: امام ترمذی نے دو سندوں کا ذکر کیا ہے وگرنہ امام ابوداؤد کی ذکر کردہ سند بھی ایسی ہے جس میں کوئی جرح نہیں ہے، پھر انہوں نے ایک ایک راوی کی وضاحت کری ہے۔" (ابوداؤد)

قال فی فتح القدیر: قال ابو الحسن بن قطّان اسناده صحیح، و قال المنذری فی مختصره اسناده لا مقال فیه۔ وانّهما اخرج ابوداؤد عن امّ سلمةؓ قالت: كُنْتُ اَلْبَسُ اَوْضَا حًا مِنْ ذَهَبٍ، فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَ كَنْزٌ هُوَ؟ فَقَالَ مَا بَلَغ اَنْ تَوَدِّی زَكٰوتَهُ فَزُكِّيَ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ، وَ اِسْنَادُهٗ جَيِّدٌ۔ کذا فی المحلی ۹۷/۶، منذری ۱۷۵/۲

"فتح القدیر میں ہے کہ: ابوالحسن بن قطان نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ امام منذری نے اپنی مختصر میں کہا ہے کہ: اس کی سند میں کوئی مقال نہیں ہے اور ان دونوں کو ابوداؤد نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہتی ہیں کہ: میں سونے کی پازیب پہنا کرتی تھی، میں نے کہا! اے اللہ کے رسول کیا یہ کنز (خزانہ) ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ نصاب کو پہنچ جائے اور ان کی زکوٰۃ ادا کردی جائے تو کنز نہیں ہے، اور اس کی سند جید ہے۔"

اسی طرح سنن ابی داؤد میں ہے:

(۱) بَابُ فِي الْحَرِيْرِ لِلنِّسَاءِ: عن عبداللّٰہ بن زریر انه سمع علیؓ بن ابی طالب یقول اَنَّ نبیَّ اللّٰہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم أَخَذَ حَرِيْرًا فَجَعَلَهٗ فِي يَمِيْنِهٖ وَ اَخَذَ ذَهَبًا فَجَعَلَهٗ فِي شِمَالِهٖ ثُمَّ قَالَ: اَنَّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ عَلٰى ذُكُوْرِ اُمَّتِي۔[1]

---

[1] ابوداؤد ۳۳۰/۴ حدیث ۴۰۵۷، ابن ماجہ حدیث ۳۵۹۵، نسائی ۱۳۸/۸، مسند احمد ۹۶/۱

"عورتوں کے لئے ریشم کا باب: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ میں ریشم اور بائیں ہاتھ میں سونا پکڑا، پھر فرمایا: یہ دونوں میری امت کے مردوں کے لئے حرام ہیں۔"

(۲) اور نسائی کے بَابُ تَحْرِيْمِ لُبْسِ الذَّهَبِ (سونا پہننے کی حرمت) میں ہے:

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ اَحَلَّ لِاِنَاثِ اُمَّتِیَ الْحَرِيْرَ وَالذَّهَبَ وَ حَرَّمَهُ عَلٰی ذُكُوْرِهَا۔انتھی (نسائی ۸/۱۳۹،ابن ماجہ)

"حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ عزوجل نے ریشم اور سونے کو میری امت کی عورتوں کیلئے حلال قرار دیا ہے اور مردوں کیلئے حرام۔"

(۳) تَحْرِيْمُ الذَّهَبِ عَلَی الرِّجَالِ۔

"مردوں کے لئے سونے کی حرمت"

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَرِيْرٍ اَنَّهُ سَمِعَ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ يَقُوْلُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اَخَذَ حَرِيْرًا فَجَعَلَهُ فِیْ يَمِيْنِهٖ وَ اَخَذَ ذَهَبًا فَجَعَلَهُ فِیْ شِمَالِهٖ ثُمَّ قَالَ: اِنَّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ عَلٰی ذُكُوْرِ اُمَّتِیْ۔انتھی ما فی النسائی ۸/۱۳۹ ابن ماجہ حدیث ۳۵۹۵)

"حضرت علی بن ابی طالبؓ کہتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ میں ریشم پکڑا اور بائیں ہاتھ میں سونا، پھر فرمایا: یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔"

اس حدیث کو امام نسائی نے چار طرق سے روایت کیا ہے ایک حضرت علیؓ سے اور دوسرا حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے اور ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو حضرت علیؓ

اور حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں: کہ

(۴) قَالَتْ أَهْدَى النَّجَاشِيُّ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم حَلْقَةً فِيْهَا خَاتَمُ ذَهَبٍ فِيْهِ فَصٌّ حَبَشِيٌّ فَاَخَذَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم بِعُوْدٍ وَاَنَّهُ لَمُعْرِضٌ عَنْهُ اَوْ بِبَعْضِ اَصَابِعِهِ ثُمَّ دَعَا بِاِبْنَةِ ابْنَتِهِ اُمَامَةَ بِنْتِ الْعَاصِ فَقَالَ: تَحَلَّىْ هٰذَا يَا بُنَيَّةُ-(ابن ماجہ۲/۱۲۰۲، ابوداؤد۴/۵۳۵)

''نجاشی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک چھلا بھیجا اس میں سونے کی انگوٹھی تھی اور اس میں ایک سیاہ نگینہ جڑا ہوا تھا۔ آپؐ نے اسے ایک لکڑی سے چھوا اور آپ اس سے نفرت کر رہے تھے یا کسی انگلی سے لیا، پھر اپنی نواسی امامہ بنت العاص (حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بیٹی) کو بلایا اور فرمایا: بیٹی! اسے پہن لو۔ ''(ابن ماجہ)

(۵) ترمذی میں بَابُ مَاجَاءَ فِي الْحَرِيْرِ وَالْذَهَبِ لِلرِّجَالِ...

حَدَّثَنَا اِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُوْرٍ ثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ نُمَيْرٍ ثنا عَبْدُ اللّٰهِ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عَنْ نَافِعٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ اَبِي هِنْدٍ عَنْ اَبِي مُوْسٰى الْاَشْعَرِيُّؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: حُرِّمَ لِبَاسُ الْحَرِيْرِ وَ الذَّهَبِ عَلٰى ذُكُوْرِ اُمَّتِيْ وَ اُحِلَّ عَلٰى اِنَاثِهِمْ-و في الباب عن عمر و علي وعقبة بن عامر و امّ هانيء و انس و حذيفة و عبدالله بن عمرو و عمران بن حصين و عبد الله بن الزبير و جابر و ابي ريحانة و ابن عمر والبراء رضي الله عنهم-هذا حديث حسن صحيح-مافي التّرمذي۴/۲۱۷وفي المشكوة فتح الرباني۱۷/۲۷۰وابو داؤد والنّسائي ۸/۱۳۹)

"(مردوں کے لئے سونا اور ریشم پہننے کے بیان) میں ہے:

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سونا اور ریشمی لباس میری امت کے مردوں کے لئے حرام اور ان کی عورتوں کے لئے حلال کیا گیا ہے۔ اور اس باب میں حضرت عمر، علی، عقبہ بن عامر، ام ھانی، انس، حذیفہ، عبداللہ بن عمرو، عمران بن حصین، عبداللہ بن الزبیر، جابر، ابو ریحانہ، ابن عمر اور براء بن عازب رضی اللہ عنہم سے بھی روایات مروی ہیں۔ اور یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ (مشکوٰۃ ۲/۱۲۴۴ البانی)

(۶) اور بلوغ المرام میں ہے:

عَنْ اَبِی مُوْسَی رَضِیَ اللّٰهِ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم قَالَ: اُحِلَّ الذَّهَبُ وَالْحَرِیْرُ لِاَنَاثِ اُمَّتِیْ وَ حُرِّمَ عَلٰی ذُکُوْرِهَا -رواه احمد و وَالنَّسَائِیُ وَالتِّرْمِزِیُّ وَ صَحَّحَهٗ -انتهی، (النسائی ۸/۱۳۹، ترمذی ۴/۲۱۷، مصنف عبدالرزاق حدیث ۱۹۹۳۰، بلوغ المرام ۱۴۸)

"حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لئے حلال اور ان کے مردوں کے لئے حرام کیا گیا ہے۔ احمد، نسائی اور ترمذی نے اسے صحیح کہا۔"

سونے اور ریشم عورتوں کے لئے حلال اور ان دونوں کا مردوں کے لئے حرام ہونا سولہ صحابہ کرامؓ سے مروی ہے، جو کہ واقفان حدیث پر مخفی نہیں ہے۔ اور اسی باب میں مسند احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کلمات مروی ہیں:

(۷) اَخَذَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم حَرِیْرًا فَجَعَلَهٗ فِیْ یَمِیْنِهٖ

وَ اَخَذَ ذَهَبًا فَجَعَلَهُ فِي شِمَالِهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ عَلٰى ذُكُوْرِ اُمَّتِيْ، زاد ابن ماجة: حِلٌّ لِاِنَاثِهِمْ...... و بيّن النّسائي و الاختلاف فيه على يزيد بن ابي حبيب-قال الحافظ و هواختلاف لا يضرّ و نقل عبد الحقّ عن ابن المديني انّه قال حديث حسن ورجاله معروفون-انتهى ما في نيل الاوطار للشوكاني، [1]

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ میں ریشم اور بائیں میں سونا پکڑا، پھر فرمایا: یہ دونوں میری امت کے مردوں کے لئے حرام ہیں۔ ابن ماجہ میں اضافہ ہے: ان کی عورتوں کے لئے حلال ہے۔ امام نسائی نے یزید بن ابو حبیب کے متعلق اختلاف ظاہر کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ: یہ اختلاف بے ضرر ہے۔ عبدالحق نے ابن المدینی سے نقل کیا ہے کہ: انہوں نے کہا، کہ حدیث حسن ہے اور اس کے راوی معروف ہیں۔''

ہر گاہ علی بن المدینی نے اس حدیث کی تحسین کی ہے اور اس کے رواۃ کو معروف بالعدالۃ کہا ہے تو پھر اس کی تضعیف کون کر سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر العسقلانیؒ ''تقریب میں فرماتے ہیں:

عليّ بن عبد اللّٰه المديني البصريّ ثقة ثبت امام اعلم اهل عصره بالحديث و علله حتّى قال البخاريّ: ما استصغرت نفسي الا عنده-(تقریب ۲۷۳ فاروقی ملتان)

''حضرت علی بن المدینی البصری ثقہ، حجۃ، اپنے زمانہ کے حدیث اور علل الحدیث کے سب سے بڑے امام ہیں۔ حتیٰ کہ امام بخاریؒ

---

[1] ابوداؤد والبانی ۲/۷۶۵، ابن حبان ۱۲/۲۵۰، احمد ۱/۹۵/۱۱۵، نیل ۲۔۸۷ نسائی ۸/۱۳۸، ابن ماجہ حدیث ۳۵۹۵)

فرماتے ہیں کہ: میں نے خود کو ماسوا ابن المدینی کے کسی کے سامنے چھوٹا محسوس نہیں کیا۔"

وقال شیخه ابن عیینة: اتعلّم منه اکثر ممّا یتعلّم منّی (۳۷۳)

"ان کے شیخ ابن عیینہ کہتے ہیں کہ: میں ابن المدینی سے اس سے کہیں بڑھ کر سیکھتا ہوں جو وہ مجھ سے سیکھتے ہیں۔"

وقال النّسائی: کان اللّٰه خلقه للحدیث۔(کذا فی التقریب ۳۷۳)

"امام نسائی فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے ان کو حدیث کے لئے پیدا فرمایا ہے۔"

سونے کا زیور عورت کیلئے بوجوہ یقیناً جائز ہے:

مندرجہ بالا تحریر سے سونے کا زیور عورت کے حق میں بلا ریب ثابت ہوتا ہے اور وعیدِ نار والی حدیث عورتوں کے حق میں سونے کے زیور کا استعمال چند وجوہ کے سبب مذکورہ بالا دلائل کے مقابلہ میں معارض نہیں ہو سکتی۔

وجہ اوّل:

کہ جواز کے دلائل کثرت وقوت کی بنا پر ارجح واکثر ہیں، اور حدیث وعیدِ نار مرجوح اور کمتر ہے، کیونکہ جواز کی دلیل کے لئے قرآنی آیات اور بخاری ومسلم کی حدیث وعیدِ نار والی حدیث کے خلاف واضح حجت ہے۔ کما لا یخفی علی المتتبع الماهر۔

وجہ دوئم:

کہ عورت کے حق میں حرمت کی روایت جو نیچے آ رہی ہے قرآنی آیات، حدیثِ شیخین اور سولہ، سترہ صحابہ کرام کی روایات کی رو سے منسوخ ہے۔ شرح السنۃ میں ہے:

قال البغوی هذا الحدیث منسوخ بحدیث ابی موسی

الاشعریؒ انه صلی الله علیه وسلم قال: اُحِلُّ الذَّھَبُ وَالْحَرِیْرُ لِلْاِنَاثِ مِنْ اُمَّتِیْ-کذا فی المرقاۃ وغیرھا۔[1]

"امام بغوی کہتے ہیں کہ: یہ حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی اس حدیث سے منسوخ ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لئے حلال ہے۔"

شیخ جلال الدین السیوطی شرح نسائی میں رقمطراز ہیں:

یَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ اَمَا لَکُنَّ فِی الْفِضَّةِ مَا تَحَلَّیْنَ اَمَا اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْکُنَّ امْرَأَةٌ تَحَلَّتْ ذَهَبًا تُظْهِرُهٗ اِلَّا عُذِّبَتْ بِهٖ- هذا منسوخ بحدیث: اِنَّ هٰذَیْنِ حَرَامٌ عَلٰی ذُکُوْرِ اُمَّتِیْ حِلٌّ لِاِنَاثِهَا-[2]

"اے عورتوں کی جماعت کیا تم چاندی کا زیور نہیں بنا سکتیں، دیکھو! جو عورت تم میں سے سونے کا زیور پہن کر (اجنبی مردوں کو یا فخر سے) نمود ونمائش کرے تو اس کو عذاب ہوگا۔ یہ حدیث اس حدیث سے منسوخ ہے: بے شک یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں اور عورتوں کے لئے حلال۔"

قال ابن شاهین فی ناسخه: کان فی اوّل الأمر یلبس الرّجال خواتیم الذّهب وَ غیر ذلک وکان الخطر قد وقع علی النّاس کلّهم ثمّ اباحه رسول الله صلّی الله علیه وسلّم للنساء دون الرّجال، فصار ما کان علی النّساء من الخطر مباحا لهنّ، فنسخت الاباحة بالحظر، و حکی النّوویّ فی شرح مسلم اجماع المسلمین علی ذلک۔ انتهی ما فی زهر الربی علی المجتبی للشیخ الحافظ جلال

---

[1] شرح السنۃ ۱۲/۷۰ [2] نسائی ۸/۱۳۵ حاشیہ

الدین السیوطی ۸/۱۳۵ حاشیہ)

''ابن شاہین اپنی ناسخ میں لکھتے ہیں کہ: ابتدائے امر میں مرد سونے وغیرہ کی انگوٹھیاں پہنا کرتے تھے اور لوگ ان سے خطرہ محسوس کرنے لگے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کے علاوہ عورتوں کے لئے حلال قرار دے دیا، سو جو چیز عورتوں کے لئے باعث خطر تھی ان کیلئے مباح کردی گئی اور اباحت نے خطرہ کو منسوخ کردیا اور امام نووی نے شرح مسلم میں اس پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔ (زهر الربی علی المجتبی)

والثّانی: انّ النّساء احوج الی تزیین لیرغب فیهنّ ازواجهنّ و لذلک جرت عادة العرب و العجم جمیعا بان یکون تزیینهن اکثر من تزیینهم، فوجب ان یرخّص لهنّ اکثر ممّا یرخّص لهم و لذلک قال صلّی اللّٰه علیه وسلّم: اُحِلَّ الذَّهَبُ وَالْحَرِیْرُ لِلاِنَاثِ مِنْ اُمَّتِیْ وَ حُرِمَ عَلٰی ذُکُوْرِهَا-انتهی ما فی حجة الله البالغة للشیخ الشاه ولی الله المحدث الدهلوی، (حجۃ اللہ مترجم ۴۳۰ طبع کراچی نور محمد)

''اور دوسری بات یہ کہ: خواتین زیب و زینت کی زیادہ ضرورت مند ہیں، تاکہ ان کے شوہر ان میں راغب ہوں، اسی لئے تمام عرب وعجم میں یہ بات عام ہے کہ عورتوں کی زیبائش مردوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے، سو ضروری تھا کہ ان کو مردوں کی نسبت زیادہ رخصت دی جائے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ سونا وریشم میری امت کی خواتین کے لئے حلال اور مردوں کے لئے حرام قرار دیئے گئے ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

درموطا امام مالک مذکورست کہ عبداللہ بن عمر زیور طلائی میپوشانید دختران

وکنیزکان خودرا از زر پس برنمی برآورد از زیور ایشان زکوٰۃ۔ (موطا مسویٰ/۲۰۷)

”موطا امام مالک میں ہے کہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی بیٹیوں اور کنیزوں کو سونے کا زیور پہنایا کرتے تھے اور اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرتے تھے۔“

مالک عن نافع انّ عبد اللّٰہ بن عمر کان یحلّ بناتہ و جواریہ الذّھب ثمّ لا یخرج حلیّھنّ الزّکوۃ -انتھی، (موطا ا/۲۱۴،فوائد عبدالباقی)

”مالک، نافع سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر اپنی بیٹیوں اور بچیوں کو سونے کا زیور پہنایا کرتے تھے اور ان کے زیور کی زکاۃ نہ ادا کرتے تھے۔“

وجہ سوم:

کہ یہ وعیدِ نار سونے کا زیور پہننے پر نہیں فرمائی، بلکہ یہ وعید نار ایسے لوگوں کے لئے ہے جو اسے بقصد ریا اور نمود وتکبر کے طور پر استعمال کریں اور جاہلیت کی سی زینت وسنگار کا اظہار کرنے والے ہوں، کیونکہ یہ ہر زمانہ کے اہل اسراف واتراف اور اغنیاء کا شعار رہا ہے، سو جوان امور خارجیہ سے متصف ہوکر سونے کا زیور پہنے اس کے لئے وعیدِ نار کا موجب ہے اس لئے کہ لباس حریر اور طلائی زیورات میں اکثر و بیشتر ریاء وتکبر پایا جاتا ہے، بخلاف چاندی کے زیور کے کہ یہ اغنیاء کے نزدیک عرفاً نہایت بے قدر تصور کیا جاتا ہے، اسی تکبر وریاء کے فاخرانہ لباس اور سونے کے زیور سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُھْرَۃٍ اَلْبَسَہُ اللّٰہُ ثَوْبَ مَذِلَّۃٍ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔[1]

”جوکوئی فاخرانہ لباس پہنتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو روزِ قیامت ذلت ورسوائی کا لباس پہنائے گا۔“

---

[1] ابن ماجہ ۲/۱۱۹۲، احمد ۲/۱۳۹، ابوداود ۴/۳۱۴، مصابیح السنہ ۳/۱۹۸

سو اس حدیث میں لباس شہرت اور ریاء و افتخار آخرت میں موجب لباس مذمت ہوا نہ کہ نفسِ لباس زینت۔ چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

اَللّٰهُ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ۔[۱]

''اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔''

پھر فرمایا:

مَنْ تَرَکَ لُبْسَ ثَوْبِ جَمَالٍ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَيْهِ، وَ فِي رِوَايَةٍ تَوَاضُعًا كَسَاهُ اللّٰهُ حُلَّةَ الْكَرَامَةِ۔[۲]

''جس شخص نے قدرت کے باوجود تواضع وانکساری کرتے ہوئے لباس جمال ترک کیا اللہ تعالیٰ اس کو حلہ کرامت پہنائے گا۔''

شارع کا مقصود یہ ہے کہ فاخرانہ لباس اور بیش قیمت سونے کے زیورات جہاں دنیا میں محنت شاقہ اور موجبِ جانفشانی ہیں وہاں آخرت سے غفلت ونسیان کا سبب بھی ہیں اور بقدر حاجت براری، دارین میں راحت واطمینان کا سبب ہوگا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يَابَنِيْ آدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِيْ سَوْآتِكُمْ وَرِيْشًا وَّ لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ...... الآية (اعراف ۲۶)

''اے آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور موجبِ زینت بھی ہے اور تقویٰ کا لباس، یہ اس سے بڑھ کر ہے۔''

'' خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا'' کو اپنانا ہی زیب دیتا ہے، اور اسی اظہار ونمود و افتخار کے باعث امام عبدالرحمٰن نسائیؒ نے ''بَابُ الْكَرَاهَةِ لِلنِّسَاءِ فِيْ اِظْهَارِ الْحُلِيِّ وَالذَّهَبِ'' عورتوں کو سونا اور زیورات کے اظہار کی کراہت کا باب قائم کیا ہے اور اس

---

۱ مسلم ۱/۹۳، مسند احمد ۴/۱۳۳، ۱۳۴، ۱۵۱، مصابیح ۳/۴۰۲

۲ رواہ ابوداؤد ۵/۱۳۸، مصابیح السنہ ۳/۱۹۸) والترمذی ۴/۶۵۰ ۔ کذا فی المشکوۃ)

میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ سے دو طریق سے روایت نقل کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ:

خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَقَالَ: مَعْشَرَ النِّسَاءِ اَمَا اِنَّهُ لَيْسَ مِنكُنَّ امْرَءَةٌ تُحَلِّيْ ذَهَبًا تُظْهِرُهُ اِلَّا عُذِّبَتْ۔[1]

''ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا: اے عورتوں کی جماعت خبردار! جس عورت نے سونے کا زیور پہن کر اس کا اظہار کیا وہ عذاب سے دوچار ہوگی۔''

پس سونے کا ریا، وتکبیر کے طور پہن کر اظہار کرنا تو موجبِ وعید نار ہوگا اور بلا ریاء و افتخار پہننا اس وعید سے خارج ہوگا، کیونکہ جملہ ''تُظْهِرُهُ'' ''ذَهَب'' کی صفت واقع ہوا ہے جو کہ اس بات کی بین دلیل ہے۔ کما لا یخفی علی المتامل الذکی الماہر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ازواجِ مطہرات کو زیور پہننے سے روکنا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گاہے بگاہے اپنے اہل کو ترغیب و ترہیب کی بنا پر ریشم و زیور پہننے سے مطلقاً منع فرماتے تھے جیسا کہ نسائی میں ہے:

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يُخْبِرُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم كَانَ يَمْنَعُ اَهْلَهُ الْحِلْيَةَ وَالْحَرِيْرَ وَ يَقُوْلُ: اِنْ كُنْتُمْ تحِبُّوْنَ حِلْيَةَ الْجَنَّةِ فَلَا تَلْبَسُوْهَا فِي الدُّنْيَا۔[2]

''حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل کو زیور اور ریشم سے منع کرتے تھے اور فرماتے: اگر تم جنت کے زیور اور ریشم کو پسند کرتی ہو تو اسے دنیا میں

---

[1] مانی النسائی ۲/۲۷۷ (سلفیہ) مختصر ابقدر الحاجۃ۔

[2] النسائی ۸۔۱۳۵ السیوطی، فتح الربانی ۱۷/۲۶۷، مشکوۃ ۲/۱۲۷۵

مت پہنو۔''

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات کو بوقت شب جگاتے اور فرماتے تھے:

مَنْ يُوقِظُ صَوَاحِبَ الْحُجُرَاتِ ، رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِي الْآخِرَةِ۔ (فتح الباری ۳/۱۴، اطراف ۴۲۲۴، ۷۳۴۷)

''کون ہے جو اہل حجرات (ازواج مطہرات) کو جگائے (تاکہ وہ نماز پڑھیں)، کتنی ہی عورتیں جو دنیا میں لباس پہننے والی ہیں قیامت کے روز ننگی ہوں گی۔'' (ترمذی احمد شاکر ۵/۴۸۷)

یہ ترغیب عبادت، نمازِ تہجد اور اعراض عن الدنیا کی خاطر اور مواخذہ آخرت سے ترہیب کے لئے ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ لباس زینت سے مطلقاً منع نہ کرتے تھے کہ ہر مقام پر حرمتِ عمومی خلاف نقل وعقل اور اس آیت کریم کے مخالف ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ...... الآیۃ (اعراف/۳۲)

''کہہ دیجئے کہ اللہ کے پیدا کئے ہوئے اسباب زینت کو، جن کو اس نے اپنے بندوں کے لئے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کسی شخص نے حرام کیا ہے۔ الآیۃ

لیکن لوازمات ضرودیہ سے بڑھ کر چمک دمک و اسراف تقرب الٰہی اور آخرت میں رفعِ درجات کے لئے مضر ہے، یہ نہیں کہ یہ مطلقاً حرام اور دخولِ نار کا موجب ہے۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا:

يَا عَائِشَةُ اِنْ اَرَدْتِ اللُّحُوْقَ بِيْ فَلْيَكْفِكِ مِنَ الدُّنْيَا كَزَادِ الرَّاكِبِ وَ اِيَّاكِ وَ مُجَالَسَةَ الْاَغْنِيَاءِ۔[1]

''اے عائشہ (رضی اللہ عنہا)! اگر تو مجھ سے ملنا چاہتی ہے تو تجھے

---

[1] رواہ الترمذی ۴/۲۴۵، حاکم ۴/۳۱۲، مصابیح السنۃ ۳/۱۹۷ کما فی المشکوۃ

دنیا سے سوار کے توشہ کی مانند کافی ہو اور دولت مندوں کی ہم نشینی سے بچتی رہو۔"

وجہ چہارم:۔

یہ وعید نار ان لوگوں کے لئے ہے، جو ہمہ وقت دنیا کی حرص میں لذات و شہوات، فاخرانہ لباس اور بیش قیمت نفیس زیورات کے طلبگار، مال و دولت کے اسراف میں ایک دوسرے سے بڑھ کر مستغرق رہتے ہوئے دنیا کے لذائذ وظرائف فراہم کرنے میں لگے رہتے ہیں، حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر شب و روز اسی میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں، اور خود کو فقراء و مساکین سے اعلیٰ تصور کرتے ہوئے بڑے نازاں و فرحاں رہتے ہیں اور دنیا کی رغبتوں میں اللہ و رسول کو بھول جاتے ہیں ۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے ایسے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا اور ان کی امت کو سنایا:

وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًاo (کہف/۲۸)

"اور خبردار! تیری نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں کہ دنیوی زندگی کے ٹھاٹھ کے ارادے میں لگ جا، دیکھ اس شخص کا کہنا نہ ماننا جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا اور جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور جس کا کام حد سے گزر چکا ہے۔"

عورتیں خصوصاً خواہشات دنیاوی پر مرمٹتی ہیں اور سونے کے خوشنما زیورات پر جان چھڑکتی ہیں اور بھاری بیش قیمت زیور پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی حرص میں مبتلا، شب و روز اسی میں ایسی حواس باختہ رہتی ہیں کہ احسان فراموش ہو جاتی ہیں جیسا کہ بخاری میں ہے:

وَيَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ وَ يَكْفُرْنَ الْاِحْسَانَ، لَوْاَحْسَنْتَ اِلٰى اِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَاَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ: مَا رَاَيْتُ

مِنکَ خَیرًا قَطُّ۔ (فتح الباری ۱/۸۳، احمد ۱/۲۹۸، ۳۵۹)

''خاوند کے احسان کا انکار کرتی ہیں اگر تم پوری عمر ان کے ساتھ احسان کرو پھر ذرا ناگواری پیدا ہو جائے تو فوراً کہے گی میں نے تم سے کبھی خیر نہیں دیکھی۔''

اور اسی مال کی کثرت ہی کی خواہش مند رہی ہیں:

؎ گل خورشید ٹیکا ہو قمرا کا ہو بازو کا

اور سونے کے زیور کی کم مقدار پر اکتفا نہیں کرتیں، بلکہ زیورات کی مختلف انواع و اقسام اور زیادہ سے زیادہ حصول کی خواہش کرتے ہوئے اسراف و اتراف میں گم ہو جاتی ہیں، مثلاً جو زیور دو تین تولہ میں بن سکتا ہے اس پر خوش نہیں ہوتیں جبکہ پانچ چھ تولہ کا نہ بن جائے، حالانکہ زیور ایک تولہ کا ہو یا دو چار تولہ کا زیب و زیبائش میں مساوی ہے اس پر قناعت نہیں کرتیں، بلکہ متعدد الانواع زیورات سے زیب و زینت کی طلبگار رہتی ہیں۔ عورتوں کی اسی آرائشِ نقش و نگار کی بے تحاشا حرص کے پیش نظر پر تقی میر نے کہا ہے:

یار کی بالی کا جھمکا قدرت اللہ کی
عقد پروین کان میں زہرہ کی زیور ہو گیا

مزید فرمایا:

تیرے زیور کے نگین رات کو ایسے چمکے
ایک جگنی سے ہوئے سینکڑوں جگنو پیدا

بہر حال حد سے بڑھی ہوئی مال کی حرص و محبت آخرت سے غفلت و نسیان کا موجب ہے اور اسراف کی تعریف یہ ہے:

لتجاوز مالکم یکن فی حقه ان یتجاوز

وہ اتنا حد سے بڑھا جتنا اسے بڑھنا روا نہ تھا

اور یہ عادت شرعاً و عقلاً مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فرقان میں عباد الرحمٰن

کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًاo (الفرقان/ ۶۷)

''اور جو خرچ کرتے وقت بھی نہ تو اسراف کرتے ہیں نہ بخیلی، بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل طریقے پر خرچ کرتے ہیں۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

اَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحَابُ النَّارِ......الآية (مؤمن ۴۳)

''بے شک اسراف کرنے والے دوزخی ہیں۔''

وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كُلْ مَاشِئْتَ وَالْبَسْ مَا شِئْتَ ما خَطَاَتْكَ اثْنَتَانِ سَرَفٌ وَّ مَخِيْلَةٌ۔ (رواہ البخاری، فتح الباری ۲۵۲/۱۰)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کہ جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پیو، بشرطیکہ دو باتیں نہ ہوں (ایک) اسراف (دوسرا) تکبر۔(بخاری)

و عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ تَصَدَّقُوْا وَالْبَسُوْا مَالَمْ يُخَالِطْ اِسْرَافٌ وَلاَ مَخِيْلَةٌ ۔(رواہ احمد و النسائی و ابن ماجہ ۱۱۹۲/۲، فتح الباری ۲۵۲/۱۰)

''حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ اور پیو، صدقہ کرو اور پہنو، جب تک اسراف اور تکبر نہ ہو۔''

جب مباح چیز میں اسراف و تکبر پایا گیا تو وہ چیز شرعاً ممنوع ہوئی یعنی محظور لغیرہ ہوئی لعینہ اور اسی حرص شدید پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ وَ عَبْدُ الْخَمِیْصَةِ۔ کما رواہ البخاری عن ابی ھریرۃ۔ (فتح الباری حدیث ۲۷۸۷، مصابیح السنۃ ۳/۲۱۶)

''ہلاک ہو جائے درہم و دینار کا بندہ اور خمیصہ (چادر) کا بندہ۔''

سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اسراف و اتراف کثیر پر ''لُبْسُ الذَّهَبِ اِلَّا مُقَطَّعًا'' (ماسوا کٹے ہوئے سونے کے پہننے) سے نہی کی ہے۔ کما رواہ النسائی۔

قال فی النّھایة: اراد الشیء الیسیر و کرہ الکثیر الّذی ھو عادۃ اھل السّرف و الخیلاء-انتھی کذا ذکر الشیخ جلال الدین السیوطی و شرح النسائی سلفیہ ۲/۲۷۸)

''نہایہ میں ہے کہ: اس سے آپ نے تھوڑی چیز مراد لی ہے اور مسرفین و متکبرین کی عادتِ تکثیر کو ناپسند کیا ہے۔''

اور اہل الحدیث کو بنظر اسناد اصل میں بھی کلام ہے اور اس کا بیان بالفعل متعذر ہے۔

امام نووی شرح مسلم نے باب قائم کیا ہے:

تَحْرِیْمُ خَاتَمِ الذَّهَبِ عَلَی الرِّجَالِ وَ نَسْخُ مَاکَانَ مِنْ اِبَاحَتِهٖ فِی اَوَّلِ الْاِسْلَامِ۔

''مردوں کو سونے کی انگوٹھی پہننے کی حرمت اور ابتدائے اسلام میں اس کے جواز کے منسوخ ہونے کا بیان۔''

واجمع المسلمون علی اباحة خاتم الذّھب للنّساء و اجمعوا علی تحریمه علی الرّجال الا ما حکی عن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن محمّد بن حزم انّه اباحه و عن بعض انه مکروہ لا حرام و ھذان النّقلان باطلان قائلھما مجموعه بھذہ الاحادیث التی ذکرھا مسلم مع

اجماع من قبله علی تحریمه مع قوله صلّی الله علیه وسلّم في الذّهب والحریر: انّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ علٰی ذُكُوْرِ اُمَّتِیْ حِلٌّ لِاَنَاثِهَا-انتهی، (مسلم ۲/۱۹۵)

''اور مسلمانوں کا عورتوں کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننے کے جواز پر اجماع ہے اور وہ اس پر بھی متفق ہیں کہ وہ مردوں کے لئے حرام ہے۔ ماسوا ابوبکر بن عمر بن محمد بن حزم کے مخالف قول کے کہ انہوں نے اس کو مباح قرار دیا ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ وہ مکروہ تو ہے مگر حرام نہیں، اور یہ دونوں باتیں گزشتہ سطور میں مذکور ریشم و سونے کی حرمت سے متعلق فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب باطل ہیں کہ: یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام اور ان کی عورتوں کے لئے حلال ہیں۔''

اور ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوزخ کی وعید سونے کا زیور پہننے پر نہیں فرمائی بلکہ اس افراط پر ہے جو کہ نمود وریاء اور فخر و تکبر کا موجب بنتا ہو۔ و کم من شيء یکره او یحرّم بمجاورة شيء آخر کما تقرر عند المحدثین والمجتهدین (کتنی ہی چیزیں کسی دوسری چیز کے اتصال سے مکروہ یا حرام ہو جایا کرتی ہیں) کما لا یخفی علی المتامل الماهر بالنصوص۔ اور ہماری اس تحریر کی تائید میں محدث علامہ شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغۃ میں رقمطراز ہیں:

اللّباس والزّینة والاواني و نحوها: اعلم انّ النبیّ صلّی الله علیه وسلّم نظر الی عادات العجم وتعمّقاتهم في الاطمنان بلذّات الدّنیا فحرّم رؤسها و اصولها و کره مادون ذلک، لانه علم انّ ذلک مفض الی نسیان الدّار الآخرة، مستلزم للاکثار من طلب الدّنیا- فمن تلک الرّؤس اللّباس الفاخر، فانّ ذلک اکبر همّهم

فخرهم و البحث عنه من وجوه منها:

الاسبال فی القمص والسّراویلات فانّه لایقصد بذلک السّتر والتّجمّل اللذان هما المقصودان فی اللباس وانما یقصد به الفخر واراءة الغنی ونحو ذلک- والتجمل لیس الا فی القدر الّذی یساوی البدن قال صلّی اللّٰه علیه وسلّم: لاَ یَنْظُرُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِلَی مَنْ جرَّ اِزَارَهٗ بَطَرًا- وَ قَالَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِزْرَةُ الْمُؤْمِن اِلی اَنْصَافِ سَاقَیْه، وَلاَ جُنَاحَ عَلَیْه فَمَا بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ الْکَعْبَیْنِ وَ مَا اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِکَ فَفِی النَّارِ-

و منها: الْجِنْسُ الْمُسْتَغْرَبُ النَّاعِمّ عَنِ الثِّیَاب، قَالَ صَلّی اللّٰه عَلَیْه وسلّم: مَنْ لَبِسَ الْحَرِیْرَ فِی الدُّنْیَا لَمْ یَلْبِسْهُ یَوْمَ الْقِیَامَة-

و منها: الثوب المصبوغ بلون مطرب یحصل به الفخر والمروة فنهی رسُوْلُ اللّٰه صَلّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم عن الْمُعَصْفَر والْمُزعفر، وَقال: انّ هٰذهٖ مِنْ ثِیَابِ اَهْلِ النَّارِ- والمذموم: الامعان فی التکلّف والمرائة و التّفاخر بالثّیاب و کسر قلوب الفقراء- و فی الفاظ الحدیث اشارات الی هذه المعانی، کما لا یخفی علی المتامل-

و مناط الاجر ردع النّفس عن اتّباع داعیة الغمط والفخر و من تلک الرّؤوس الحلیّ المترفة، و هیهنا اصلان، احدهما: انّ الذّهب هوالّذی یفاخربه العجم و یفضی جریان الرّسم بالتّحلّی به الی الاکثار من طلب الدّنیا دون الفضّة. و لذلک شدّد النّبی صلّی اللّٰه

علیہ وسلّم فی الذّھب و قال: وَ لٰکِنْ عَلَیْکُمْ بِالْفِضَّةِ فَالْعَبُوْا بِھَا۔

والثّانی : ان النّساء احوج الی تزیین لیرغب فیھنّ ازواجھنّ ولذلک جرت العادۃ العرب والعجم جمیعا بان یکون تزیینھنّ اکثر من تزیینھم، فوجب ان یرخّص لھنّ اکثر ممّا یرخّص لھم و لذلک قال صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم: اُحِلَّ الذَّھَبُ وَالْحَرِیْرُ لِلْاِنَاثِ مِنْ اُمَّتِی وَ حُرِّمَ عَلٰی ذُکُوْرِھَا۔ ما فی حجة اللّٰہ البالغة بقدر الحاجة ۲/۱۸۹، ۱۹۰)

لباس، زیبائش اور برتن وغیرہ:۔

جان لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے عجمیوں کی عادات اور ان کا دنیا کی لذتوں سے اطمینان حاصل کرنے اور ان میں گہری دلچسپی لینے کے پیش نظر ان کے اصول وقواعد کو حرام اور اس کے علاوہ کو مکروہ قرار دیا ہے، اس لئے کہ ان کو معلوم تھا کہ، وہ آخرت کے بھولنے کا موجب ہے اور طلب دنیا کے حصول کی بہتات کو مستلزم ہے۔ سو ان اصول میں سے ایک فاخرانہ لباس ہے جو ان کے لئے باعثِ فخر اور ان کا مطمح نظر ہے اور اس کا باعث کئی ایک اسباب ہیں:

ان میں سے ایک قمیص اور شروال کو نیچے لٹکانا ہے، جس سے نہ پردہ اور نہ ہی تزیین مقصود ہوتی ہے جو کہ لباس کا اصل مطلوب ہے بلکہ اس سے مقصود فخر ومباہات اور اظہارِ ثروت وغیرہ ہوا کرتا ہے۔ اور تزئین وآرائش تو وہی اچھا لگتا ہے جو جسم کے مساوی ہو، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ ولم نے فرمایا ہے کہ: اللہ تعالیٰ روز قیامت اس شخص کی طرف نظرِ رحمت سے نہ دیکھے گا جو اپنی تہہ بند

کو تکبر سے گھسیٹ کر چلتا ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا! مومن کی چادر پنڈلیوں کے درمیان تک ہوتی ہے اور اس میں کوئی حرج جبکہ وہ ٹخنے اور نصف پنڈلی کے مابین ہو اور جو اس سے نیچے ہوگی تو وہ حصہ دوزخ میں جائے گا۔

اور ان میں سے ایک: کپڑوں کی نرم و ملائم اور نادر قسم ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں نہیں پہنے گا۔

اور ان میں سے دوسرا: بھڑ کیلے و شوخ رنگوں کا لباس ہے جس سے فخر و نخوت ٹپکتی ہو۔ سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معصفر (زرد رنگ) اور مزعفر (زعفران سے رنگے ہوئے) لباس سے منع کیا ہے اور فرمایا: یہ دوزخیوں کا لباس ہے۔ اور مذموم صفت یہ ہے: تکلف و نخوت، فاخرانہ لباس اور فقراء کے دل توڑنے میں مبالغہ آرائی سے کام لینا، جس کا حدیث کے الفاظ میں مفہوم موجود ہے اور اجر کا دارومدار نفس کو حقارت و تکبر کے داعیہ کی اتباع سے روکنا ہے اور انہیں قواعد سے فاخرانہ زیورات بھی ہیں، جس کی دو وجوہ ہیں:

۱۔ عجمی لوگ چاندی کو چھوڑ کر سونے پر فخر کرتے ہیں، جبکہ اس کا اظہار کرنا طلب دنیا کی کثرت کی طرف لے جانے والا ہے۔ اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کے متعلق سختی کی ہے، اور فرمایا: چاندی کو پہنا کرو اور اس سے دل بہلاؤ۔

۲۔ عورتوں کو اس سے اس لئے مستثنیٰ کیا تاکہ وہ اس سے اپنے شوہروں کے لئے زیبائش حاصل کریں۔ اور یہی طریقہ عرب و عجم میں مروج ہے، کیونکہ عورتوں کی تزئین مردوں کی نسبت زیادہ

ہے۔ تو ضروری تھا کہ ان کو مردوں کی نسبت زیادہ رخصت دی جاتی۔ اسی لئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سونا میری امت کی عورتوں کے لئے حلال اور مردوں کے لئے حرام کیا گیا ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ)

پس شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی بحث سے بھی یہی واضح ہوا کہ بہت زیادہ اسراف واتراف اور فخر ونمود، منہی عنہ اور دوزخ کی وعید کا موجب ہے، اور عدم اسراف ونمود اس وعید میں داخل نہیں ہے۔ **کمالا یخفی علی المتامل الماھر بکلام الشیخ المحدث۔**

اور جو روایات سونے کے پہننے سے متعلق ابوداؤد وغیرہ میں موجود ہیں تو وہ تکثیرِ مزید وافراط پر محمول ہیں، چنانچہ جواز وعدم جواز کی احادیث کے مابین تطبیق دی جائے گی یا پھر عدمِ جواز والی روایات منسوخ تصور ہوں گی۔ جیسا کہ مندرجہ بالا امام بغویؒ، ابن شاہینؒ، نوویؒ، شیخ جلال الدین سیوطیؒ اور شاہ صاحبؒ کی تحریروں سے واضح ہے۔ لیکن شاہ صاحب اکثار کو فتویٰ سے ہٹ کر تقویٰ کی بنا پر منع کرتے ہیں کہ اجماع مسلمین کی مخالفت مستلزم نہ ہو۔ اسی طرح مولانا (شاہ) محمد اسماعیل شہید (رحمۃ اللہ علیہ) کی بحث بھی تقویۃ الایمان میں فتویٰ کی بجائے تقویٰ کی بنیاد پر ہے، کیونکہ تردیدات، تشکیکات اور منویعات کی ایک گونہ توجیہ کرتے ہوئے حتماً وعیدِ نار تو نہیں ہوسکتی ہاں حدیث کے ظاہری اعتبار سے تو ممکن ہے، لیکن واضح نسخ ناممکن ہے۔

مولانا موصوف علیہ الرحمہ، ابوداؤد کی حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سونے کی بالی، نتھ، ہار، کنگن، چوڑیاں اور کیٹھی عورتوں کو پہننا حرام ہے، مگر دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو سونا پہنا جائز ہے اور مردوں کے لئے دونوں کا استعمال حرام ہے، خواہ دونوں مخلوط ہوں یا علیحدہ علیحدہ، تو اس مضمون کو یوں سمجھا جاسکتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ چاندی کا زیور عورتوں کو پہننا مطلقاً درست ہے اور اگر صرف سونا جیسے کڑے، کیٹھی، بالیاں اور نتھ ہو تو

وہ نادرست ہے اور اگر اس میں چاندی ملی ہوئی ہو یا ملمع ہو یا جڑاؤ ہو تو جائز ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ سونا بھی مطلق مباح ہے، مگر اس کا استعمال اچھا نہیں جیسے طلاق جائز ہے مگر اچھی نہیں یا یہ حدیث اس زیور کے حق میں ہے جس کی زکاۃ نہ دی جائے......الخ (تقویۃ الایمان)

تو مولانا ممدوح کے نزدیک بھی توجیہات ثلاثہ کی بنا پر تقویٰ کی وجہ سے اچھا نہیں۔ فاذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال کما لا یخفی۔

ابوداؤد کی وعیدِ ناز والی احادیث کی اسنادی حیثیت:

واضح رہے کہ ابوداؤد میں وعیدِ نار والی احادیث میں بنظرِ اسناد کلام ہے:

پہلا طریق:

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ مَسْلَمَةَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ يَعْنِي ابْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ أُسَيْدِ بْنِ أَبِي أُسَيْدِ الْبَرَادِ عَنْ نَافِعِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمِ قَالَ: مَنْ أَحبَّ أَنْ يُحَلِّقَ حَبِيْبَهُ حَلْقَةً مِنْ نَارٍ فَلْيُحَلِّقْهُ حَلْقَةً مِنْ ذَهَبٍ، وَ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُسَوِّرَ حَبِيْبَهُ سِوَارًا مِنْ نَارٍ فَلْيُسَوِّرْهُ سِوَارًا مِنْ ذَهَبٍ، وَ لٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِالْفِضَّةِ فَالْعَبُوْا بِهَا (ابوداؤد ۲/۲۲۵، مشکوٰۃ ۲/۱۲۵۶ البانی۔ اسید قلیل الحدیث، تھذیب ۱/۳۴۳)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو کوئی یہ پسند کرے کہ اپنے دوست کو آگ کا کڑا پہنائے تو وہ اسے سونے کا کڑا پہنا دے، اور جو پسند کرے کہ اپنے دوست کو آگ کا کنگن پہنا دے تو وہ اسے سونے کا کنگن پہنا دے اور لیکن تم چاندی سے دل بہلاؤ۔"

اس طریق میں عبدالعزیز اگرچہ صدوق تھا، لیکن کتب غیر سے روایت کرتا تھا اور خطا واقع ہوتی تھی جیسا کہ تقریب میں ہے:

عبد العزيز بن محمد صدوق و كان يحدّث عن كتب غيره و يخطئ، و قال النسائي حديثه عن عبد الله العمري منكر من الثامنة (التقريب ۳۲۸)

''عبدالعزیز بن محمد صدوق ہے لیکن کتب غیر سے حدیث بیان کرتا اور غلطی کرتا تھا۔ امام نسائی نے کہا: اس کی حدیث عبیداللہ العمری سے منکر ہے، طبقہ ثامنہ میں سے ہے۔''

و اُسَيْدُ بْنُ اَبِي اُسَيْدِ الْبَرادِ من الخامسة مات في اوّل خلافة منصور (التقريب ۳۴۷)

اور یہاں [۱] عبدالعزیز بن محمد کی اسید بن ابی اسید سے روایت مُعَنْعَن ہے ان کی ملاقات کا ثبوت درکار ہے خواہ ایک ہی مرتبہ ہو تو انقطاع محتمل ہے، سو خطا اور انقطاع کے احتمال کے سبب روایت قابل احتجاج نہیں رہی۔

دوسرا طریق یہ ہے:

حَدَّثَنَا مُسَدَّدُ اَبُوْ عُوَانَةَ عَنْ رِبْعِي بْنِ حِرَاشٍ عَنِ امْرَأَتِهِ عَنْ اُخْتٍ لِحُذَيْفَةَ انَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ اما لَكُنَّ فِي الْفِضَّةِ مَا تَحَلَّيْنَ بِهِ اَمَا اَنَّهُ لَيْسَ مِنْكُنَّ امْرَءَةٌ تُحَلَّى ذَهَبًا تُظْهِرُهُ اِلَّا عُذِّبَتْ بِهِ-انتهى (ابوداود ۴/۴۳۶، نسائی ۸/۱۵۷، مسند احمد ۶/۳۵۷، مصابیح ۳/۲۱۰ قال اللباني في اسناده ضعف مشكوة ۲/۱۲۵۷)

''ربعی بن حراش رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہا کی ہمشیرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[۱] عبدالعزیز بن محمد کی معنعن روایت اس وقت غیر معتبر ہوگی جبکہ متہم بالتدلیس ہو، لیکن عبدالعزیز مذکور مدلس نہیں ہے (تقریب) نیز شیخ البانی نے اسے صحیح ابوداؤد ج ۲/۳۵۶۵ میں ''حسن'' کہا ہے۔ اور اس کے مزید متابعات آداب الزفاف ص ۱۳۳ میں نقل کیے ہیں۔ (خلیق)

وسلم نے فرمایا: اے عورتوں کی جماعت! کیا تم چاندی کا زیور نہیں بنا سکتیں۔ دیکھو! جو عورت سونے کا زیور پہن کر اس کا اظہار کرے تو اسے عذاب ہوگا۔''

اس روایت میں ربعی بن حراش کی بیوی مجہول الاسم والحال والضعف ہے۔

تقریب میں ہے:

رِبْعِيّ بْنِ حِرَاشِ عَنِ امْرَ ءَتِه لَمْ اَقِفْ عَلَى اسْمِهَا۔(کذا فی التقریب)

''ربعی بن حراش اپنی جس بیوی سے روایت کرتا ہے میں اس کے نام سے واقف نہیں ہو سکا۔''

نسائی کی حدیث کی اسنادی حیثیت:

سنن نسائی میں حدیث کے دو طریق ہیں:

اَخْبَرَنَا اِسْحَاق بْنُ شَاهِيْنَ الْوَاسِطِيُّ قَالَ اَخْبَرَنَا خَالِدٌ عَنْ مُطَرِّفٍ ح وَ اَخْبَرَنَا اَحْمَدُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ اَخْبَرَنَا اَسْبَاطٌ عَنْ مُطَرِّفٍ عَنْ اَبِی الْجَهْمِ عَنْ اَبِی زَيْدٍ عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رضی اللّٰه عنه قَالَ: كُنْتُ قَاعِدًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَاَتَتْهُ امْرَءَ ةٌ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ قَالَ: سِوَارَانِ مِنْ نَارٍ، قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ طَوْقٌ مِنْ ذَهَبٍ، قَالَ طَوْقٌ مِنْ نَارٍ، قالتْ قُرْطَانِ مِنْ ذَهَبٍ قَالَ: قُرْطَانِ مِنْ نَارٍ، قَالَ و كَانَ عَلَيْهَا سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ فَرَمَتْ بِهِمَا......الخ مَافِي النَّسائى۔(سلفیہ۲/۲۷۸)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ، میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ، ایک عورت آئی اور کہنے لگی یا رسول اللہ! سونے کے دو کنگن ہیں۔ آپ ﷺ نے

فرمایا: آگ کے دو کنگن ہیں، کہنے لگی یا رسول اللہ سونے کا ایک گلو بند ہے۔ فرمایا: آگ کا طوق ہے، کہنے لگی، سونے کی دو بالیاں ہیں۔ فرمایا: آگ کی دو بالیاں ہیں۔ کہا، اس نے سونے کے دو کنگن پہن رکھے تھے تو اس نے دونوں کو پھینک دیا۔"

ان دونوں طرق میں ابوزید راوی مجہول ہے۔ تقریب میں ہے:

اَبُوْ زَیْدٍ شَیْخٌ لِاَبِی الْجَهْمِ مَجْهُوْلٌ مِنَ الثَّالِثَةِ -

(تقریب ۵۸۸، فاروقی طبع ملتان)

"ابوالجہم کا شیخ ابوزید مجہول ہے جو کہ طبقہ ثالثہ سے ہے۔"

تو یہ دونوں طرق قابل اعتماد نہ رہے کیونکہ مجہول راوی سے حدیث کی سند نا قابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ کما لا یخفی علی الماهر. لهذا الفن۔

امام نسائی کا سند سے وہم کا ازالہ:

بعض علماء نے عورتوں کے لئے سونے کی حلت کی حدیث میں بسبب جہالت راوی مابین یزید بن ابی حبیب اور علی کے کلام کیا ہے وہ محض وہم ہے کیونکہ نسائی نے خود اس وہم کو دفع کیا ہے:

تَحْرِیْمُ الذَّهَبِ عَلَی الرِّجَالِ......

أخبرنا قتيبة قال حدّثنا اللّيث عن يزيد بن ابی حبيب عن ابی افلح الهمدانیّ عن ابی زرير انّه سمع علیّ رضی اللہ عنہ بن ابی طالب يقول : انّ نبیّ اللّٰه صلّی اللّٰه عليه وسلّم اخذ حريرا فجعله فی يمينه و اخذ ذهبا فجعله فی شماله ثمّ قَالَ: اِنَّ هٰذَیْنِ حَرَامٌ عَلٰی ذُکُوْرِ اُمَّتِیْ- (سلفیہ ۲/۲۷۸)

"حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم لیا اور اس کو اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑا اور سونا لیا اور اسے اپنے بائیں میں پکڑا پھر فرمایا: یہ دونوں چیزیں

میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔"

اخبرنا عیسی بن حمّاد اخبرنا اللّیث عن یزید بن ابی حبیب عن ابی الصّعبة عن رجل من همدان یقال له ابو صالح عن ابی زریر انّه سمع علیّ بن ابی طالب یقول: انّ رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم اخذ حریرا فجعله فی یمینه و اخذ ذهبا فجعله فی شماله ثمّ قال: اِنَّ هٰذَیْنِ حَرَامٌ عَلٰی ذُكُوْرِ اُمَّتِیْ۔ (نسائی سلفیہ ۲/۲۷۸)

اخبرنا محمّد بن حاتم فقال حدّثنا حبّان قال اخبرنا عبد اللّٰه عن لیث بن سعد قال حدّثنی یزید بن ابی حبیب عن ابی الصّعبة عن رجل من همدان یقال له افلح عن ابی زریر انّه سمع علیّا یقول: انّ نبیّ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم اخذ حریرا فجعله فی یمینه و اخذ ذهبا فجعله فی شماله ثمّ قال: اِنَّ هٰذَیْنِ حَرَامٌ عَلٰی ذُكُوْرِ اُمَّتِیْ۔ (سلفیہ ۲/۲۷۸)

قال ابو عبد الرّحمٰن و حدیث ابن المبارک اولٰی بالصّواب الا قوله افلح، فانّ ابا افلح اشبه۔

اخبرنا عمرو بن علیّ قال حدّثنا یزید بن هارون قال اخبرنا محمّد بن اسحاق عن یزید بن ابی حبیب عن عبد العزیز بن ابی افلح الهمدانیّ عن عبد اللّٰه بن زریر الغافقیّ قال سمعت علیّا یقول: اخذ رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم ذهبا فی شماله و حریرا فی یمینه فقال: حَرَامٌ عَلٰی ذُكُوْرِ اُمَّتِیْ۔ (سلفیہ ۲/۲۷۸)

اخبرنا علی بن الحسین الدّرهمیّ قال حدّثنا

عبدالاعلی عن سعید عن ایوب عن نافع عن سعید بن ابی ھند عن ابی موسیٰ انّ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم، قال: اُحِلَّ الذَّھَبُ وَالْحَرِیْرُ لِاِنَاثِ اُمَّتِیْ وَحُرِمَ عَلٰی ذُکُوْرِھَا۔ (سلفیہ۲/۲۷۸، مشکوۃ/۱۲۵۴، البانی)

واضح ہو کہ حدیث متعدد صحیح طرق سے مروی ہے۔ کما لا یخفی علی الماھر

عدم جواز پر استدلال اور اس کا جواب:

بعض لوگ حدیث "نَھٰی عَنْ لُبْسِ الذَّھَبِ اِلَّا مُقَطَّعًا" سے عورتوں کو سونا پہننے کے عدم جواز پر استدلال کرتے ہیں اس کا جواب تین طرح سے ہے:

اوّل:

اس کے رواۃ کا حال معلوم نہیں تاکہ ان کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کے سبب اس پر صحت اور عدم صحت کا حکم لگا کر دلیل لی جاسکے۔

دوم:

اگر اس کی صحت تسلیم بھی کر لی جائے تو یہ نہی عورتوں کے لئے نہیں، جیسا کہ ابوداوٗد نے سمجھا، بلکہ یہ مردوں کے لئے ہے، جیسا کہ امام نسائی نے سمجھا۔ اور اس حدیث کو "بَابُ تَحْرِیْمِ الذَّھَبِ عَلَی الرِّجَالِ" میں لائے ہیں، اور ہمارے قول کی دوسری دلیل نسائی کی روایت ہے: "نَھٰی لُبْسِ الْحَرِیْرِ یَعْنِی وَالذَّھَبِ اِلَّا مُقَطَّعًا" کیونکہ ریشم کی نہی تو خاص مردوں کے لئے ہے اور عورتوں کو حلال ہے، جس کے لئے بخاری ومسلم کی صحیح احادیث اس کی دلیل میں اور سونے کی نہی کی بھی دلیل جو اس پر معطوف ہے مردوں سے مخصوص ہوگی۔

اور "مُقَطَّعًا" کے معنی: ریزہ ریزہ کرنا ہے۔ یعنی کپڑوں پر جو سونے کے ستارے اور ریشم کے ٹکڑے لگاتے ہیں۔ مرقاۃ میں ہے:

الا مقطّعا، بفتح الطاء المشددة ای مکسّرا قطعا صغارا

مثل الضّباب علی الاسلحة والخواتیم الفضّیة و اعلام الثّیاب، کذا ذکرہ بعض الشراح- (مرقاة ۲۷۶/۸)

''طائے مشدد کی فتح کے ساتھ، یعنی چھوٹے چھوٹے قطعات میں توڑا ہوا، جیسے اسلحہ کی کنڈیاں، چاندی کی انگوٹھیاں اور کپڑوں پر نقوش۔''

سوم:

اگر نہی کو عورتوں کے حق میں تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ نہی احتیاط و تنزیہ پر مبنی ہوگی کہ تھوڑی چیز انگوٹھی وغیرہ کی مانند پر قناعت کریں اور زیادہ حرص نہ کریں جیسا کہ اسے بڑی بسط و تفصیل سے ثابت کیا گیا ہے۔ اور مندرجہ بالا صحیحہ بہت سی احادیث نہی سے صارف عن التحریم ہیں۔ وہ بھی اس وقت جبکہ نہی کو عورتوں کے حق میں تسلیم کرنا فرض کیا جائے، ورنہ اصل بات وہی ہے کہ نہی مردوں کے لئے خاص ہے جیسا کہ نسائی کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اس تحریر کی تکمیل کے بعد ابوداؤد کی شرح ابن قیم بھی مل گئی ہے اس شرح سے بھی تحریر بالا کی تائید و ترمیم ہوگی:

بَابٌ فِی الذَّهَبِ لِلنِّسَاءِ-

''عورتوں کو سونا پہننے کا بیان۔ اور حدیث بیان کی گئی ہے:

ایّما امرأة جعلت فی اذنها خرصا من ذهب، ثمّ قال المنذریّ و اخرجه النّسائیّ قال ش، قال القطّان: و علّة هذا الخبر انّ محمود بن عمرو راویه عن اسماء مجهول الحالِ و ان کان قدروی عنه جماعة- وروی النَّسَائِیُّ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کُنْتُ قَاعِدًا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَتْهُ امْرَءَةٌ فَقَالَتْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ قَالَ: سِوَارَانِ مِنْ نَارٍ، قَالَتْ طَوْقٌ مِنْ ذَهَبٍ

قَالَ: طَوْقٌ مِنْ نَارٍ قَالَتْ قُرْطَيْنِ مِنْ ذَهَبٍ، قَالَ: قُرْطَيْنِ مِنْ نَارٍ، قَالَ وَ كَانَ عَلَيْهَا سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ فَرَمَتْ بِهِمَا-فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، اِنَّ الْمَرْأَةَ اِذَا لَمْ تَتَزَيَّنْ لِزَوْجِهَا صَلِفَتْ عِنْدَهُ، فَقَالَ: مَا يَمْنَعُ اِحْدَا كُنَّ اَنْ يَصْنَعَ قُرْطَيْنِ مِنْ فِضَّةٍ ثُمَّ تُصَفِّرُهُ بِزَعْفَرَانٍ اَوْ بِعَبِيْرٍ- قال ابن القطان و علّته انّ ابا زيد راويه عن ابی هريرة مجهول لا يعرف روی عنه غير ابی الجهم و لا يصحّ هذا-(نسائی ۲/ ۱۴۷)

''جو کوئی عورت اپنے کان میں سونے کا چھلہ ڈالے........ پھر منذری نے کہا کہ اس کو نسائی نے روایت کیا شارح کہتے ہیں کہ ابن القطان نے کہا: اس روایت کی علت یہ ہے کہ محمود بن عمرو ''اسماء'' سے روایت کنندہ مجہول الحال ہے، اگرچہ اس سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ امام نسائی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو ایک عورت آئی اور کہنے لگی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سونے کے دو کنگن! آپ نے فرمایا: آگ کے دو کنگن ہے، کہنے لگی سونے کے گلوبند ہیں، فرمایا: آگ کا طوق ہے۔ کہنے لگی! سونے کی دو بالیاں ہیں، فرمایا: آگ کی دو بالیاں ہیں۔ راوی کہتے ہیں اس کے پاس سونے کے جو دو کنگن تھے اس نے ان کو پھینک دیا اور کہنے لگی یا رسول اللہ، اگر عورت اپنے شوہر کے لئے سنگار نہ کرے تو اس کے ہاں بے وقعت ہو جاتی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: انہیں کون سی چیز مانع ہے کہ وہ چاندی کی دو بالیاں بنوائے، پھر اسی زعفران کے پانی سے یا خوشبو سے رنگ لے۔ ابن القطان کہتے ہیں اس کی علت یہ ہے

کہ: ابو زید جو کہ حضرت ابو ہریرۃ سے روایت کنندہ ہے وہ مجہول ہے اس سے ابوالجہم کے علاوہ نے روایت ہے اور یہ صحیح نہیں۔''

وَ فِي النَّسائِيُّ: عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ جَاءَ تْ بِنْتُ هُبَيْرَةَ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم وَ فِيْ يَدِهَا فتخ فَقَالَ! كذا فى كتاب ابى اى خواتيم ضِخَامٌ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم يَضْرِبُ يَدَهَا فَدَخَلَتْ عَلٰى فَاطِمَةَ تَشْكُوْا اِلَيْهَا الَّذِىْ صَنَعَ بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَانْتَزَعَتْ فَاطِمَةُ سِلْسِلَةً فِي عُنُقِهَا مِنْ ذَهَبٍ قَالَتْ هٰذِهِ اَهْدَاهَا اَبُو حَسَنٍ فَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم وَالسِّلْسِلَةُ فِي يَدِهَا، فَقَالَ: يَا فَاطِمَةُ اَيَغُرُّكِ اَنْ يَقُوْلَ النَّاسُ ابنَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم وَ فِي يَدِهَا سِلْسِلَةٌ مِنْ نَارٍ- ثُمَّ خَرَجَ وَ لَمْ يَقْعُدْ، فَاَخْرَجَتْ فَاطِمَةُ بِالسِّلْسِلَةِ اِلَى السُّوْقِ فَبَاعَتْهَا وَ اشْتَرَتْ بِثَمَنِهَا غُلَامًا وَ قَالَ مَرَّةً وَ ذَكَرَ كَلِمَةً مَعْنَاهَا فَاَعْتَقَتْهُ فُحَدِّثَ بِذٰلِكَ فَقَالَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَنْجٰى فَاطِمَةَ مِنَ النَّارِ- (نسائی ۸/۱۳۶، للسیوطیؒ)

''نسائی میں ہے: ثوبان سے مروی ہے کہ ھبیرہ کی بیٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ میں موٹے چھلے تھے۔ سو وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا (یعنی جو اس کے ہاتھ پر مارا تھا) اس کا گلہ کیا، تو فاطمہ نے اپنے گلے میں پہنی ہوئی سونے کی زنجیر کو اتار پھینکا، اور کہا: یہ مجھے ابو حسن (یعنی حضرت علیؓ) نے ہدیہ دیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر اور اس کے ہاتھ میں

آگ کی زنجیری ہے۔ پھر آپ ﷺ چلے گئے اور بیٹھے نہیں تو حضرت فاطمہؓ نے اس زنجیری کو بازار بھیجا اور فروخت کردیا اور اس کی قیمت کا ایک غلام خرید لیا۔ آپ نے لفظ ''غلام'' کہا یا ''عبد'' یا اس قسم کا کوئی اور لفظ ذکر کیا، اور آپ رضی اللہ عنہا نے اس کو آزاد کردیا، اور پھر یہ عمل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے فاطمہؓ کو آگ سے نجات دے دی۔''

قال ابن القطّان: و علّته انّ النّاس قدقالوا انّ روایة یحیی قد قال حدّثنی ابن سلام، و قد قیل انّه دلّس ذلک و لعلّه کان اجازة زید بن سلام فجعل یقول حدّثنا زید۔

''ابن القطان نے کہا: اس کی علت یہ ہے جو کہ لوگوں نے بیان کی ہے کہ یحییٰ کی روایت ابن سلام سے منقطع ہے اور اس بنا پر بھی کہ یحییٰ نے کہا ''حدثنی ابن سلام'' اور یہ بھی کہا گیا کہ اس نے اس میں تدلیس کی ہے اور ممکن ہے کہ وہ زید بن سلام کی طرف سے ''اجازۃ'' ہو اور اس نے ''حدثنا زید'' کہنا شروع کردیا۔''

فِی النسائی ایضا:

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم کَانَ یَمْنَعُ اَهْلَهٗ وَالْحِلْیَةَ الْحَرِیْرَ وَ یَقُوْلَ: اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ حِلْیَةَ الْجَنَّةِ وَ حَرِیْرَهَا فَلَا تَلْبَسُوْهَا فِی الدُّنْیَا۔ (نسائی ۸/ ۱۳۵)

اور نسائی میں ہے:

''حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل کو ریشم و زیور سے منع کرتے تھے اور فرماتے: اگر تم جنت کا

ریشم و زیور پسند کرتے ہو تو اسے دنیا میں مت پہنو۔"

فاختلف النّاس فی ھذہ الاحادیث و اللّٰہ کلّمت علیھم فطائفة سلکت بھا مسلک الّضعیف و علّلھا کلّھا کما تقدّم۔

"سو لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے اور بخدا انہوں نے ان روایت میں کلام کیا ہے: ایک جماعت نے تو ضعیف کہتے ہوئے تمام روایات کو معلول قرار دیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔"

وطائفة ادّعت انّ ذلک کان فی اوّل الاسلام ثمّ نسخ، واحتجّت بحدیث اَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ حُرِّمَ لِبَاسُ الْحَرِیْرِ وَالذَّھَبِ عَلٰی ذُکُوْرِ اُمَّتِیْ وَ اُحِلَّ لِاَنَاثِھِمْ، قال التّرمذیّ حدیث صحیح، و رواہ ابن ماجة فی سننه من حدیث علیّ و عبد اللّٰہ بن عمرو عن النّبیّ صلّی اللّٰہ علیه و سلّم۔ (ترمذی ۴/ ۲۱۷)

"اور ایک جماعت نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ اور انہوں نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سونا اور زیور میری امت کی عورتوں کے لئے حلال اور ان کے مردوں کے لئے حرام قرار دیا گیا ہے۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث صحیح ہے اور اس کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت علی و عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔"

و طائفة حملت احادیث الوعید علی من لم یودّ زکوة حلیّھا، فامّا من ادّته فلا یلحقھا ھذا الوعید ، واحتجّوا بحدیث عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدّہ اَنَّ امْرَءَ ةً

اَتَتْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم وَ مَعَھَا ابْنَتُھَا وَ فِی یَدِ ابْنَتِھَا مِسْکَتَانِ غَلِیْظَتَانِ مِنْ ذَھَبٍ فَقَالَ لَھَا: تُعْطِیْنَ زَکٰوۃَ ھٰذَا؟ قَالَتْ، لَا! قَالَ: اَیَسُرُّکِ اَنْ یُسَوِّرَکِ اللّٰہُ بِھِمَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ سِوَارَیْنِ مِنْ نَارٍ-فَخَلَعَتْھُمَا وَ اَلْقَتْھُمَا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم قَالَتْ، ھُمَا لِلّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ-

وَ بِمَا رَوٰی اَبُوْدَاؤدَ عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ کُنْتُ اَلْبَسُ اَوْضَاحًا مِنْ ذَھَبٍ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَکَنْزٌ ھُوَ؟ فَقَالَ: مَا بَلَغَ مَا تُؤَدِّی زَکٰوتَہٗ فَتُزَکّٰی فَلَیْسَ بِکَنْزٍ-و ھذا من افراد ثابت بن عجلان و الّذی قبلہ من افراد عمرو بن شعیب-(ابوداؤد۲/۲۱۲،بیہقی ۴/۱۴۰،نصب الرایہ۲/۳۷۱)

''ایک جماعت نے احادیث وعید کو اس پر محمول کیا ہے کہ جو اپنے زیور کی زکاۃ نہ ادا کرتا ہو، اور جو کوئی زکاۃ ادا کرے وہ اس وعید میں شامل نہ ہوگا۔ اور انہوں نے حضرت عمرو بن شعیب کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی اور اس کے ساتھ اس کی بیٹی تھی اور اس کی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن پہنے ہوئے تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ان کی زکوۃ دیتی ہو؟ کہنے لگی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تجھے پسند ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ روز قیامت ان کے بدلے آگ کے دو کنگن پہنا دے؟ تو اس نے ان دونوں کو اتارا اور آپ کو دے دیئے اور کہا: یہ دونوں اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہیں۔

اور دوسری روایت جو ابوداؤد میں ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں سونے کے پازیب پہنا کرتی تھی،

میں نے کہا اللہ کے رسول کیا یہ خزانہ ہے؟ آپ نے فرمایا: جو زکاۃ کے نصاب کو پہنچ جائے اور اس کی زکاۃ ادا کرو تو وہ کنز (خزانہ) نہیں ہے۔ یہ ثابت بن عجلان اور اس سے ماقبل وہ عمرو بن شعیب کے تفردات میں سے ہے۔"

فی اسنادہ عتاب بن بشیر ابو الحسن الحرانی قد اخرج له بخاری و تکلم فیه غیر واحدٍ-وطائفة من اهل الحدیث حملت احادیث علی من اظهرت حلیّتها و تبرّجت بها دون من تزیّنت بها لزوجها، و به قال النّسائی فی سننه و قد ترجم علی ذلک "الکراهة للّنساء فی اظهار الحلیّ والذّهب" ثمّ ساق احادیث الوعید واللّٰه اعلم- (ابوداؤد۲/۲۱۳)

"محدثین کے ایک گروہ نے احادیث وعید کو اس پر محمول کیا ہے کہ، جو اپنے شوہر کے علاوہ زیور کے سنگار کا اظہار کرے اس طرح کا موقف امام نسائی نے بھی اپنی سنن میں اختیار کا ہے۔ اور انہوں نے عورتوں کے لئے زیور اور سونے کے اظہار کرنے کی کراہت پر باب قائم کیا ہے، پھر اس کے ساتھ وعید کی احادیث ذکر کی ہیں۔" واللہ اعلم۔

ثمّ ذکر حدیث میمون القنادرفیه، نهی عن لبس الذّهب الا مقطّعا الی قول المنذری-ففیه الانقطاع فی موضعین ثمّ قال-

"پھر انہوں نے میمون القنادر کی "نهی عن لبس الذهب الا مقطعاً" روایت منذری کے قول تک ذکر کی ہے جس میں دو جگہ انقطاع ہے۔" پھر کہا:

وَ قَدْرَوَاهُ النَّسَائِيُّ مِنْ بَيْهَسِ بْنِ فَهْدَانَ عَنْ اَبِي شَيْخِ الْهِنَائِيِّ عَنْ مُعَاوِيَةَ وَ قَدْ تَقَدَّمَ الْكَلَامُ عَلٰى هٰذَا الْاِسْنَادِ فِي الْحَجِّ، وَ رَوَاهُ عَنْ اَبِي شَيْخٍ عَنْ اَبِي حمان اَنَّهُ سَمِعَ مُعَاوِيَةَ- وَ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ اَيْضًا مِنْ حَدِيْثِ بَيْهَسِ بْنِ فَهْدَانِ اَخْبَرَنَا اَبُوْ شَيْخٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لُبْسِ الذَّهَبِ اِلَّا مُقَطَّعًا، وَ قَدْرُوِيَ فِي حَدِيْثٍ آخَرَ اِحْتَجَّ بِهٖ اَحْمَدُ فِي رِوَايَةِ الْاَثْرَمِ: مَنْ تَحَلّٰى بِخَرْبَصِيْصَةٍ كُوِيَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ-فَقَالَ الْاَثْرَمُ: فَقُلْتُ اَيُّ شَيْءٍ خَرْبَصِيْصَةٌ؟ قَالَ شَيْءٌ صَغِيْرٌ مِثْلُ الشَّعِيْرَةِ، وَقَالَ غَيْرُهُ: مِنْ عَيْنِ الْجَرادَةِ- وَ سَمِعْتُ شَيْخَ الْاِسْلَامِ يَقُوْلُ: حَدِيْثُ مُعَاوِيَةَ فِي اِبَاحَةِ الذَّهَبِ مُقَطَّعًا هُوَ فِي التَّابِعِ غَيْرَ الْفَرْدِ كَالذَّرِّ وَالْعَلَمِ وَ نَحْوِهِ -وَ حَدِيْثُ الْخَرْبَصِيْصَةِ هُوَ فِي الْفَرْدِ كَالْخَاتَمِ وَغَيْرِهٖ فَلَا تَعَارُضَ بَيْنَهُمَا، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ-انتهى۔ (معالم السنن ۶/ ۱۲۵ تا ۱۲۸)

" اور اس کو نسائی نے بیہس بن فھدان ، ابو شیخ الہنائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کی سند کے بارے میں "حج" میں کلام گزر چکی ہے، اور اس کو ابو شیخ ، ابو حمان نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے اور اس کو نسائی نے بھی بیہس بن فھدان سے روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونا پہننے سے منع فرمایا ہے ماسوا ٹکڑے ٹکڑے کے، یعنی تھوڑا۔ ایک اور دوسری حدیث سے بھی جو اثرم کی روایت ہے

احمد نے استدلال کیا ہے کہ جس نے خربصیصہ پہنا روزِ قیامت اسے اسی سے داغ دیا جائے گا۔ اثرم کہتے ہیں میں نے کہا وہ خربصیصہ کیا ہے؟ کہنے لگے وہ ایک چھوٹی سی چیز جو کی مانند ہے۔ بعض نے کہا وہ چھوٹی سی چیز، ٹڈی کی آنکھ کی مثل ہے۔ اور میں نے شیخ الاسلام سے سنا ہے وہ کہتے ہیں کہ: حضرت معاویہؓ کی حدیث سونے کے ایسے قطعات کی اباحت کے بارے میں ہے جو کہ منفرد چیز کے تحت ضمناً استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ بٹن اور نقوش وغیرہ، اور خربصیصہ والی روایت منفرد اشیاء کے بارہ میں ہے جس طرح کہ انگوٹھی وغیرہ۔ سو ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔"

(واللہ ولی التوفیق)

دوزخیوں کا ہمیشہ دوزخ میں رہنا

سوال:

دوزخیوں کا ہمیشہ دوزخ میں رہنے سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد مدت دراز تک (مقید) رہنا ہے: جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ حرانیؒ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ سے منقول ہے، یا پھر ہمیشہ عذاب میں ایسا مبتلا رہنا کہ عذاب کا نہ کبھی وقفہ اور نہ دوزخ سے کبھی رہائی ہو سکے گی؟

جواب:

دوزخیوں کیلئے لامتناہی عذاب:

دوزخیوں کا دوزخ میں ہمیشہ رہنے کا یہ معنی ہے کہ ان سے عذاب کبھی منقطع نہ ہو گا۔ چنانچہ کلام اللہ کی ظاہری آیات سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل اور جمہور علمائے اسلام کے مذہب سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ عذاب لامتناہی اور بغیر کسی انقطاع کے ہو گا جو کہ آیات ذیل سے ظاہر ہے:

۱)...... وَمَاهُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (البقرہ:۱۶۸)

اور وہ آگ سے نکلنے والے نہیں۔

۲)...... كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا (حج/۲۲)

اور جب بھی وہاں غم سے نکلنا چاہیں گے، تو پھر اس میں دھکیل دیئے جائیں گے۔

۳)...... وَلَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا۔ (فاطر/۳۵)

نہ تو ان کی قضا آئیگی کہ وہ مر جائیں (اور عذاب سے چھوٹیں)

اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا۔

۴)...... وَلَا يَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ۔ (اعراف:۴۰)
اور نہ وہ لوگ کبھی جنت میں جائیں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ کے اندر سے نہ چلا جائے۔

۵)...... وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّداً فَجَزَاءُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيْهَا۔ (نساء:۹۳)
اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے، اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

۶)...... وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَداً (جن:۲۳)
اور جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریں ان کیلئے دوزخ کی آگ (تیار) ہے وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

ان آیات کے علاوہ مزید دوسری آیاتِ کریمہ میں بھی مفہوم پایا جاتا ہے۔
نیز صحیحین میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يُجَاءُ الْمَوْتُ فِي صُوْرَةِ كَبْشٍ أَمْلَحٍ فَيُوْقَفُ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ وَيُقَالُ يَااَهْلَ النَّارِ خُلُوْدٌ فَلَامَوْتَ۔ مسلم ۴/ ۲۱۸۸ (اختصاراً)

موت کو ایک سفید اور سیاہ رنگت کے مینڈھے کی صورت میں لایا جائے گا اور جنت و دوزخ کے مابین کھڑا کر کے پکارا جائے گا، اے جنت والو! (تمہیں یہاں) ہمیشہ رہنا ہے اور موت نہیں آئے گی، اور اے دوزخ والو! (تمہیں بھی یہاں) ہمیشہ رہنا ہوگا اور موت نہیں آئے گی۔

اور اسی طرح قتل وغیرہ جیسے کبیرہ گناہوں کی سزا میں بھی صحیح احادیث سے ”فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّداً فِيْهَا اَبَداً“ کے الفاظ ثابت ہیں۔ ان تمام آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار کو دوزخ میں لامتناہی اور دائمی عذاب ہوگا۔ جس آیت یا حدیث سے اس کے مخالف مفہوم ذہن میں آتا ہو اس کے معنی میں تاویل کی گئی ہے جیسا کہ آیت ذیل سے مترشح ہے:

خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَاءَ رَبُّكَ ......الآية (هود: ۱۰۷)

ہمیشہ اسی دوزخ میں رہیں گے جب تک (آخرت کے) آسمان و زمین قائم رہیں گے مگر جن لوگوں کو تیرا مالک چاہے گا۔

یعنی اس آیت شریفہ کا ظاہری مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عذاب منقطع ہوگا اور ان کے عذاب کی کوئی انتہاء بھی ہے۔ چنانچہ صرف استثناء ''اِلَّا'' اس پر دلالت کرتا ہے۔

کفار سے انقطاع عذاب کی توجیہات:

ابن حجر ہیثمی مکی، زواجر ج ۲/۲۸۱ میں لکھتے ہیں کہ علماء نے اس کی بیس توجیہات بیان کیں ہیں۔ ان میں سے بعض آسمانوں اور زمین کے ہمیشہ رہنے کی مدت سے مقید کرنے کی حکمت ذکر کرتے ہیں اور بعض استثناء اور اس کے معنی کی حکمت کا عندیہ دیتے ہیں، پھر منجملہ اُن بیس وجوہ کے دو تین وجوہات بیان کیں ہیں، اور قاضی القضاۃ محمد بن علی شوکانی نے تفسیر فتح القدیر ج ۳/۵۵۲ میں استثنا مذکور کے بیان میں گیارہ وجوہ ذکر کیں اور کہا یہ وہ اقوال ہیں جن پر ہمیں اہل علم کے اقوال سے وقوف حاصل ہوا ہے ان میں سے بعض پر اعتراض کئے گئے ہیں اور ان کے جواب بھی دیئے گئے ہیں، میں نے ان کو ایک مستقل رسالہ کی شکل میں جو کہ بعض اہل علم کے سوال کے جواب میں تالیف کردہ ہے، واضح کر دیا ہے، انتہی۔

لیکن ......اس فقیر کو اس رسالہ پر اطلاع نہیں ہوئی، اللھم ارزقنا۔ اور ان کی تفسیر سے دوام کا قول ہی ظاہر ہے۔ اور جہاں آیت کے یہ معنی ذکر کئے ''وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اس دوام کے لئے نہ انقطاع ہوگا اور نہ ہی انتہا'' کہا، اس کو ابن عباسؓ کی تفسیر جو کہ امام بیہقی نے کتاب '' البعث و النشور '' میں فرمان باری تعالیٰ: ''اِلَّا مَاشَاءَ رَبُّكَ'' کے تحت بیان کی ہے، سے تقویت ملتی ہے وہ فرماتے ہیں: سو بے

شک تیرے رب نے چاہا کہ یہ لوگ ہمیشہ دوزخ میں اور یہ ہمیشہ جنت میں رہیں۔[1]

امام ابن جریر طبری نے بھی اس آیت کے بیان میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ: اللہ تعالیٰ نے آگ سے مشروط رکھا کہ ان کے چہروں کو کھائے۔ اور ابو الشیخ نے سدی سے اس آیت کی تفسیر میں کہا اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مشیت سے وہ حکم آیا جس نے اس آیت کو منسوخ کر دیا سو اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں یہ آیت نازل فرمائی:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا (النساء: ۱۶۸)

جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم کیا انہیں اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا اور نہ انہیں کوئی راہ دکھائے گا۔

---

[1] (۱) جیسا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

يدخل الله اهل الجنة الجنة و اهل النار النار ثم يقوم موذن بينهم فيقول يا اهل الجنة لاموت و يا اهل النار لاموت كل خالد فيما هو فيه (مسند احمد حدیث ۶۱۳۹)

جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں چلے جائیں گے۔ پھر ان سے ایک آواز دینے والا کھڑا ہوگا اور کہے گا اہل جنت اب موت نہیں ہے اہل دوزخ اب موت نہیں ہے ہر کوئی اس میں رہے گا جس میں ہے۔ (مسند احمد ۹/۱۰ احمد شاکر)

(۲) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اذا اصار اهل الجنة الجنة و اهل النار النار جئی بالموت حق توقف بين الجنة و النار ثم يذبح ثم ينادی اهل الجنة خلود لاموت يا اهل النار خلود لا موت داد اهل الجنة فرحا الی فرحهم و از داد اهل النار حزنا الی حزنهم (فتح الباری ۱۱/۳۶۱، ۶۲)

اہل جنت، جنت میں اور اہل دوزخ جب دوزخ میں داخل کیے جائیں گے تو موت کو لا کر جنت دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا پھر پکارا جائے گا جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں فرق یہ کہ اہل جنت کو فرحت، اہل دوزخ کو غم ملے گا"۔

(مزید تفصیل سیرت النبی ۴/۷۳۱ تا ۷۴۴)

[جاوید]

وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خَالِدِیْنَ فِیْھَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّکَ (ھود: ۱۰۸)

اور جو لوگ نیک بخت ہوں گے وہ ہمیشہ اسی جنت میں رہیں گے جب تک جنت کے آسمان و زمین قائم رہیں گے مگر جن کو تیرا پروردگار چاہے۔ یہ ایسی بخشش ہے جسکی کوئی انتہا نہیں۔ (کبھی آ کر نہ ہوئی)

سو اللہ تعالیٰ کی مشیئت سے وہ حکم آ چکا جس نے اس آیت کو منسوخ کر دیا جو مدینہ میں نازل ہوا:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا، لَھُمْ فِیْھَا اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَةٌ نُدْخِلُھُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا (النساء: ۵۷)

اور جو لوگ ایمان لائے اور شائستہ اعمال کئے ہم عنقریب انہیں ان جنتوں میں لے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ان کے لئے وہاں صاف ستھری بیویاں ہوں گی اور ہم انہیں گھنی چھاؤں (اور پوری راحت) میں لے جائیں گے۔

تو ان کے لئے ہمیشہ کا رہنا واجب کر دیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید کے معانی اور فرمان حمید کی مراد دوسروں کی نسبت زیادہ تر واقف ہیں، ان کی تفسیر دوسروں کی تفسیر سے مقدم اور تسلیم کرنے کے لائق ہے اور اس کی مؤید حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت مرفوع حدیث جو کہ ابن مردویہ کے نزدیک ثابت ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پڑھا اور فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ بعض بدبختوں کو آگ میں سے نکال کر جنت میں داخل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اور ابن جریر اور ابو الشیخ اور ابن مردویہ نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے آیت فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا......الخ پڑھ

کر کہا کہ ہمیں حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:
بعض لوگ آگ میں سے نکلیں گے اور ہم یہ نہیں کہتے جیسا کہ اھلِ حَرُوْرَاء (ایک موضع کا نام ہے جہاں سے خارجی "خذلهم الله" پیدا ہوئے) کہتے ہیں کہ جو شخص آگ میں داخل ہوا وہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔

اور ابن ابی حاتم نے آیت "مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ: ہر جنت کے لئے آسمان اور زمین ہے۔

اور یہ روایات نصوص میں محل نزاع ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ: آسمان و زمین کے دوام سے مراد، آخرت کے آسمان و زمین کی ہمیشگی مراد ہے جسے فنا نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان "اَلَّذِیْنَ شَقُوْا" گنہگار مومنوں اور کافروں دونوں کو شامل ہے۔ اور کلمہ "ما" (اِلَّا مَاشَاءَ رَبُّکَ) میں "من" کے معنی میں ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اہل توحید شافعین کی شفاعت اور اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بدولت آگ سے رہائی پائیں گے۔ چنانچہ صحیح متواتر دلائل جن سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ ہر عموم (جیسا کہ "لَابِثِیْنَ فِیْهَا اَحْقَابًا" یعنی اس میں صدیوں رہنے والے ہیں) کے لئے مخصص ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر کبیر ۸/۴۳۵ میں رقمطراز ہیں:

ایک گروہ نے اس سے عذاب کے متناہی اور منقطع ہونے پر دلیل لی ہے اس لئے کہ گناہ، ظلم متناہی ہے اور اس پر عذاب لامتناہی کرنا ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ ظلم سے مبرا ہے۔ انتہی۔ ابن حجر مکی نے اس کے جواب میں کہا کہ:

"لفظ احقاب" انتہا کا متقاضی نہیں بلکہ اہل عرب دوام کی تعبیر ایسی عبادات سے کرتے ہیں اور گناہ پر ہمیشہ عذاب دینے میں کوئی ظلم نہیں کیونکہ کافر پختہ ارادہ رکھتا ہے کہ جب تک زندہ رہے گا ہمیشہ کفر پر ہی رہے گا سو دائمی گناہ پر ہی دائمی عذاب ہوا تو یہ عذاب، گناہ کے مطابق ہی سزا ہوئی۔ انتہی۔

دوزخ کا دوزخیوں سے خالی ہو جانا:

ابن حجر مکی نے عذاب کے دوام کے ذکر کے بعد کہا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت جو امام احمد کے نزدیک اس لفظ کے ساتھ ثابت ہے:

لَيَأْتِيَنَّ عَلَى جَهَنَّمَ يَوْمٌ تَصْفِقُ فِيهِ أَبْوَابُهَا لَيْسَ فِيهَا أَحَدٌ وَذٰلِكَ بَعْدَمَا يَلْبَثُونَ فِيهَا أَحْقَابًا......

''جہنم پر ایک ایسا دن ضرور آئے گا جس میں اس کے دروازے بجتے رہیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ اس رات کے بعد ہو گا جب اس میں صدیوں ٹھہر چکے ہوں گے۔''

اس کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی غیر ثقہ ہے، جو بڑے بڑے جھوٹ روایت کرتا ہے ہاں! بہت سے لوگوں نے اس قول کو حضرت ابن سعدؓ اور ابو ھریرہؓ سے نقل کیا ہے اور امام ابن تیمیہؒ نے کہا یہی قول حضرت عمر، ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ عنہم کے اور حماد بن سلمہ، علی بن طلحہ الوالبی اور مفسرین کی ایک جماعت کا ہے۔ انتہی۔

اور ظاہر یہ ہے کہ یہ قول ان سے صحیح نہیں۔ اگر تسلیم کر بھی لیں تو کلام کا یہ معنی ہو گا اس پر گنہگار مومنوں میں سے کوئی نہ ہو گا لیکن کفار کی جگہیں ان سے بھری پڑی ہونگی ان سے کبھی نہ نکل سکیں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں اس کا ذکر فرمایا ہے انتہی کلام ابن حجر۔

میں کہتا ہے!

اس کی مانند صحابہ میں سے ابراہیم، جابر اور ابو سعید رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے ابو مجلز اور عبدالرحمن بن زید بن اسلم وغیرھما سے مروی ہے اور طبرانی نے معجم کبیر میں ابو امامہ صدی بن عجلان باھلی رضی اللہ عنہ سے اس باب میں روایت کی ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ تو صریح آیات واحادیث، آثار مرفوعہ اور اخبارِ ضعیفہ پر مقدم ہیں۔

ہاں! اس میں شک نہیں کہ علمائے متقدمین و متاخرین میں سے ایک گروہ کا یہ مسلک ہے، دوزخ کی ابدیت، جنت کی ابدیت کی طرح شارع کا منصوص علیہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ جنت کے بارے میں "اِلَّا مَاشَاءَ رَبُّکَ" کے بعد "عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ اَیْ غَیْرَ مُنْقَطِعٍ، یعنی بخشش بے انتہا ہے، فرمایا ہے، نیز ارشاد باری ہے:

اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَالَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ○ (صٓ: ۵۴)

"بے شک یہ ہمارا دیا ہوا رزق ہو گا جو کبھی ختم نہ ہو گا۔"

اور دوزخ کے بارے میں استثناء مذکور کے بعد فرمایا: "اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ " بے شک تیرا رب جو چاہے وہ کر گزرتا ہے۔ اور دوام سے متعلق کوئی مفید تعبیر ارشاد نہیں فرمائی۔ سو دونوں کی ابدیت میں فرق ہو گا۔

اور بعض شرعی و عقلی دلائل دوزخ کے کسی نہ کسی دن ختم ہونے کے متقاضی ہیں اور اس سے دوزخیوں کا عذاب ختم ہونا بھی لازم آتا ہے۔ باوجودیکہ اس سے خلود فی النار بھی مترشح ہے۔ بایں معنی کہ جب تک دوزخ باقی ہے ہمیشہ اس میں رہیں گے اور اس سے نکل نہ سکیں گے اور جب دوزخ فنا ہو جائے گی، ان کا عذاب بھی مخلد نہ رہے گا۔ گو یہ زمانہ دراز اور لمبی مدت کے بعد ہی ہو، اور بلا شک یہ فرق نہایت نازک ہے ،اسی لئے حافظ ابن القیمؒ نے کتاب "حادی الارواح الی بلاد الافراح" کے ستر سٹھویں باب میں بہشت اور دوزخ کی ابدیت میں مبسوط کلام کرنے کے بعد اسی طرف میلان کیا اور کہا کہ: حکمت الٰہی میں یہ بات نہیں کہ شر اور بدی ہمیشہ رہے جس کی کوئی انتہا اور انجام نہ ہو، تو وہ خیر کے بالکل مساوی ہو جائے گی، انتہی۔

اور عجب نہیں کہ ابن قیمؒ کے استاد حضرت ابن تیمیہؒ بھی شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی طرح اسی طرف گئے ہوں، لیکن محرر سطور نے اس مسئلہ میں ان سے اب تک کوئی نص صریح نہیں پائی۔

ہاں ابن القیم نے کتاب مذکور میں دونوں کے دوام میں شرعاً و عقلاً پچیس وجوہ سے فرق کیا ہے اور کہا: شائد تجھے یہ تحقیق کسی کتاب میں نہ ملے۔ اور اس کے ضمن میں

دوزخ کا دوام ثابت کرنے والوں کے دلائل کے جوابات دیئے اور دو تین اجزاء تک طویل کلام کر کے مطلب ثابت کیا اور ان دلائل اور جوابات پر غور کرنے سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ دوزخ کے ہمیشہ نہ رہنے پر ان کی دلالت اشارۃ النص اور بطور التزام کے ہے، اور مطابقت تضمن، اور دلالۃ النص کے طریق سے نہیں اور اسکی بنا وعید الٰہی میں خلف کے ممکن ہونے پر ہے، چنانچہ متکلمین اہل سنت کا مذہب ہے اس لئے کہ رحمتِ الٰہی غضب پر غالب ہے برخلاف اس کے کہ اس میں مذہب منصور جمہور کے بلکہ نصوص سمعیہ کے مخالف ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ منطوق مفہوم پر مقدم ہوتا ہے، کما تقرر فی الاصول۔ لھذا حافظ ابن القیمؒ [1] نے بطور راسخ علماء کے مذکورہ بحث کے بعد اس کتاب میں لکھ دیا کہ: جو ہم نے اس مسئلہ میں درست ذکر کیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے احسان سے ہے اور جو خطا ہے وہ میرے اور شیطان کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس سے پاک اور بری ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر قائل کی زبان، قصد اور دل کے پاس ہے۔ واللہ اعلم

(واللہ الموفق)

---

[1] جہنم پر ایک دن ایسا بھی آئے گا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا۔ اس قسم کی تمام روایات غیر معتبر ہیں۔ (سیرت النبیؐ شبلی نعمانی ۴/۷۲۷ و شفاء العلیل

فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا

سوال:

فرض نماز کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانے سنت سے ثابت ہیں یا نہیں؟

جواب:

دعا میں مطلق ہاتھ اٹھانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل دونوں سے ثابت ہیں، لیکن فرض کی کوئی تخصیص نہیں ہے کہ فرائض ہی میں خصوصیت سے ہاتھ اٹھانے ثابت ہوں یا فرائض ہی میں منع ہو بلکہ دلائل کا اطلاق وعموم فرض کو بھی شامل ہے جب تک خصوصیت کی کوئی دلیل موجود نہ ہو۔

دعا میں مطلق ہاتھ اٹھانے کے دلائل:

۱)...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں اس قدر ہاتھ اٹھایا کرتے تھے کہ آپ کی بغل مبارک کی سفیدی دکھائی دیتی تھی۔ رواہ البیھقی فی الدعوات الکبیر: ۱/۱۴۱)

۲)...... اور سھل بن سعد رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم انگلیوں کو کندھوں کے برابر کرتے اور دعا فرماتے۔ (رواہ البیھقی۔ دعوۃ الکبیر: ۱/۱۴۰، حاکم ۱/۵۳۵)

۳)...... اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مَسْئَلَۃٌ (یعنی دعا کا ادب) یہ ہے کہ تو اپنے ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھائے۔ (ابوداؤد ۲/۱۶۶)

۴)...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ: تمہارا ہاتھوں کا اٹھانا بدعت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس (یعنی سینے) سے زیادہ نہیں اٹھایا کرتے تھے۔ (مشکوۃ ۲/۶۹۷، البانی)

۵)...... حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک تمہارا رب حیا والا صاحب کرم ہے، اپنی بندے سے حیا کرتا ہے جب اس کی طرف ہاتھ اٹھائے کہ ان کو خالی لوٹا دے۔ (ترمذی، ابوداؤد ۲/ ۱۶۵، ابن ماجہ ۲/۳/۱۲۷ فوائد، بیہقی)

حافظ ابن حجرؒ بلوغ المرام میں رقمطراز ہیں کہ اس حدیث کو اصحاب سنن اربعہ نے ماسوانسائی کے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا۔

۶)...... حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو ہاتھوں کی اندرونی حصہ سے سوال کرو اور ہاتھوں کی پشت سے سوال نہ کرو۔ (ابوداؤد ۲/ ۱۶۵)

۷)...... اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روائت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کرتے تھے تو دونوں ہتھیلیوں کو ملاتے اور ان کا اندرونی حصہ اپنے چہرہ کی طرف کرتے۔ (ابوداؤد ۲/ ۱۶۶، مشکوٰۃ ۲/ ۶۹۷)

۸)...... اور حضرت ابو لدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھوں کا اٹھاؤ اس سے قبل کہ طوقوں میں جکڑے جائیں۔ ان دونوں روایات کو امام غزالی نے احیاء العلوم میں ذکر کیا ہے۔ (احیاء العلوم ۱/ ۳۰۵)

دعا کے بعد ہاتھوں کا چہرے پر پھیرنا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا میں ہاتھ اٹھاتے ان کو اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک چہرے پر نہ پھیر لیتے۔ ترمذی ۵/۴۶۴۔ امام ترمذی نے اس حدیث کے لئے ''دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے کا'' مستقل باب قائم کیا ہے اور حدیث کے ذکر کے بعد کہا ہے یہ حدیث غریب ہے اس کو ہم حماد بن عیسیٰ ہی کی روایت سے پہنچاتے ہیں جو کہ اسے روایت کرنے میں منفرد اور قلیل الحدیث ہے اور اس سے لوگوں نے حدیث نقل کی۔ اور حنظلہ بن ابی سفیان ثقہ

ہے، یحییٰ بن سعید القطان نے اس کی توثیق کی ہے، انتہی۔ اور سائب بن یزید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہاتھ اٹھاتے تو اپنے چہرے پر پھیر لیتے۔ (بیہقی فی الدعوات الکبیر: ۱/۱۳۹، ابوداؤد ۲/۱۶۶، مشکوۃ ۲/۶۹۵)

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ان کو جب تک چہرے پر نہ پھیر لیتے ہٹاتے نہ تھے۔ (ترمذی)

حافظ ابن حجرؒ نے بلوغ المرام میں کہا ہے کہ اس حدیث کے شواہد ہیں۔ انہیں میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ابوداؤد میں مذکورہ ہے اور یہ تمام طرق اس بات کے متقاضی ہیں کہ یہ حدیث حسن درجہ کی ہے، انتہی۔ سو یہ وہ مرفوع اور موقوف دلائل ہیں جن سے مطلقا دعا میں ہاتھ اٹھانے ثابت ہیں اور ان میں ہاتھ چہرے پر پھیرنے کا بھی ذکر ہے۔

دعا میں ہاتھ اٹھانے کے خاص مقامات:

اور درج ذیل خاص خاص مقامات پر ہاتھ اٹھانا معلوم ہوتا ہے۔

صحیحین میں ہے کہ:

☆ اور خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں آپ ﷺ نے یہ دعا کرتے ہوئے ہاتھ اٹھائے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَبْرَءُ اِلَیْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدُ (فتح الباری ۸/۵۷، نسائی) یعنی اے اللہ جو خالد نے کیا میں اس سے تیری طرف برأت کا اظہار کرتا ہوں۔

☆ اور کوہ صفا پر آپ نے ہاتھ اٹھائے۔ مسلم۔ ابوداؤد

☆ اور بقیع میں اہل بقیع کی مغفرت کے لئے آپ ﷺ نے تین مرتبہ ہاتھ اٹھائے۔ بخاری مسلم۔

☆ اور آیت: اِنَّھُنَّ اَضْلَلْنَ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ۔ (انہوں نے لوگوں کو بہت

بہکایا) کی تلاوت کے وقت ہاتھ اٹھائے۔

☆ اور یہ دعا اَللّٰھُمَّ اُمَّتِی (اے اللہ! میری امت کو بچا۔ اے اللہ میری امت کو بچا) کے وقت بھی ہاتھ اٹھائے۔ (مسلم)

☆ اس طرح ایک ایسے لشکر کو روانہ کرتے وقت جس میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے ہاتھ اٹھا کر فرمایا:
اَللّٰھُمَّ لا تُمِتْنِیْ حَتّٰی یُرِیَنِیْ عَلِیًّا۔ اے اللہ! علی کے دکھانے سے قبل مجھے مدت نہ دیجئے! (رواہ الترمذی)

☆ ایسے ہی اہل بیت پر گلیم (چادر) ڈالتے ہوئے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا:
اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ (حاکم)۔ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔

نیز ان مقامات کے علاوہ بھی ہاتھ اٹھانے ثابت ہیں۔ امام نوویؒ نے شرح مہذب میں ہاتھ اٹھانے کے ثبوت میں صحیحین وغیرہما کی تیس (۳۰) کے قریب احادیث جمع کی ہیں۔ امام منذریؒ نے اس باب میں ایک جز تحریر کیا ہے، جبکہ امام سیوطیؒ نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس میں رقمطراز ہیں:

بعض لوگوں سے مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا کہ: دعا میں ہاتھ اٹھانے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے۔ تو مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا کہ اس باب میں تو احادیث مشہور ہی نہیں بلکہ متواتر ہیں، اس لئے کہ وہ متعدد طرق سے ثابت ہیں۔ سو اس رسالہ میں، میں نے مسئلۂ مذکور کو ثابت کیا ہے تاکہ جو کوئی اس کی طرف رجوع کرے اس سے فائدہ اٹھائے اور جو کوئی اس رتبہ کا نہ ہو سنت نبوی علیہ الصلوۃ والسلام میں بلا تحقیق کلام نہ کرے۔

میں کہتا ہوں:۔

کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل سے تقریباً چالیس سے زائد روایات منقول ہیں، جن میں صحیح بھی، حسن اور ضعیف

بھی ہیں۔ اور وہ بیس سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کردہ ہیں، انتہی۔ اس کے بعد ان احادیث کو بمع جرح و تعدیل کے ذکر کیا ہے۔ اور وہ رسالہ فقیر کے پاس موجود ہے۔

لیکن انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث جس کو بخاری نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء کے بغیر کسی دعا میں ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے تھے اور اس موقع پر اس قدر ہاتھ بلند کرتے کہ بغل شریف کی سفیدی نظر آنے لگتی، سو جمہور کے نزدیک یہ آپ کی خاص صفت یعنی ہاتھ زیادہ بلند کرنے پر محمول ہے۔ چنانچہ راوی کا قول ''حَتّٰی یُرٰی بَیَاضُ اِبِطَیْهِ'' اسی پر دلالت کرتا ہے، یا کیفیت رفع پر محمول ہے، جیسا کہ مسلم کی روایت میں آیا ہے: اِسْتَسْقٰی فَاَشَارَ بِظَهْرِ كَفِّهٖ اِلَی السَّمَاءِ۔ آپ نے ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کر کے طلب بارش کی دعا کی۔ یا حضرت انسؓ کے نہ دیکھنے پر محمول کیا ہے (مسلم/۸۹۶ حدیث مصابیح السنۃ ۱/۵۰۴) اور اس سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا عدم مشاہدہ ثابت نہیں ہوتا۔ اور پہلی توجیہ قوی ہے اور اس جواب سے امام مالکؒ نے قول کا جواب بھی موجود ہے کہ دعا میں استسقاء کے بغیر کہیں ہاتھ نہ اٹھانا چاہئے اور ان پر وہ احادیث جو ہاتھ اٹھانے کے ثبوت میں عموماً یا خاص مواقع میں وارد ہوئی ہیں حجت ہیں۔

فرض نماز کے بعد دعا کرنا:

حضرت ابو امامہؓ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا یا رسول اللہ! کون سی دعا میں قبولیت کی زیادہ امید ہے؟ آپ نے فرمایا: رات کے انتہائی حصہ میں اور فرض نماز کے بعد (ترمذی ۵/ ۵۲۸) (نسائی عمل الیوم و اللیلۃ، مصنف عبدالرزاق ۲/۴۲۴) اس طرح حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اے معاذ! خدا کی قسم میں تجھے دوست رکھتا ہوں سو تم فرض نماز کے بعد اس دعا کو ترک نہ کرنا:

اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ۔

''اے اللہ! اپنے ذکر شکر اور اچھی عبادت پر میری مدد فرما''۔[1]

یہ دونوں روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ فرض نماز کے بعد دعا کرنی چاہئے اور ہاتھ اٹھانے دعا کے آداب میں سے ہے۔ سو ہر دعا میں ہاتھ اٹھانے چاہئیں، لیکن حق یہ ہے............ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض کے بعد ایسا کرنا دائمی عمل نہ تھا۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ حدیث:

كُنْتُ اَعْرِفُ اِنْقِضَاءَ صَلٰوةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم بِالتَّكْبِيْرِ[2]

''میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اختتامِ نماز کو تکبیر (اللہ اکبر) سے پہچانا کرتا تھا۔''

اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ اس لئے حرمین شریفین ''زادھما اللہ تشریفا و تعظیما''میں یہ معمول ہے کہ صرف امام کے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور امام کی دعا کا انتظار نہیں کرتے، حالانکہ امام دستور حال کے مطابق کچھ دیر ذکر اور دعا کے لئے بیٹھا رہتا ہے لہٰذا ''سفر السعادۃ'' میں ہے کہ: سلام کے بعد یہ مروج دعا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات منبع سعادات میں سے نہیں تھی اور اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں اور یہ ایک بدعت حسنہ ہے۔ انتہی۔

ان کی مراد آج کل کی ہیئت کذائی کے دوام کی نفی ہے، ورنہ فرض نماز کے بعد دعا ثابت ہے، جس کا بیان ہو چکا ہے اور شیخ عبدالحق دہلوی نے ''شرح سفر السعادت'' میں فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث بروایت ترمذی جس سے نماز کے بعد دعا کا مستحب ہونا ثابت ہوتا ہے ذکر کر کے کہا: شائد مصنف کے نزدیک یہ حدیث پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی اسی لئے کہا کہ ''بدعت حسنہ'' ہے اور امام جزری نے حصن حصین میں ترمذی اور نسائی کے حوالہ سے فرض نماز کے بعد دعا کو اوقات اجابت سے شمار کیا۔ ہاں اگر مابعد

---

[1] (عون ۱/ حدیث ۱۵۱۸، مسند احمد ۵/ ۲۴۵، ۲۴۷ حاکم ۱/ ۲۷۳، ۳/ ۲۷۳، عمل یوم ۴۶، نسائی ۳/ ۵۳، ابن حبان ۳/ ۲۳۴) [2] (فتح الباری ۲/ ۳۲۵، مسلم ۱/ ۲۱۷، مصابیح ۱/ ۳۵۹)

اگر صلاۃ مکتوبہ سے بعد تشہد سلام سے قبل مراد لیا جائے تو مصنف کا قول حدیث سے موافق ہوسکتا ہے۔ انتہی۔

حافظ ابن القیمؒ کی رائے:

اور حافظ ابن القیمؒ کا بھی یہی مذہب ہے، چنانچہ انہوں نے ''ھدی نبوی''[1] میں کہا کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے متعلق اکثر جو دعائیں فرمائیں یا پڑھیں وہ نماز کے اندر تھیں، انتہی۔ یعنی ''مابعد صلاۃ'' سے آخر کا، قریب مراد ہے جو کہ تشہد ہے نہ کہ بعد از سلام۔ اور حافظ ابن القیمؒ نے اپنے استاد امام ابن تیمیہؒ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ سو اگر ان کا یہ دعویٰ صحیح ہو جائے تو دعا میں ہاتھ اٹھانا بھی ثابت ہو جائے گا، لیکن اس کے ثبوت میں کلام ہے۔ کیونکہ دبر کا اطلاق اس چیز پر آتا ہے جو صاحب دبر کی جنس میں داخل ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں: وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ۔ یعنی جو کوئی ان میں سے اس دن پشت دکھائے۔ اس طرح اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جو اس کی جنس سے نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قوم میں: وَ مِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ۔ ای أخیر اللیل عقب غروبھا۔ اور رات میں سے اس کی پاکی بیان کر اور تاروں کے پیچھے۔ اور جیسے عِتقُ التَّدْبِيْرِ بولا جاتا ہے۔ پس یہ لفظ دونوں معنوں میں مشترک ہوگا اور چونکہ مشترک لفظ کا ایک یا دو معنوں پر بلا دلیل محمول کرنا درست نہیں۔ اس لئے ناچار فیصلہ کا طریقہ یہ ہے کہ استعمال شرعی کی طرف رجوع کی جائے، اس کی وضاحت یوں ہوگی جیسا کہ بخاری میں ہے:

تُسَبِّحُوْنَ وَ تَحْمِدُوْنَ وَ تُكَبِّرُوْنَ خَلْفَ كُلِّ صَلَاةٍ۔

''ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سبحان اللہ و الحمد اللہ اور اللہ اکبر پڑھو۔''[2]

یہاں ''خلف کل صلاۃ'' میں خلف سے وہ زمانہ مراد ہے جو سلام کے بعد

---

[1] یعنی زاد المعاد فی ھدی خیر العباد [2] (فتح الباری ۲/۳۲۵، مسلم ۱/۲۱۶، مصابیح ۱/۳۶۱)

ہوتا ہے یہ اس پر دلیل ہے کہ ''دبر'' سے مراد مابعد صلاۃ ہے۔ یعنی فراغت کے بعد۔ اور ابو داوٗد کی حدیث کا یہ اضافہ ''اِثْرَ کُلِّ صَلٰوۃٍ (ہر نماز کے بعد)' اس کی اچھی طرح مزید واضح کر دیتا ہے اور یہ حدیث:

مَنْ سَبَّحَ دُبُرَ صَلٰوۃِ الْغَدَاۃِ مِائَۃَ تَسْبِیْحَۃٍ وَهَلَّلَ مِائَۃَ تَهْلِیْلَۃٍ غُفِرَتْ ذُنُوْبُهٗ وَلَوْ کَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ۔[1]

''جو کوئی نماز فجر کے بعد سو بار سبحان اللہ اور سو بار لا الہ الا اللہ پڑھے اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اگرچہ دریا کی جھاگ کے برابر ہوں۔''

یہاں پر دبر سے مراد مابعد نماز ہے یعنی سلام پھیر کر نماز سے نکل جانے کے بعد کا مفہوم ہے۔ اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی حدیث اس مطلب کو مزید واضح کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قَالَ دُبُرَ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ وَهُوَ ثَانٍ رِجْلَیْهِ قَبْلَ اَنْ یَّتَکَلَّمَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ - اَخْرَجَهُ التِّرْمِذِیْ۔[2]

''جو کوئی فجر کی نماز کے بعد اسی حال میں کہ وہ اپنا پاؤں موڑے ہوئے ہو (یعنی تشہد کی حالت میں بیٹھا ہوا ہو) کلام کرنے سے قبل لا الہ الاللہ وحدہ لاشریک له...... الخ کے آخر تک کہے۔''

سو یہ مقام خلاف میں نص ہے، اس لئے یہاں اگر ''دبر صلوۃ'' سے مراد قبل سلام رکھا جائے تو '' ثان رجلیه'' اور ''قبل ان یتکلم'' کی قید بے کار ہو جاتی ہیں۔ پس دعا فرض کے بعد ثابت ہوئی، اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی سلام سے قبل کی تخصیص ختم ہو گئی، لیکن فتح الباری میں کہتے ہیں کہ: اکثر حنابلہ جن سے میری ملاقات نہیں ہے

---

[1] (مسلم ۱/۴۴۸) [2] وقال حسن صحیح) عمل الیوم واللیلة: ۵۵۔

وہ اس طرح سمجھ رہے ہیں کہ حافظ ابن القیمؒ کی مراد نماز کے بعد دعا کی نفی کرنا ہے.........مگر یہ درست نہیں ! بلکہ ان کی کلام کا حاصل یہ ہے کہ: نمازی کا سلام کے فوراً بعد روبقبلہ بیٹھ کر بقید استمرار دعا نہیں کرنی چاہئے لیکن امام اگر اپنا چہرہ پھیر کر پہلے اذکار مشروعہ پڑھ کر دعا کرے تو ان کے نزدیک بھی منع نہیں ہے، انتہی۔

اگر یہ مفہوم درست ہو جائے تو کوئی نزاع نہیں رہتا، لیکن حافظ ابن القیمؒ کی کلام معنی اول میں ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

(واللہ المعین)

فرض نماز کے بعد دعا کا واقعہ:

البدایۃ والنھایۃ ۶/۳۲۸ میں حافظ ابن کثیرؒ حضرت علاء بن حضرمیؓ کے تذکرے میں فرماتے ہیں کہ:

علاء الحضرمی من سادات الصحابة العلماء العباد مجابی الدعوة کہ حضرت علاء رضی اللہ عنہ علماء عابدین اور سادات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تھے اور مستجاب الدعوات تھے۔

پھر بحرین کے مرتدین کے خلاف جنگ کے ایام میں صحابہ کرامؓ کی پریشانی کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں:

و نودی بصلوة الصبح حین طلع الفجر فصلی بالناس فلما قضی الصلوة جثا علی رکبتیه و جثا الناس و نصب فی الدعاء و رفع یدیه و فعل الناس مثله حتی طلعت الشمس و جعل الناس ینظرون الی سراب الشمس یلمع مرة بعد اخری وهو یجتهد فی الدعاء۔

اور طلوع فجر کے وقت اذان دی گئی تو انہوں نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب نماز پوری کرلی تو گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور لوگ بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور ہاتھ اٹھا کر (خشوع وخضوع) سے دعا میں مشغول ہوگئے۔ لوگوں نے بھی ساتھ ہی ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگنی شروع کی، حتیٰ کہ آفتاب طلوع ہوگیا۔ لوگ سورج کی کرنوں کو چمکتا دیکھتے اور حضرت علاء رضی اللہ عنہ دعا میں پورے انہماک سے مشغول رہے۔

نماز جمعہ کی شرائط

سوال:

نماز جمعہ کے جواز کے لئے تمام وہ شرائط جو کتب فقہ میں مذکور ہیں ان کی کوئی سند ہے یا نہیں؟

جواب:

جمعہ کیلئے مخصوص عدد اور جامع وغیرہ کی شرط:

جمعہ کی نماز دوسری فرض نمازوں کی مثل ہے۔ جو ان کی شروط ہیں مثلاً بدن، لباس اور جگہ وغیرہ پاک ہو، اسی طرح اس نماز میں بھی وہی شروط ہیں۔ اور اس کے پہلے دو خطبوں کا شروع ہونا ایک اضافی امر ہے۔ نیز اس نماز کی دوسری نمازوں سے مخالفت کی کوئی دلیل وارد نہیں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس نماز میں دوسری نمازوں سے اضافی شرط مثل، امام اعظم، مصر، جامع اور عدد مخصوص وغیرہ کو شرط ٹھہرانے کیلئے کوئی سند صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس کے مستحب ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کا واجب ہونا تو از خود ہے لیکن شرطیت ایک دوسری چیز ہے، بلکہ دو شخصوں کا ایسی جگہ جہاں ان کے سوا کوئی اور موجود نہ ہو جمعہ کا ادا کر لینا ان سے واجب کو ساقط کر دیتا ہے اور اگر ان میں سے ایک نے بھی خطبہ پڑھ لیا تو سنت پر عمل کیا اور اگر نہ پڑھا تو خطبہ ایک سنت ہی ہے یعنی واجب نہیں ہے، بلکہ اگر نماز جمعہ میں جماعت کے واجب ہونے کی دلیل وارد نہ ہوتی، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جمعہ کو بغیر جماعت ادا کرنا کبھی ثابت ہوتا تو ایک آدمی کا بھی جمعہ کو ادا کر لینا دوسری نمازوں کی طرح کافی ہو جاتا لیکن حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

اَلْجُمْعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فِی جَمَاعَةٍ[1]

---

[1] (ابوداؤد البانی حدیث ۱۰۶۷۔ نیل الاوطار ۳/۲۴۱)

''جمعہ کا با جماعت ادا کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔''

اور اس سے جماعت کا وجوب ثابت ہوتا ہے دوسرے مذاہب کے نزدیک جمعہ کی شرائط میں سے جو شرطیں عمدہ ہیں وہ ۱۔عدد مخصوص ۲۔مصر جامع ہیں اور اس مسئلہ میں وسیع احتلاف پایا جاتا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں باعتبار عدد معین کے پندرہ مذاہب ذکر کئے ہیں، اور کہا پندرھواں مذہب یہ ہے کہ بلا قید جماعت کثیر ہو۔اور امام سیوطی نے امام مالک سے اسی کو نقل کیا اور امید ہے کہ دلیل کی رو سے یہی آخری مذہب قوی ہو۔[1]

امام شوکانیؒ [2] نے کہا کہ: جس طرح تنہا ایک شخص کے لئے جمعہ کے صحیح ہونے کی کوئی سند نہیں اسی طرح اسی (۸۰) یا تیس (۳۰) یا بیس (۲۰) یا نو (۹) یا سات (۷) اشخاص کی شرط کی بھی کوئی سند نہیں۔اور جس نے کہا دو آدمیوں کے ساتھ جمعہ صحیح ہے اس کی دلیل حدیث اور اجماع سے عدد کا وجوب ہے اور کسی عدد مخصوص کی شرط کا دلیل سے ثابت نہ ہونا اور سب نمازوں میں دو کی جماعت کا صحیح ہونا نیز جمعہ اور بقیہ جماعتوں کا یکساں ہونا اور اس عدد یا اس عدد کے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جمعہ کے عدم انعقاد کا مروی نہ ہونا ہے، اور میرے نزدیک یہی قول راجح ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ شارع نے جماعت کا اطلاق دو اور دو سے زیادہ پر کیا ہے اور باقی تمام نمازیں باتفاق علماء دو سے منعقد ہو جاتی ہیں، اور جمعہ بھی ایک نماز ہے تو جب تک کوئی دلیل بقیہ نمازوں کے خلاف خاص کرنے والی نہ ہو، کسی حکم سے مختص نہ ہوگی۔ نیز جو عدد دوسری نمازوں میں معتبر ہے اس کو جمعہ میں معتبر نہ سمجھنے کی کوئی دلیل نہیں۔[3]

(مولانا) عبدالحق (جو کہ قدمائے اھل حدیث سے ہیں) کہتے ہیں کہ:

جمعہ کے عدد میں کوئی حدیث ثابت نہیں اور سیوطیؒ نے کہا: کسی حدیث سے عدد مخصوص کی تعیین ثابت نہیں، انتہی۔ اور جو احادیث عدد مخصوص کے اعتبار پر دلالت

---

[1] (نیل الاوطار ۳/۲۴۶) [2] نیل الاوطار ۳/۲۴۷ [3] فتح الباری ۸/۲۸۶/۳۸۹

کرتی ہیں وہ سب ضعیف ہیں اور حفاظِ حدیث نے جب ان میں کلام کی ہے تو وہ استدلال کے لائق نہ رہیں، اور ان سے حجت قائم نہ ہوئی، علی هذا القياس مصر جامع کے شرط نہ ہونے پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے کہا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں جمعہ ادا ہونے کے بعد پہلا جمعہ موضع جواثی ''میں (جو بحرین کے ملک میں ہے) عبدالقیس کی مسجد میں پڑھا گیا۔ (بخاری) اور جواثی ایک گاؤں کا نام ہے جو بحرین کی بستیوں میں سے ہے اور ظاہر یہ ہے کہ عبدالقیس نے اس جمعہ جواثی ایک گاؤں کا نام ہے جو بحرین کی بستیوں میں سے ہے اور ظاہر یہ ہے کہ عبدالقیس نے اس جمعہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بغیر قائم نہ کیا ہوگا۔ اور صحابہ کی عادت تھی کہ نزول وحی کے زمانہ میں کسی چیز کی مشروعیت کا ازخود اذن نہیں مانگتے تھے اور اسے اپنی طرف سے مشروع نہیں ٹھہرایا کرتے تھے، پس اگر یہ جمعہ جائز نہ ہوتا تو اس کے بارے میں قرآن کریم ضرور نازل ہوتا۔ چنانچہ حضرت جابر اور ابوسعید رضی اللہ عنہما نے عزل (یعنی انزال باہر کرنا تاکہ حمل نہ ٹھہرے) کے جواز پر اس سے استدلال کیا کہ انہوں نے زمانہ نزول وحی میں عزل کیا اور اس کی ممانعت نہ آئی اور حضرت علیؓ کی اس حدیث (جو کہ موقوف ہے):

لا جمعةَ وَلا تَشْرِيقَ اِلَّا فِي مِصْرٍ جَامِعٍ[1]

جمعہ اور عید کا مصر جامع کے سوا پڑھنا درست نہیں۔

کو امام احمد نے ضعیف قرار دیا اور کہا کہ اس کا مرفوع ہونا درست نہیں۔ اور ابن حزم نے اس کے موقوف ہونے پر جزم کیا ہے اور یہ موقوف، مرفوع حکمی بھی نہیں ہوسکتی، کیونکہ اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ سو اس سے حجت قائم نہ ہوگی۔

راجح مذہب اور اس کے دلائل:

ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ:

---

[1] نصب الرایہ ۲/۱۹۵ محلی ۵/۱۲۵، المغنی ۲/۳۳۱، نیل ۳/۲۲۸، ابن شیبہ ۲/۱۰۱، البیہقی ۳/۱۷۹ مصنف عبدالرزاق ۳/۱۶۷

حضرت امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے بحرین والوں کو لکھا کہ تم جس جگہ بھی ہو جمعہ ادا کیا کرو۔ ابن خزیمہ نے اس کو صحیح کہا، اور یہ بستیوں اور شہروں کو شامل ہے۔ اور بیہقی نے لیث بن سعدؒ سے روایت کیا ہے کہ: [1]

حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں اہل مصر اور مضافات کے رہنے والے ان کے حکم سے جمعہ ادا کیا کرتے تھے اور ان میں ایک جماعت صحابہ کی بھی موجود تھی۔ اور امام عبدالرزاق نے صحیح سند کے ساتھ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ:

وہ مکہ اور مدینہ کے مابین گاؤں والوں کو جمعہ پڑھتے دیکھتے تھے اور معیوب نہ جانتے تھے۔ اور صحابہ کے اختلاف کے وقت مرفوع کی جانب رجوع کرنا ہی لازمی ہے اور اس باب میں اور بھی روایات ہیں۔

سو جب بستیوں میں جمعہ پڑھنا ثابت ہو گیا تو امام اعظم [2] (یعنی بادشاہ) کی شرط بے اصل ہو گئی، کیونکہ بادشاہ بستیوں میں نہیں رہا کرتا اور علی ھذا القیاس مسجد بھی شرط نہیں۔ اور امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی قول ہے۔ اور بقیہ علماء بھی یہی فرماتے ہیں، کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور یہی قول قوی ہے۔

اور اہلِ تواریخ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میدان میں جمعہ پڑھنا مروی ہے۔ ابن سعد نے بھی اس کو روایت کیا۔ اور اگر اس کی صحت کو تسلیم کر لیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف مسجد میں جمعہ ادا کرنا مسجد کے شرط ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم

---

[1] ابن شیبہ ۲/۱۰۲ محلی ۲/۵۰ المغنی ۲/۳۳۱ معرفۃ السنن والاثار للشافعی ۴/۳۲۳ تلخیص الحبیر ۱/۵۴

[2] عن ابی حنیفہ، واللیث و زفر و محمد بن حسن اذا کان ثلاثۃ رجال والا مام رابعھم صلوا الجمعۃ ولا تکون باقل، محلی ۵/۴۶ ان سب سے روایت ہے کہ اگر تین مقتدی اور چوتھا امام ہو تو جمعہ پڑھنا چاہئے اس سے کم پر نہیں ہے۔ [جاوید]

ربا (سود) کی تخصیص چھ اشیاء میں

سوال:

کیا ربا صرف ان چھ چیزوں سے خاص ہے جن کی تصریح وارد ہے یا عام ہے، اور اگر عام ہے تو عموم کی کیا تاویل ہے؟

جواب:

اھل حدیث، اصحاب ظواہر کے ایک گروہ اور ظاہریہ کے نزدیک یہ انہیں چھ چیزوں کے ساتھ خاص ہے جن کی تصریح منقول ہے اور وہ عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہیں:

سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور اور نمک (مسلم) وہ کہتے ہیں کہ اخبار اور احادیث کی کتابوں میں صرف انہی چھ چیزوں کا ذکر موجود ہے سو ربا انہیں میں منحصر ہوگا، اور اسی کو سید علامہ محمد بن اسماعیل امیر یمانیؒ نے ترجیح دی ہے اور سبل السلام میں کہا کہ: ہم نے ایک مستقل رسالہ میں جس کا نام "قول مجتبی" رکھا ہے اس بارے میں علیحدہ کلام کیا ہے۔

اور جمہور ان چیزوں کے علاوہ دوسری اشیاء میں بھی ربا کو ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی علت میں جو شریک ہے وہ حکم میں بھی ان کے مثل ہے۔ لیکن مجھ کو چونکہ کوئی منصوص علت نہیں ملی اس کے استنباط میں بڑا اختلاف ہے کہ دیکھنے والے کو ظاہریہ کے مذہب کی تقویت کا باعث معلوم ہوتا ہے تو جس کسی کا فہم ظاہر حدیث کے موافق ہو اس پر بھی کوئی ملامت نہیں، کیونکہ علمائے متقدمین و متاخرین میں سے ایک جماعت ان کے ساتھ ہے، لیکن عبادۃ رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے ربا کے انہیں چھ چیزوں میں منحصر ہونا سمجھا جائے، ہاں! اگر سیاق عبارت کو افادۂ حصر پر دال سمجھا جائے تو ممکن ہے، اور یہ بھی بعید نہیں کہ شارع علیہ السلام کا انہیں

چھ چیزوں کے ذکر پر اکتفا کرنا اس خیال سے ہو کہ اس زمانہ میں عموم بلوی اور کثرت وجود بانہیں میں تھا۔ اور چونکہ ان اشیائے ستہ کے علاوہ کا ان کے ساتھ ملحق نہ ہونا بھی صحت کو نہیں پہنچا اس لئے ان کے غیر ان کے ساتھ ملحق کر لینا (تا کہ اس غیر کا حکم اتفاق جنس کی صورت میں کمی وبیشی، ادھار کی حرمت، اختلاف جنس اور اتفاق ملت کی صورت میں صرف ادھار کے حرام ہونے میں انہیں اشیاء کی طرح ہو) بھی بلاوجہ نہیں، علی الخصوص جبکہ محض قیاس نہ ہو بلکہ روایات بھی اس پر دلالت کریں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو چیز تولی جائے اور ایک نوع سے ہو برابر برابر لین دین کیا جائے اور جو پیمانہ سے ناپی جائے اس کا بھی یہی حکم ہے، اور جب مختلف دو جنسیں ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں (دارقطنی ۳/۱۹، بزار عن عبادۃ وانس رضی اللہ عنہما) لیکن اس کی سند ضعیف ہے، کیونکہ اس میں ربیع بن صبیح ہے، اور ایک (نقاد) جماعت نے اس کی تضعیف کی، اور ابوزرعہ نے اس کی توثیق کی اور حافظ نے تلخیص میں (اس کی جرح وتعدیل) سے سکوت اختیار کیا۔

اور اس کی مؤید صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت مزابنہ (درخت کے اوپر کے پھل کو کٹے ہوئے پھل سے بیچنا) کے منع ہونے سے متعلق، اور جو مسلم میں ہے درخت کے اوپر پھل کا اندازہ کرنے میں، جس سے انگور اور زبیب میں ربا کا ثبوت ملتا ہے اور یہ ان چھ چیزوں سے عام ہے۔ اور منجملہ الحاق کے دلائل سے، گوشت کا جانور کے بدلے منع ہونا ہے جبکہ[1] عرایا میں رخصت ہے اس لئے محققین علماء جیسا کہ صاحب مصفی وغیرہ نے اسی کی طرف میلان کیا۔ اور یہ اس میں شک نہیں کہ یہ دلائل

---

[1] عرایا جمع ہے عَرِیَّۃ کی (یعنی عاریہ) رخصت کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ:
ایک شخص نے کسی کو اپنے باغ میں سے کھجور کا ایک یا زیادہ درخت، ہبہ کر دیئے ان کی متوقع آمدنی پانچ وسق (ساڑھے سات سو کلو) خشک کھجور سے زائد نہیں ہے اب جسے درخت ہبہ کئے

اسباب میں قطعی نصوص نہیں خاص کر جبکہ سند ہی ضعیف ہے۔ انتہائی درجہ یہ ہے کہ یہ قیاس کی تائید کے قابل ہیں اور متقی وہ ہیں کہ مباح کو حرام میں واقع ہونے کے خوف سے ترک کردیں۔[1]

واللہ اعلم

(پچھلے صفحہ کا بقیہ)

گئے ہیں وہ ان سے تازہ کھجور حاصل کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً آتا ہے اس کے بار بار آنے سے ہبہ کرنے والے کے لئے یا جسے درخت ہبہ کئے گئے ہوں اسے باغ میں پہنچنے میں کسی قسم کی تنگی پیدا ہوتی ہے چنانچہ اور اس تنگی سے بچنے کی لئے اس آدمی کو اس بات پر آمادہ کر لیتا ہے کہ وہ ہبہ شدہ درختوں کی متوقع آمدن کا اندازہ لگا کر اس کے برابر اتری ہوئی خشک کھجور لے لے تو بیع جائز ہے (منھاج المسلم للشیخ ابی بکر الجزائری) [خلیق]

[1] مسلم المساقاۃ/۱۲۱۱ حدیث مصابیح السنۃ ۲/۱۷ شرح وقایہ مترجم ۳/۲۷

ھنڈوی کا حکم

سوال:

قرآن کریم اور حدیث شریف کی رو سے ہنڈوی کا کیا حکم ہے؟

جواب:

اس مسئلہ میں صریح نص تو موجود نہیں اسی لئے اس میں اجتہاد کی گنجائش موجود ہے چنانچہ دلیل کے نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد اور استنباط پر عمل کرنا لازم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ: جب فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس مسئلہ میں بنظر غائر جائزہ لیا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ انواع معاملات میں سے قرض کے تحت داخل ہے اور اس میں قرض خواہ کا نفع ہے کیونکہ اس سے مقصود کسی شخص کی معینہ رقم لے کر دوسرے شہر میں کسی خاص شخص کو پہنچا دینے سے رستے کے خوف سے امن ہی مطلوب ہے اور یہ نفع قرض پر حاصل ہوا جبکہ قرض پر نفع لینا ربا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث:

كُلِّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًا۔[1]

رواہ حارث بن اسامہ مرفوعا۔ یعنی جو قرض نفع کھینچ لائے وہ ربا ہے۔
اگرچہ یہ ضعیف ہے اور اس کے وہ شواہد بھی جو بیہقی کی کتاب المفرد اور بخاری کی تاریخ میں منقول ہیں وہ بھی ضعیف ہیں لیکن اہل علم کا اسے قبول کر لینے سے اس کو تقویت حاصل ہوگئی اور اہل علم نے بموجب اس حدیث کے ھنڈوی کی کراہت کا حکم لگایا ہے جس سے فقہاء کی اصطلاح میں سفتجہ (ھنڈی دینا) کہتے ہیں اور اس کی جمع سفاتج ہے۔ اسی طرح ھدایہ شرح وقایہ، مصفی اور انوار وغیرہ میں مذکور ہے۔ اور کراھت سے مراد کراہت تحریمی ہے، چنانچہ اطلاق کے وقت یہی سمجھا جاتا ہے اور یہ معاملہ اس ملک

---

[1] السنن الکبریٰ، بیہقی ۵/ ۳۵۰، کتاب المعرفۃ ۷/ ۱۶۹، فتح الباری ۴/ ۳۹۹، شرح مسلم ۱۱/ ۴۱

میں تین طرح سے مروج ہے:

۱۔ جس قدر مبلغ ہو اس کو اسی قدر بغیر کسی کمی وبیشی کے تحریر کیا جائے اس صورت میں کوئی ربا نہیں۔

۲۔ مبلغ کم وصول کریں لیکن ادائیگی زیادہ کریں۔

۳۔ زیادہ لے کر کم لکھیں اور دونوں صورتیں لینے اور دینے میں صریح ربا ہیں۔

اور اس سے بچنے کی یہ تدبیر ہے کہ اگر ہنڈوی سو 100 روپیہ کی کریں اور دس روپیہ ھنڈاون (بنانے کا خرچ) آتا ہے تو چاہئے کہ مہاجن (ساہوکار، سوداگر) کو سو روپیہ سے دو روپیہ کم دے اور روپیہ کے پیسے خرید کر بارہ روپیہ مہاجن کے ہاتھ بیچ دے اس صورت میں اختلاف جنس کے باعث یہ معاملہ بلاشبہ درست ہو جاتا ہے۔

اس پر صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ: آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو خیبر پر عامل مقرر فرمایا تو وہ شخص آپ کے پاس اچھی کھجوریں لایا، آپ نے فرمایا خیبر کی سب کھجوریں ایسی ہی ہیں؟ اس نے کہا نہیں حضرت' خدا کی قسم ہم تو ان کا ایک صاع، دوسری کھجوروں کے دو صاع دے کر لیا کرتے ہیں اور کبھی دو صاع، تین صاع دے کر لیتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح مت کرو یعنی ایک چیز کو اسی کے ہم جنس سے کمی وزیادتی سے خریدنا ربا ہے بلکہ ملی جلی کھجوروں کو ایک دفعہ داموں کے بدلے بیچ کر ان داموں سے اچھی کھجوریں خریدا کرو تاکہ ربا لازم نہ آئے اور موزونات (تولی جانے والی چیزوں) میں بھی اسی طرح فرمایا، یعنی تمر تو مکیلات میں سے ہے لیکن یہ حکم مکیلات ہی سے مخصوص نہیں بلکہ موزونات (جو ترازو سے وزن کی جاتی ہیں جیسے سونا چاندی وغیرہ) کا بھی یہی حکم ہے۔ اور اس شخص کا نام سواد بن غزیہ تھا۔ چنانچہ محلی نے دار قطنی سے نقل کیا اور خطیب نے مبھمات میں ذکر کیا جبکہ بعض نے کہا وہ مالک بن صعصعہ ہے۔[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ غیر جنس درمیان میں آنے سے کمی وبیشی حلال ہو جاتی

---

[۱] کذافی تلخیص الحبیر ۳/۸

ہے پس اگر مہاجن سو (۱۰۰) روپیہ کی ہنڈوی میں پانچ روپیہ واپس کر دے جس کو ہندی میں "پھرت" کہتے ہیں تو چاہئے کہ نوے (۹۰) روپے نقد دے اور دس کے بدلے پانچ روپے کی پیسے دے۔

شاہ رفیع الدین دھلوی ؒ نے کہا کہ علماء نے ہنڈوی کی کراہت دور کرنے کے لئے ایک تجویز لکھی ہے کہ:

پہلے ساھوکار کو ہنڈوی کی شرط کے بغیر قرض دے دے، اس کے بعد کہے کہ فلاں شہر میں فلاں آدمی کے پاس یہ قرض ادا کر دے اور ساھوکار یہ مضمون لکھ کر اسے دے دے اس لئے کہ ہنڈوی کی کراہت اسی وجہ سے ہے کہ اس قرض سے نفع لے لیا، یعنی رستے کے خوف سے امن حاصل ہو گیا، اور جس صورت میں صاحب قرض کی منفعت مشروط ہو تو ربا کا شبہ ہے، سو منفعت مشروع ہی نہیں تو ربا کا شبہ بھی نہ رہا، انتہی۔

(واللہ اعلم)

"نسخ السنة بالقرآن" کا مفہوم

سوال:

آپ نے جو کچھ منتقد میں لکھا ہے کہ ....."السُّنَّةُ لَاتُنْسَخُ بِالْقُرآنِ" اس معنی کی وضاحت کریں؟

جواب:

عبارت "تُنْسَخُ" ہونی چاہیے۔ شائد کاتب کے قلم سے سہو ہو گیا ہو کہ "لا تُنْسَخُ" لکھ دیا۔ اگرچہ شافعیؒ کا ایک قول "لَا تُنْسَخُ" بھی ہے، چنانچہ قاضی ابوالطیب طبری، شیخ ابو اسحاق شیرازی، سلیم رازی اور امام الحرمین نے بیان کیا ہے۔ لیکن جمہور کا قول ہے کہ سنت قرآن سے منسوخ ہو جاتی ہے۔ اور امام شافعی کا ایک قول یہ بھی ہے، چنانچہ مذکورہ جماعت نے ان سے نقل کیا ہے۔ اور سلیم نے کہا کہ اکثر فقہاء اور متکلمین کا یہی قول ہے، اور سمعانی نے کہا یہی حق کے قریب ہے اور صیرفی نے اس کا جزم کیا اور منع ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

قرآن سے سنت کا منسوخ ہونا:

بلکہ شرع میں متعدد مقامات پر قران سے سنت کا منسوخ ہونا وارد ہوا ہے، انہیں مقامات میں سے قول باری تعالیٰ ہے:

☆ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ......الآیۃ (البقرہ:۱۴۴) ہم آپ کا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

☆ علی ھذا القیاس، آنحضرت ﷺ نے قریش سے جو صلح کی تھی کہ ان کی عورتیں انہیں واپس کر دیں گے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے منسوخ ہو گیا: فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ۔ (الممحنه:۱۰) ان (عورتوں

کو) کفار کی طرف مت لوٹاؤ۔

☆ اور شراب کی حلت اس آیت: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ ...... الخ۔ سے منسوخ ہوئی۔ (المائدہ/۹۰)

☆ اور مباشرت کی حرمت اس آیت: فَالْاٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ ۝ (بقرہ :۱۸۷) یعنی پھر ان سے منسوخ ہوگئی۔

☆ اور عاشوراء کا روزہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ.......... یعنی جو تم میں یہ مہینہ پائے تو اس کے روزے رکھے .... سے منسوخ ہوا۔

اور اس کی بہت سی امثال ہیں، انتہی [1]

(واللہ المعین)

---

[1] اور یہ اصول کا مسئلہ ہے اس کی تفصیل اصول فقہ کی کتب سے دیکھنی چاہیے۔ تفصیل۔ ارشاد الفحول لامام الشوکانی۔ سنت کی بحث کا مطالعہ کریں۔ [جاوید]

بلا عذر فوت شدہ نماز کی عدم قضا

سوال:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاوی میں لکھا ہے کہ: جان بوجھ کر نماز قضا کرنے کے بعد قضا کرنے والے سے نماز قبول نہیں ہوتی اور نہ اس فعل حرام یعنی نماز فوت کرنے کا گناہ اس سے ساقط ہوتا ہے اگرچہ وہ قضا بھی کر لے، اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے، اس عبارت کا مطلب واضح فرمائیں؟

جواب:

جو نماز بلا عذر فوت ہو گئی ہو اس کے قضا کرنے میں علماء کا اختلاف ہے، جمہور کے نزدیک قضا واجب ہے، جبکہ امام داؤد ظاہری، امام ابن حزم اور بعض شافعیہ کا مذہب قضا نہ کرنا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ جو بلا عذر جان بوجھ کر قضا کر لے وہ اس نماز کے ترک کرنے میں گنہگار ہے، اور امام ابن تیمیہؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ظاہریہ کا مذہب تو واضح ہے، کیونکہ جمہور کے نزدیک قضا کے واجب ہونے پر کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔ امام شوکانی نے شرح مختصر میں کہا: مجھے جمہور کی کوئی دلیل قرآن و حدیث سے نہیں ملی مگر خثعمیہ کی وہ حدیث جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَدَيْنُ اللهِ احقُّ اَنْ يُقْضٰى۔ (فتح الباری ۴/۱۹۲، مسلم ۱/۳۶۲) (اللہ کا قرض زیادہ لائق ہے کہ اسے پورا کیا جائے) اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور اس میں عموم ہے جو مصدر مضاف سے مستنبط ہے اور وہ عموم اسباب کو بھی شامل ہے، انتہی۔

غرض کے جمہور کے پاس اس حدیث کے سوا کوئی اور دلیل نہیں اور اہل اصول میں اختلاف ہے کہ وجوب قضا کیلئے وہی دلیل کافی ہے جس سے مقتضی کا وجوب نکلتا ہے یا نئی دلیل کی ضرورت ہے جس سے قضا کا وجوب ثابت ہو۔ اور حق تو یہ ہے کہ نئی دلیل ہونی چاہئے کیونکہ قضا کا وجوب تکلیفِ ادا کے علاوہ مستقل تکلیف ہے۔ فتامل...... واللہ اعلم

امام غزالی کا انتہائے عمر میں فلسفہ چھوڑ کر قرآن وحدیث سے لگاؤ رکھنا

سوال:

ابو الولید باجی مکی نے کہا، اوّلاً جس نے اس دواء اعظم (یعنی دین اسلام) کو بگاڑا وہ خوارج ہیں، آخر میں کہا: پھر ابو حامد آیا تو پانی بستیوں پر چڑھ آیا، تو یہ ابو حامد کی مذمت ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے بھی بعض جگہ اس کا ذکر بطور طعن کے کیا ہے یا عدم مذمت ہے؟ اور ابو حامد کی تصانیف میں کس طرح کی غلطیاں دیکھ کر اس طرح کہا، واضح فرمادیں؟

جواب:

امام غزالی کے متعلق ابن تیمیہ اور ابن عربی کی آراء:

ابو حامد، امام حجۃ الاسلام محمد بن محمد بن غزالی طوسی کی کنیت ہے جن کی وفات ۵۰۵ ھجری میں ہوئی ہے، یہ اپنے زمانہ کے فلاسفہ اور متکلمین کے سردار اور رئیس ہوئے ہیں، ان کی تصنیفات خصوصا جو پہلے پہل لکھی ہوئی ہیں فلاسفہ اور اھل کلام کے دلائل سے بھرپور ہیں، اور ان میں انہیں کی راہ پر چلے ہیں۔ اسی سبب سے علمائے سنت اور اھل حدیث عقل کو نقل پر مقدم کرنے والوں اور ان کے ایسے کلام پر جو ظاہری سمعی دلائل اور شرعی حجتوں کے مخالف واقع ہو، طعن اور قدح کرتے تھے جیسا کہ خفاجی نے نسیم الریاض شرح شفائے قاضی عیاض غزالی کے ترجمہ میں نقل کیا کہ ابن تیمیہؒ نے کہا کہ: غزالی کا حدیث میں سرمایہ ناقص ہے اس لئے وہ اپنی کتابوں میں اکثر موضوعات لے

آئے اور اس قسم کی باتیں اپنی تصانیف میں بہت کیں حتیٰ کہ ان کے شاگرد ابوبکر بن عربی نے ان کی کمال تعظیم کے باوجود کہا کہ: ہمارے استاد ابوحامد: رحمہ اللہ: فلاسفہ کے اندر داخل ہوئے پھر نکلنا چاہا لیکن نکل نہ سکے۔

میں کہتا ہوں:

ان کی کتاب تہافت الفلاسفہ اور احیاء علوم الدین اس کے برخلاف پکارتی ہیں، انتہیٰ۔ لیکن ابوالفرج ابن الجوزی نے خفاجی کا تعاقب کیا اور کہا میں نے ان کی کتاب کی اغلاط جمع کیں اور اس کا نام "اعلام الاحیاء باغلاط الاحیاء" رکھا اور ان کی بعض اغلاط کی جانب کتاب "تلبیس ابلیس" میں اشارہ کیا، انتہیٰ۔ اور ابوالمظفر سبط ابن جوزی نے کہا: احیاء کی بنا صوفیاء کے مذہب پر رکھی اور فقہ کا قانون ترک کیا، تو علماء نے اس کی ان احادیث پر جو صحیح نہیں انکار کیا، لیکن بعض متاخرین نے بحکم "خُذْ[1] مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ" ان کی تصانیف، خصوصاً احیاء کی تنقیح کی ہے اور اس کے موضوع کو صحیح، حسن اور ضعیف سے علیحدہ کیا عراقی نے احیاء کی دو طرح کی تخریج کی ایک کبیر اور دوسری صغیر لکھی ہیں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے عراقی کی تخریج سے جو چھوٹ گیا اس کا تدارک کیا اور اس پر ایک تخریج مسمی "تحفة الاحياء" تصنیف شیخ زید الدین قاسم بن قطلو بغا حنفی مصری کی ہے جن کی وفات ۸۷۹ھ میں ہوئیں۔

احیاء میں چار فاسد مواد:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ جو فرمایا کہ غزالی کی کلام میں، ابن سینا کے شفاء وغیرہ میں رسائل اخوان الصفا اور ابوحیان توحیدی کے کلام کے سبب مادہ فلسفیہ ہے لیکن مادۂ معتزلیہ اس کے کلام میں قلیل ہے یا معدوم ہے اور احیاء میں اس کی کلام اکثر درست ہے، لیکن اس میں چار مادے فاسد ہیں۔ ایک: مادۂ فلسفی۔ دوسرا: مادۂ کلامی۔ تیسرا: مادۂ صوفیاء کا ترہات (وشطحیات) چوتھا مادہ: احادیث موضوعہ[2] انتہیٰ۔ سو شک

---

[1] یعنی اچھا اچھا لے لو، برا چھوڑ دو۔ (خلیق)　[2] علامہ عبدالحیٔ لکھنوی کہتے ہیں کہ

الا ترى الى نقل صاحب احياء علوم الدين مع جلاله قدرة او رد في كتابه احاديث

نہیں کہ یہ مادے اس میں موجود ہیں لیکن جس طرح علماء نے تخاریج لکھ کر اس کی احادیث کی اصلاح کی ہے اس طرح ایک جماعت نے اختصار احیاء کی طرف توجہ کر کے اس سے فاسد مادے نکال دیئے ہیں۔

امام غزالی کے حق میں بعض مفکرین کی آراء:

اور بعض لوگوں نے ان کے حق میں عمدہ خوابیں دیکھی ہیں اور اھل طبقات جو

لا اصل لها فلم يعتبر بها كما يظهر من مطالعة تخريج احاديث للحافظ العراقي وهذا صاحب الهدايه مع كو نه من اجلة الحنيفة اود فيها اخياء غير بة و ضعيفة فلم يعتمد عليها كما يظهر من مطالعة تسخير بجبے احاديثها للزعلهي وابن حجر. ور الاخوار ۵۸ في مجموعة ارسائل الحسن

کیا تم احیاء العلوم الدین کے مصنف (امام غزالی) کو نہیں دیکھتے یہ جلیل القدر ہونے کے باوجود اپنی کتاب میں ایسی روایات لانے میں جن کی کوئی اصل نہیں پس ان پر اعتماد نہیں کیا جا گا جیسے کہ حافظ عراقی کی تخریج احادیث کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

علامہ تاج الدین سبکی نے احیاء العلوم کی ان احادیث کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جو بے اصل ہیں اور ان کی تعداد تقریباً ۹۴۳ طبقات الشافیہ ۱۴۵۔۱۸۱ ج ۴، علامہ طرطوشی فرماتے ہیں کہ سطح زمین پر جس قدر کتب ہیں ان میں سب سے زیادہ موضوع روایات احیاء العلوم میں پائی جاتی ہیں۔ سیر اعلام النبلاء امام ذہبی ۱۹/۳۳۴، ۳۳۹، ۳۴۲، ۴۹۵۔

۱۔ امام ابن جوزی احیاء العلوم پر کچھ یوں تبصرہ فرماتے ہیں کہ بعض صوفی بوجہ کم علمی کے جو موضوع احادیث ان کو ملتی ہیں انہیں پر عمل کرتے ہیں اور کچھ خیال نہیں رکھتے۔

۲۔ حدود تصوف میں اشیاء قبیح کا ذکر کیا اور اس بات سے ذرا شرم نہ آئی۔ ۲۲۹۔ ۲۲۸

۳۔ محمد بن طاہر مقدسی نے صفوۃ التصوف لکھی اس میں ایسی چیزیں بیان کی جن کے ذکر کرنے سے اہل عقل کو حیاء آتی ہے۔ ۲۳۰

ابو حامد غزالی نے اگر قوم صوفیہ کے طریقہ پر کتاب احیاء العلوم تصنیف کی اور اس کو باطل احادیث سے بھر دیا جن کا بطلان وہ خود نہیں جانتے اور علم مکاشفہ میں گفتگو کی اور قانون فقہ سے باہر ہو گئے اس میں لکھا ہے کہ وہ ستارہ، سورج اور چاند جن کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا ان سے مراد انوار ہیں۔

جو اللہ تعالیٰ عزوجل کے حجاب میں ہیں مشہور چاند، سورج، ستارے مراد نہیں، غزالی کا یہ کلام باطنیہ کے کلام کی قسم سے ہے۔ اور اپنی کتاب المسح بالاحوال میں لکھتے ہیں صوفیہ حالت بیداری میں ملائکہ اور ارواح انبیاء کا مشاہدہ کرنے میں اور ان کی آوازیں سنتے ہیں اور فوائد اخذ کرتے ہیں۔ (تلبیس ابلیس ۲۳۰ نور محمد کراچی)

[جاوید]

لوگوں کے احوال ضبط کرتے ہیں انہوں نے غزالیؒ کی رفعت میں بڑی طویل کلام کی ہے۔ اسنوی نے مہمات میں کہا: وہ وجود کا قطب ہے اور ایسی برکت ہے جو ہر موجود کو شامل ہے اور خلاصۂ اہل ایمان کی روح ہے اور اللہ مہربان کی خوشنودی کی طرف پہنچنے کا راستہ ہے، اس زمانہ میں علماء زمان سے یکتا تھے اس لئے ان کے ساتھ کسی دوسرے انسان کا ترجمہ ذکر نہیں کیا جاتا، انتہی۔ ان کا لقب حجۃ الاسلام ہے اور کتاب ''اتحاف السادۃ المتقین بشرح اسرار احیاء علوم الدین'' میں تاریخ سمعانی سے نقل کر کے کہا کہ: انجام کار طلب حدیث مجالست اہل حدیث اور حدیث کے پڑھنے و لکھنے کی جانب انکی بہت توجہ تھی۔ اور ابو الفتیان عمرو بن ابی الحسن رواسیہ کو طوس میں بلایا اور ان دنوں کو غنیمت سمجھ کر ان سے صحیحین کا سماع کیا، انتہی۔

اور علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں کہا: مات و البخاری علی صدرہ[1] یعنی امام غزالی کی وفات کے وقت بخاری ان کے سینے پر تھی انتہی۔

حاصل کلام:

یہ سب احوال بآواز بلند ان کے حسن خاتمہ کی منادی کر رہے ہیں وَاِنَّمَا الْعِبرَۃُ بِالْخَواتِیمِ یعنی اعتبار خاتمہ کا ہے۔ اور ان کے بارے میں طعن کرنے والے جن کا منصب خالص شریعت اور سنت مطہرہ کی حفاظت اور اصلین (کتاب وسنت) کی ہر مخالف تاویل وہ جہاں ہو جیسے ہو، کو باطل کرنا ہے اس طعن میں معذور ہیں، کما قیل۔

مذہب عشق ازہمہ ملت جداست
عاشقاں را مذہب و ملت خداست[2]

ولکل وجهة هوموليها۔ واللہ اعلم

---

[1] تاج المکلل ص ۳۹۵، اخری ایام میں علوم فلسفہ و کلام سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور علم حدیث کے ہو کر رہ گئے تھے چنانچہ جب فوت ہوئے تو صحیح بخاری ان کے زیر مطالعہ تھی۔ ابن شمیہ بطل الاصلاح الدینی ص۲۵۲ محمود مھدی الاستنبولی۔

[2] ترجمہ عشق کا مذہب ہر قوم کے لئے جدا ہے عاشقوں کا مذہب اور قوم خدا ہے۔ (خلیق)

جادو سیکھنے کا حکم

سوال:

سحر[1] کے اقسام میں سے کس قسم کا سیکھنا یا اس پر عمل کرنا جائز ہے؟ اور شیخ الاسلام (امام ابن تیمیہؒ) ابن عربی اور منصور کی تکفیر کرتے ہیں اور لکھا ہے کہ: منصور جادوگر تھا نیز جادو میں ایک کتاب لکھی جو عجائبات اس سے نقل کرتے ہیں وہ اس کے جادو کے آثار سے تھے یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:

صحیح احادیث جادوگر، جادوگر کی مذمت اور جادوگر کی سزا میں عموماً و مطلقاً وارد ہوئی ہیں، جن مین کسی قسم کی کوئی قید نہیں اور ان احادیث کا مضمون یہ ہے کہ: سب جادوؤں کا حکم اس کی اقسام کے مختلف ہونے کے باوجود ایک ہی ہے لیکن علماء کے نزدیک اس مسئلہ میں کئی طرح سے تفصیل ہے، اس مقام پر مدلل، مضبوط اور مختصر کلام امام نوویؒ کا قول ہے جو کہ شرح صحیح مسلم میں ہے کہ:

جادو کرنا حرام ہے اور وہ بالاتفاق کبیرہ گناہوں سے ہے اور کبھی کفر ہوتا ہے اور کبھی کفر نہیں ہوتا بلکہ کبیرہ گناہ ہوتا ہے۔ پس اگر اس میں کوئی ایسا قول و فعل ہو جو کفر کا تقاضا کرے تو وہ کفر ہوگا ورنہ کفر نہ ہوگا لیکن اس کا سیکھنا سکھانا حرام ہے، انتھی۔
اور ایسا ہی ابو منصور ماتریدی نے کہا چنانچہ ان سے ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں ایسا ہی نقل کیا ہے[2]

اور حضرت ابو موسیٰؓ کی حدیث میں ہے جسے امام احمد نے روایت کیا کہ رسول

---

[1] سحر کا معنیٰ: جس کا ماخذ لطیف اور دقیق ہو یعنی ایسا دھوکہ جس میں پتہ نہ چلے کہ دھوکہ کس طرح دیا گیا ہے۔ تاج العروس ۳/ ۳۵۷ ولغات الحدیث ۳/ ۵۶ [2] احمد ۴/ ۳۹۹ نیل ۷/ ۱۹۰ فقہ اکبر ۱۸۰

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیشہ شراب پینے والا، قطع رحمی کرنے والا، اور جادو کی تصدیق کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (مسند احمد ۴/۳۹۹، حاکم ۴/۱۴۶، ابن حبان ۱۲/۱۶۵) اور امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ اور جب یہ وعید جادو کے ماننے والے کے حق میں وارد ہوئی تو جادو کرنے کا کیا حال ہوگا اور جادو کی متعدد اقسام پر دلالت کرنے والی یہ آیات ہیں:

☆ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ۝ (الفلق: ۴)

اور گرہ (لگا کران) سب پھونکنے والیوں کے شر سے (بھی رب کی پناہ میں آتا ہوں)۔

☆ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعٰى۝ (طٰہٰ: ٦٦)

موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ خیال گزرنے لگا کہ وہ (رسیاں اور لاٹھیاں) ان کے جادو کے زور سے دوڑ بھاگ رہی ہیں۔

جادوگر کی سزا:

اور جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ جادوگر کا قتل کرنا واجب ہے اور اسی طرح صریح روایت میں امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ گئے ہیں اور اس پر احادیث دلالت کرتی ہیں، اور صحابہ کرام جیسے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، اور ابن عمرؓ سے منقول ہے۔ اور اس سے توبہ کروانے اور کافر کہنے میں اختلاف ہے۔ ابن عربی اور منصور کے بارے میں علماء کا قدیم سے اختلاف مشہور ہے، ایک جماعت نے ان کے مخالف شریعت اقوال و احوال دیکھ کر کافر کہنے پر جرأت کی ہے۔ اور ایک قوم نے ان کی بلند شان، رفعت مکان، علوم و کمالات ظاہر و باطن کی وجہ سے ان کے احوال و اقوال کی تاویل کی ہے اور سکر اور مستی کی حالت میں محمول کر کے توقف کیا ہے، اور ایک جماعت نے ان کلمات کا ان کی طرف سے انکار کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ان کے مخالفین اور دشمنوں نے ان کی کتابوں میں ان کلمات کو درج کیا ہے اور اس پر جزم کا اظہار کیا ہے اور ہم نے صدیوں بعد پیدا ہونے والوں کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال

پانے کے بعد بجز سکوت اختیار کرنے کے کوئی چارہ نہیں اور ان آیات:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ..... الآیۃ (البقرہ ۱۳۴)

یہ امت ہے جو گزر چکی، جو انہوں نے کیا ان کے لئے ہی اور جو تم نے کیا تمہارے لئے.........

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ ○ (الحشر: ۱۰)

اور جو ان کے بعد آئیں جو کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔

اور اس حدیث: لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ ۔ (جو مر چکے ہیں ان کو برا مت کہو) کے مضمون پر عمل کرنے کے بغیر کوئی حیلہ نہیں ۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ ان کی باتوں اور حالات سے جو قرآن وحدیث کے موافق ہو اس کو قبول کریں اور جو ایسا نہ ہو اس کو چھوڑ دیں کیونکہ اکثر کے اقوال سے بعض قول، قبول اور بعض ترک کے لائق ہوتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ ان کے سب فرمان قبول کرنے واجب ہیں اور اس پر علماء متقدمین اور متاخرین کا اتفاق ہے اور یہی حق ہے۔

(وباللہ التوفیق)

علم نجوم سیکھنے کا شرعی حکم

سوال:

علم نجوم سیکھنے کا کیا حکم ہے اس کی مذمت میں احادیث کی صحت کیسی ہے؟ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ، امام فخر الدین رازی کیلئے کفر کی نسبت کرتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے نجوم کی پرستش میں ایک کتاب لکھی ہے اور ابن قتیبہ کی کتاب مختلف الحدیث سے اس کی تکفیر نقل کی ہے۔

جواب:

اس علم کا سیکھنا اور اس پر عمل کرنا حرام ہے جیسے جادو کا سیکھنا اور اس پر عمل کرنا دونوں برابر ہیں۔ نیل الاوطار میں ہے کہ جس طرح جادو کا سیکھنا اور اس پر عمل کرنا حرام ہے اسی طرح علم نجوم کا سیکھنا اور اس میں کلام کرنا حرام ہے۔ ابن رسلان نے شرح سنن میں کہا ہے کہ: علم جس کا اہل نجوم دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حوادث و واقعات جو ابھی تک رونما نہیں ہوئے اور آئندہ زمانہ میں واقع ہوں گے، وہ منع ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ ستاروں کا اپنے راستوں پر چلنے اور ان کا علیحدہ ہونے سے اس معرفت کو پا لیتے ہیں، اور یہ اس علم کی تحصیل ہے جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے علم کے لئے اختیار کیا ہے۔ لیکن ستاروں کا اتنا علم جس سے زوال اور قبلہ کی جہت نیز کتنا وقت گزر گیا اور کتنا باقی ہے یہ اس میں داخل نہیں جس سے نہی وارد ہوئی ہے، البتہ بارش کا نزول، برف باری، ہوا چلنا اور پھلوں کے تغیر وتبدل کی خبر کرنا منع ہے، انتہی۔

لیکن حق یہ ہے کہ اس علم کا نماز کے اوقات کی معرفت برسوں اور مہینوں کے حساب کے لئے سیکھنا بھی بدعت ہے۔ صاحب سبل السلام نے کہا: دنوں، مہینوں

اور برسوں سے چاند کی منزلوں کے حساب سے اوقات مقرر کرنا بدعت ہے اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، انتہی۔

ستاروں کی پیدائش کا مقصد:

قرآن کریم اور صحیح بخاری سے معلوم ہوتا ہے کہ ستارے صرف تین چیزوں کے لئے ہیں:

۱۔ آسمان دنیا کی زینت کے لئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ......الآية(ملک: ۵)

بے شک ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کیا

۲۔ ان شیاطین کے مارنے کے لئے جو مستقبل کے واقعات سننے کے لئے آسمان کے قریب جاتے ہیں چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَجَعَلْنٰهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ......الآية(ملک: ۵)

اور انہیں شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنایا

۳۔ خشکی اور دریا میں راستہ پانے کے لئے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَعَلَامَاتٍ وَّبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ......الآية (نحل: ۱۶)

اور بہت سی نشانیاں مقرر فرمائیں اور ستاروں سے بھی لوگ راہ حاصل کرتے ہیں۔

اور جو ان فوائد کے سوا اور فوائد تلاش کرے وہ حلاوتِ ایمان سے محروم ہے۔

حضرت قتادہؒ نے کہا! جس نے ستاروں میں ان کے سوا اور فائدے سوچے تو اس نے اپنے حصے کو بھلا دیا اور اپنا نصیب برباد کیا اور اس چیز کے پیچھے پڑا جو اس کو درکار نہیں اور جس کا اس کو علم نہیں اور جس کو جاننے سے پیغمبر اور فرشتے عاجز ہیں۔

حضرت ربیعؒ سے بھی اسی کی مثل مروی ہے، اتنا اضافہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کی موت

و پیدائش اور کسی کی روزگاری کو ستاروں سے منسلک نہیں کیا، خدا پر بہتان باندھتے ہیں اور بہانہ ستاروں کا بنا لیتے ہیں ۔اخرجہ رزین ۔

علم نجوم سیکھنے والے کا حکم:

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے علم نجوم کا کوئی ایسا باب حاصل کیا جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ذکر نہیں فرمایا تو اس نے جادو کی ایک شاخ حاصل کی ۔نجومی کاہن ہے اور کاہن جادوگر ہے اور جادوگر کافر ہے ۔اخرجہ رزین ۔(مشکوۃ البانی ۱۲۹۶/۲ طبع کراچی ۳۹۴)

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ نجومی کافر ہے ۔اور ایک روایت میں ہے جس نے ستاروں کا کوئی علم سیکھا اس نے جادو کی ایک شاخ حاصل کر لی جس قدر زیادہ لے گا اسی قدر زیادہ ہوگا ۔(احمد ابوداؤد ۔ابن ماجہ ۔وسکت عنہ المنذری) وابو داؤدَ وَرِجَالُ اِسْنَادِہٖ ثِقَاتٌ ۔اور معنی یہ ہے کہ علم نجوم سے جس قدر زیادہ حاصل کرے گا اسی طرح ہے جیسا کہ جادو سے زیادہ حاصل کیا ۔

نیل الاوطار میں ہے: اور یہ بات تو معلوم ہے کہ جادو حرام ہے اور اس سے زیادہ کا حصول حرمت میں مزید شدت ہے سو اسی طرح علم نجوم سے زیادہ سیکھنا ہے ۔
(ابوداؤد ۲۲۶/۴، ابن ماجہ ۳۰۵/۲ البانی احمد ۳۱۱/۱ نیل ۱۹۲/۷)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کوئی گرہ دی پھر اس میں پھونکا تو اس نے جادو کیا اور جس نے جادو کیا اس نے شرک کیا اور جس نے کسی شئے سے تمسک کیا اسی کی طرف سونپا گیا ۔(اخرجہ نسائی، سلفیہ ۱۶۴/۲)

اور صفیہ بنت ابی عبید، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواج مطہرات سے روایت کرتی ہیں کہ جو نجومی کے پاس گیا اور اس سے کچھ پوچھا اور اس کے کہنے کو سچ جانا تو اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہیں ہوتی ۔(مسلم ۱۷۵۱/۴، مصابیح السنۃ ۲۵۵/۳ ،نیل ۱۹۰/۷) اور عراف کی تفسیر نجومی سے کرتے ہیں اور یہ سب احادیث

صحاح میں موجود ہیں اور رازی فقیہ متکلم، اصولی، شافعی المذہب ہے اور اس کے احاطہ بالعلوم سے یہ ثابت صحاح میں موجود ہیں۔

اور رازی فقیہ، متکلم اصولی، شافعی المذہب ہے اور اس کے احاطہ بالعلوم سے یہ بات دور نہیں کہ اس نے علم نجوم میں کوئی کتاب تصنیف کی ہو لیکن یہ بات کہ اس نے کتاب میں ستاروں کی پرستش کی طرف دعوت دی ہو، نہایت بعید معلوم ہوتی ہے، یہ بات تو یقینی ہے کہ اس کا مصنف رد و قدح کا محل ہے اور اکابر محدثین نے علم کلام اور فلسفہ میں اس کے خوض کو ناپسند کیا ہے۔ شیخ عبدالحق دھلوی رسالہ ''مرج البحرین'' میں رقمطراز ہیں کہ: بعض ارباب کشف نے جو کہ آنحضرت کی معنوی صحبت سے مشرف ہوئے فخر رازی کی حقیقت سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا ''ذلکَ رجل مُعَاتَبَ'' یعنی وہ ایسا شخص ہے جو معتوب ہے۔ اور ابن سینا کے بارے میں فرمایا: ''رجل أضله الله علی علم ''یعنی وہ ایسا شخص ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے علم کے باوجود گمراہ کر دیا۔ اور شہاب الدین مقتول کے بارے میں فرمایا'' ھو من متبعیه ''یعنی وہ ابن سینا کے تابعداروں میں سے ہے۔ اور کہتے ہیں کہ وصل المقصود اور وصل الی المقصود میں فرق ہے، پہلے جملے کا استعمال وہاں کرتے ہیں جہاں انسان مقصود کو پہنچ جائے، اور دوسرا وہاں جہاں مقصود کے قریب پہنچ جائے۔

غرضیکہ اہل اسلام اور ارباب علم کلام کا فلسفیات میں خوض کرنا گو اہل زیغ کے رد و ابطال اور اہل حق کے فائدہ کی خاطر ہوا لیکن اس کے ضمن میں ان کو بھی بڑا نقصان ہوا جو کہ عقائد کے تذبذب، دین کے قواعد کی سستی اور شک تردد کے دروازہ کھلنے کا سبب بنا۔ ایسا شخص تو کم ہی ہوگا جو علم کلام میں خوض و غلو کے بعد حیرت کے بھنور سے نکلا ہو اور یقین کی پونجی نہ کھو بیٹھا ہو ہاں! جسے اللہ تعالیٰ بچا لے تاہم ایسا بہت کم ہوا ہے۔

فانالله وانا اليه راجعون، انتهى كلامه،

واللّٰہ اعلم

بھائی کو قتل کر کے اسکی بیوی سے نکاح کرنا

سوال نمبر:

کسی شخص نے اپنے بھائی کی بیوی سے محبت پیدا کی پھر بھائی کو اس نیت سے مار ڈالا کہ اس کی عورت سے نکاح کر لے کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟

جواب:

اغاثۃ اللھفان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت قاتل کے لئے حلال نہیں اور قاتل کے علاوہ حلال ہے اور اسی کو قیاس کے مطابق کہا۔ (اغاثۃ ۱/۳۷۴)

نیز فقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح مذکور صحیح ہے، گو قاتل گنہگار اور مرتکب کبیرہ ہوا اور یہ جزئیہ بعینہ صحیح احادیث سے نظر سے نہیں گزرا۔

واللہ اعلم

بیع وفا رہن ہے بیع نہیں

سوال:

بیع وفا[1] کا عقد جائز ہے یا نہیں؟

جواب:

اس مسئلہ میں اختلاف ہے درمختار اور عزر وغیرہ میں اس کی صورت اس طرح مذکور ہے کہ کسی چیز کو کسی شخص کے ہاتھ مثلاً ایک ہزار درہم کے بیچ دیا اس شرط پر کہ جب وہ اس چیز کو واپس کر دے گا بائع اس کی رقم واپس کر دے گا۔ شافعیہ اس کو ''رہن معاد'' کہتے ہیں۔ مصر میں ''بیع امانت'' اور شام میں ''بیع اطاعت'' کہتے ہیں اور یہ بیع بعض کے نزدیک رہن ہے، اور اس صورت میں اس کے زوائد اور منافع بحکم حدیث ''لَهٗ غُنْمُهٗ وَعَلَيْهِ غُرْمُهٗ'' یعنی اس کے لئے اس کا منافع اور اسکے ذمہ اس کا نقصان ہوگا۔

اور جواہر الفتاویٰ میں ہے یہ قول صحیح ہے۔ اور فتاوی خیر الدین رملی میں ہے کہ: وَعَلَيْهِ الاكثر یعنی اکثر علماء کا یہی قول ہے اور بعض کے نزدیک یہ بیع ہے رہن نہیں۔ اور مشائخ متقدمین و متاخرین کی ایک جماعت نے لوگوں کا اس ضرورت کی خاطر اور ربا سے محفوظ رہنے کے لئے اس قول کو اختیار کیا ہے لیکن اگر اسی عقد میں شرط استرداد لگائی جائے تو بیع فاسد ہو جائے گی کیونکہ حدیث میں ہے ''نَهٰى عَنْ بَيْعٍ وَشَرْطٍ'' یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد بیع میں شرط لگائے جانے سے منع فرمایا ہے۔ اور شاہ عبدالعزیزؒ نے[2] لکھا ہے کہ اگرچہ بعض فتاویٰ میں اسے جائز رکھا ہے، لیکن ہمارے نزدیک عدم جواز راجح ہے۔ اور حقیقت میں یہ عقد، عقد رہن ہے کہ جو اس شرط فاسد کے سبب فاسد ہوگئی ہے جو عقدِ بیع کے مخالف ہے۔

واللہ اعلم

---

[1] یعنی بائع جب قیمت ادا کر دے مشتری وہ چیز واپس کر دے گا۔ [2] فتاویٰ عزیزیہ ۱/۵۶۰ اردو میں

وصیت میں ورثاء کو نقصان پہنچانا

سوال:

وصیت میں ضرر پہنچانے کا کیا حکم ہے؟

جواب:

جس وصیت میں وارثوں کا ضرر، حیلہ یا شرط وصیت یا شرط وقف سے ہو وہ خاص و عام دلائل شرعیہ کی رو سے باطل ہے۔ عام دلیل: جس طرح حضرت عبادہؓ کی حدیث میں ہے۔

لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ فِي الْإِسْلَامِ[1]

اسلام میں نقصان اٹھانا اور نقصان پہنچانا درست نہیں۔

امام شوکانی کی مختصر میں ہے: جس نے ایسی چیز وقف کی جس میں ورثاء کا نقصان ہو تو وہ وقف باطل ہے، اور اس (مختصر) کی کتاب الوصیت میں ہے کہ: ضرر والی وصیت درست نہیں۔

اور حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کوئی مرد و عورت ساٹھ برس تک اللہ کی بندگی کا عمل کرتے رہتے ہیں پھر ان کی موت کا وقت آ جاتا ہے اور وصیت میں ضرر پہنچاتے ہیں تو اس کے لئے آگ واجب ہو جاتی ہے۔[2] نے اس کا معنی روایت کیا ہے، اور ان دونوں نے ساٹھ کی جگہ ستر کہا، اور ترمذی نے اس کو حسن کہا۔ اس کی سند میں شہر بن حوشب ہے اور اس میں کلام ہے امام احمد اور یحییٰ بن معین نے اس کی توثیق کی۔ سعید بن منصور نے بسند صحیح ابن عباس سے موقوفاً روایت کیا ہے جس کے راوی ثقہ ہیں۔ اور زواجر میں ہے، فرمان

---

[1] (نصب الرایہ ۳۸۶/۴۔ ارواء الغلیل ۴۴۱/۳، بیہقی ۱۵۷/۶)

[2] ابوداؤد، ترمذی، احمد شاکر ۴۴۳۱/۴ اور ابن ماجہ ۹۰۲/۲

باری تعالیٰ ہے "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ۔ (نساء:۱۱) یعنی وصیت کے بعد جو ہو چکی ہے یا قرض کے۔ یہ میراث کے باب میں ہے جیسا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اور بہتر یہ ہے کہ اپنے عموم پر رہے۔

وصیت میں ضرر کی شکلیں:

اور ابن عادل کی تفسیر میں ہے کہ، وصیت میں ضرر پہنچانا کئی طرح سے ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ: ثلث سے زیادہ کی وصیت کر کے فوت ہو جائے۔ بالکل مال یا بعض مال کا کسی اجنبی کے لئے اقرار کر جائے یا ورثا کو میراث سے محروم کرنے کے لئے کسی بے بنیاد قرضہ کا اپنے ذمہ اقرار کر کے یا جو قرض کسی سے لینا تھا اس کا اقرار کر لے کہ میں لے چکا ہوں یا کوئی چیز سستی بیچے یا مہنگی خرید لے۔ یہ سب کچھ اس غرض سے کرے کہ وارثوں کو مال نہ پہنچے یا ثلث مال کی وصیت ثواب کی غرض سے نہیں بلکہ ورثہ کم کرنے کی نیت سے۔ یہ تمام باتیں وصیت میں نقصان پہنچانے کی صورتیں ہیں، انتہی۔

میں کہتا ہوں کہ:

آیت کریمہ اپنے ماسوا سے مستغنی کرتی ہے کیونکہ اس میں عدم اضرار کے ساتھ جائز وصیت کی قید ہے اور اولاد میں بخشش اور عطا برابر کرنے کے دلائل اس کی تائید کرتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے برابر نہ کرنے کو جور (ظلم) فرمایا اور کہا "لاأشْهَدُ عَلَىٰ جَوْرٍ" یعنی میں بے انصافی کا گواہ نہیں بنتا۔

والله اعلم

حائضہ کی اس نماز کا حکم جس کے آخر وقت میں پاک ہو

سوال:

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: اگر حائضہ دن کے آخر میں ہوتو ظہر اور عصر دونوں نمازیں پڑھے اور اگر رات میں پاک ہوتو مغرب اور عشاء دونوں نمازیں ادا کرے۔ اس عبارت کا کیا مطلب ہے۔

جواب:

جو ظاہراً سمجھ میں آتا ہے کہ احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اس حکم کی بنا دونوں وقتوں کے اشتراک پر ہے یعنی آخر دن سے مراد عصر کا اول وقت جو کہ ظہر کا آخر وقت ہے اور رات سے مراد عشاء کا اول وقت کہ مغرب کے وقت کا آخر ہے۔ تو جو عورت ان اوقات میں پاک ہو جائے احتیاطًا دونوں نمازیں ادا کرے، کیونکہ شرکت وقتین کے خیال سے کہہ سکتے ہیں کہ اس نے دونوں اوقات کو پالیا تو دونوں وقتوں کو نماز ادا کرنی چاہیے۔ اور احادیث سے یہی بات ظاہر ہے کہ جس نماز کے وقت میں پاک ہوئی اس کو ادا کرے۔

واللہ الموفق

”خلق اللہ آدم علی صورتہ“ کا مفہوم

سوال:

حدیث ”خلق الله آدم علی صورته“ کا کیا معنی ہے؟

جواب:

یہ حدیث بروایت حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ بخاری کے کتاب الاستیذان باب بدٔ السلام اور مشکاۃ میں کتاب الادب ۔ باب السلام میں ہے ۔ صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

خَلَقَ اللّٰهُ عَلٰی صُوْرَتِهٖ طُوْلُهٗ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا: [1]

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا ان کا قد ساٹھ گز تھا۔ اور اس حدیث کی مراد کی تعیین میں کئی اقوال ہیں۔

اول:

یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کو آدم کی صورت پر پیدا کیا پہلے ہی ساٹھ گز کے قد سے نہ کر دوسروں کی طرح کئی اطوار میں، کہ پہلے منی ہوتا ہے پھر طفل پھر مرد بن جاتا ہے ۔اور اس قول پر دہریہ کا مذہب باطل ہوجاتا ہے جو کہتے ہیں کہ انسان ہمیشہ دوسرے انسانوں کے نطفہ ہی سے پیدا ہوتا چلا آیا ہے۔

دوسرا:

یہ کہ ضمیر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف راجع ہے اور ”صورت“ صفت کے معنی میں ہے، یعنی انسان سننے والا ، دیکھنے والا ، بولنے والا ، جاننے والا پیدا کیا،اور اپنا مظہر بنایا۔

---

[1] مسلم ۸/۱۴۹ فتح الباری ۱۱/۳ ...

تیسرا:

یہ کہ اضافت تعظیم کی وجہ سے ہے جیسے بیت اللہ اور روح اللہ کہتے ہیں کیونکہ ان کی ابتداء پہلے کسی مثال پر واقع نہیں ہوئی۔

چوتھا:

قول یہ کہ، یہ حدیث احادیث صفات میں سے ہے جس کی تاویل نہیں ہوسکتی۔

پانچواں:

یہ کہ ضمیر اخ یا عبد کی طرف سے راجع ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔

اِذَا ضَرَبَ اَحَدُ كُمْ فَلْيَجْتَنِبِ الْوَجْهَ۔[1]

یعنی جب کوئی تم سب سے اپنے بھائی کو مارے تو چہرے پر نہ مارے۔

چھٹا:

یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ایسی صورت میں پیدا کیا کہ حیوان کی کوئی نوع اس صورت میں اس کی شریک نہیں۔ کیونکہ یہ کبھی علم، کبھی جہالت، کبھی نیکی اور کبھی گناہ کے ساتھ موصوف ہے۔

ساتواں:

یہ کہ عجیب شکل پر جمال وکمال سے پیدا ہوا اور پہلے اس کی کوئی مثال نہ تھی اسی لئے اس کو عالم صغیر کہتے ہیں کہ ہر مخلوق سے اس میں نمونہ ہے۔

آٹھواں:

یہ کہ خدا تعالیٰ کی صورت ہے، چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے ''علی صورة الرحمن''، لیکن اہل الحدیث کے ہاں یہ روایت صحت کو نہیں پہنچتی اور اگر مان بھی لیں تو

---

[1] مسند احمد ۲/۲۴۴، ابوداؤد ۴۴۹۳، مسلم ۴/۲۰۱۶، ادب المفرد ۱۷۴، مصابیح ۵۵۸/۲

صورت سے مراد صفت ہو سکتی ہے۔

نواں:

یہ کہ صورت سے مراد شان اور حال ہو یعنی مسجود ملائکہ، حیوانات کا مالک اور ان پر قابو پانے والا بنایا۔ اور اس معنی پر کلام تمثیل واستعارہ پر مبنی ہے۔

تو متن حدیث کے لحاظ سے موزوں ترین وجہ اول ہے، اور اس کا مؤید لفظ ستون ذراعا ہے۔ اور دوسری وجہ بھی اس کے قریب قریب ہے اور باقی سب وجوہ تکلف سے خالی نہیں اور حدیث کا ظاہر اس سے انکار کرتا ہے۔

واللہ اعلم

بیعت کا حکم

سوال:

حدیث: مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً[1]
یعنی جو مرا اور اس کی گردن میں بیعت نہیں تو جاہلیت کی موت مرا کے کیا معنی ہیں؟

جواب:

اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اگر باوجود ایمان کے کوئی بے بیعت مرجائے تو اسکی موت جاہلیت کی سی ہے، کیونکہ امام وقت کی بیعت نہ کرنا ایک قسم کی بغاوت ہے، اور امام پر بغاوت حرام اور کبیرہ گناہ ہے اور اس میں جماعت اہل اسلام کی مفارقت بھی ہے تو ایسے آدمی کی موت جاہلیت کی سی موت ہوگی، کیونکہ اس پر امام کی اطاعت فرض تھی جب تک صریح کفر کا اظہار نہ کرے اور اس نے بلا وجہ شرعی اس کو ترک کر دیا۔ ہاں اگر امام موجود نہ ہو اور موانع کے سبب اسکا قائم کرنا نہ ہو سکے تو امید ہے کہ یہ شخص اس حدیث کا مصداق نہ ہوگا۔ اس لئے ''خیالی حاشیہ شرح عقائد نسفی'' میں کہا کہ گناہ تب ہوگا جب قدرت اور اختیار سے ترک کرلے اور اگر ناچاری سے ترک کرے تو کچھ ڈر نہیں۔ انتہی۔

اور شرح مقاصد وغیرہ میں بھی اسی طرح ہے اور ظاہر بھی یہی ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ امت پر امام کا قائم کرنا دلیل سمعی سے واجب ہے، اور اس مسئلہ پر اجماع ہے۔ اسی لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آنحضرت ﷺ کے دفن پر امام کے قائم کرنے کو مقدم رکھا اور اس کو اہم المقاصد ٹھہرایا، لیکن آخر زمانہ میں امت سے ضعف اسلام کے سبب امام کا قائم کرنا چھوٹ گیا اور یہ پہلا رخنہ نہیں جو اسلام میں پڑا ہو۔

---

[1] مسلم ۳/۱۴۷۹

مرض میں ضرر کا اندیشہ نہ ہو تو تیمّم ناجائز ہے

سوال:

اگر مطلق مرض میں ضرر نہ بھی ہو اور وضو کرنے سے مرض کے زیادہ ہونے کا اندیشہ بھی نہ ہو بلکہ سفر میں بھی صرف حرج کی بنا پر تیمّم کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور ''وَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً'' کی قید جنابت اور حدث سے خاص کرنے کے احتمال کو بھی کسی معتبر عالم نے اختیار کیا ہے یا نہیں؟

جواب:

صرف حرج کی بنیاد پر تیمم[1] کرنا درست نہیں، کیونکہ آیت کریمہ ''وَاِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰى'' کے اقتضاء سے معلوم ہوتا ہے کہ مریض کے حق میں رخصت کی وجہ ضرر ہے، اور اس بات کو صاحب لغت سمجھ سکتا ہے مجتہد ہی کی کوئی تخصیص نہیں البتہ ضرر کی تحدید میں کلام ہے! شافعیہ کہتے ہیں ایسی مرض ہو جس میں پانی کے استعمال کرنے سے عضو کی منفعت کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو یا اچھا ہونے میں تاخیر واقع ہو جائے یا کسی ظاہری عضو میں گہرا نقص پیدا ہو جائے۔ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ تیمم کی رخصت تب ہے کہ پانی کے استعمال سے مرض کی شدت یا دیر سے اچھا ہونے کا اندیشہ ہو جیسا کہ بخار اور چیچک وغیرہ، اور صاحب مصفی نے کہا کہ: ضرر کی تشخیص بھی عرف کے حوالہ سے ہوگی، انتہی۔

---

[1] تیمّم کا صحیح طریقہ:

ضَرَبَ النَّبِي صلى الله عليه وسلم بكفيه الى الارض ونفخ فيهما ثم مسح بِهِمَا وَجْهِهِ وَكَفَّيْهِ۔ (فتح الباری ۱/۴۴۳، ابن ماجہ ۱/۱۸۸، فوائد عبدالباقی مسلم ۱/۲۸۰، مصابیح ۱/۲۳۹)

دوسری کتب میں کچھ الفاظ تغیر و تبدل ہیں کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارا پھر ان کو پھونکا اور اپنے دونوں ہاتھوں کے ساتھ اپنے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا۔ [جاوید]

بہر حال اعتبار مطلق کا نہیں بلکہ ضرر پہنچنے کا ہے۔ اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے فرمان ''أو علیٰ سفر '' کا ظاہر یہ ہے کہ سفر کا ذکر صورت سمجھانے اور ذہن سامع کی طرف قریب کرنے کے لئے ہے کہ پانی کی عدم دستیابی کی صورت میں سامع کے خیال میں جلدی آ جائے اور احادیث و اخبار میں بھی یہی ثابت ہے اور آیت کا بھی یہی مقتضی ہے، کیونکہ '' فلم تجدوا ماء ''(نساء۴۳) سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ تیمم کے حکم کا مدار پانی کی عدم دستیابی پر ہے۔ مصفی (شرح موطا) میں ہے '' فلم تجدوا ماء '': ظاہر یہ ہے کہ یہ سفر سے متعلق ہے کیونکہ مرض میں پانی کا ہونا تیمم کو مانع نہیں، اور یہ بھی احتمال ہے کہ مراد یہ ہو کہ پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو، اس لئے کہ مریض کا پانی پانا اور نہ پانا برابر ہے۔ اور امام شوکانی کی تفسیر سے ظاہر یہ ہے کہ '' فلم تجدوا ماء '' کی قید کو جنابت اور تیمم سے خاص کرنے کا احتمال ہے، چنانچہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان '' فلم تجدوا ماء '' اگر یہ قید جمیعِ ماتقدم کی طرف راجع ہو یعنی شرط کے بعد جس کا ذکر ہوا وہ مرض، سفر، صحراء سے آنا اور عورتوں سے صحبت کرنا ہے۔

کیا سفر اور مرض میں تیمم جائز ہے:

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ صرف سفر اور مرض سے تیمم کرنا جائز نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ پانی کی عدم دستیابی بھی لازم ہے، پس مریض کو تیمم کرنا جائز نہ ہوگا مگر جس وقت پانی میسر نہ آئے۔ اور علی ھذا القیاس مسافر کو بھی تیمم کرنا تبھی جائز ہوگا جبکہ پانی نہ ملے، لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ پانی کے نہ ملنے کے وقت تو تندرست بھی مریض کی طرح تیمم کر سکتا ہے۔ پس مرض اور سفر کے صریح ذکر کرنے کے لئے ضرور کوئی فائدہ ہونا چاہیئے! بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ مریض کے بارے میں پانی کی عدم دستیابی اکثر واقع ہوتی ہے۔ اور اگر قید پچھلی دو صورتوں (یعنی صحرا سے آنے اور عورتوں سے صحبت کرنے) کی طرف راجع ہو جیسے بعض مفسرین نے کہا تو اس میں یہ اشکال ہوگا کہ جس پر مریض اور مسافر کا لفظ صادق آئے اس کو تیمم کرنا جائز ہے، خواہ پانی مل سکے اور اس کے استعمال پر بھی قادر ہو اور بعض نے کہا کہ یہ قید پچھلی صورت کی

طرف راجع ہے کیونکہ ان میں اس کا وقوع کم ہوتا ہے، لیکن پہلی دوصورتوں میں بھی اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور آپ کو یہ خبر ہے کہ یہ کلام ساقط اور نکمی توجیہ ہے۔

امام مالکؒ اور ان کے تابعین نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تیمم کی شرط میں مرض اور سفر کا ذکر کیا اس لئے پانی نہ ملنا اکثر انہی دو گروہوں کے بارے میں واقع ہوتا ہے، بخلاف اس شخص کو جو اپنے گھر میں ہے کیونکہ اکثر اس کے پاس پانی موجود ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صراحۃً نہیں کیا۔ انتہی۔ اور ظاہر یہ ہے کہ مرض میں تیمم کرنا جائز ہے اگرچہ پانی موجود ہو بشرطیکہ اس کے استعمال سے فی الحال یا آئندہ ضرر ہو اور یہ لازم نہیں کہ عضو کے تلف ہوجانے کا خوف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ...... الآیۃ (البقرۃ:۱۸۵)

یعنی اللہ تعالیٰ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے مشکل نہیں چاہتا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ...... الآیۃ (حج:۷۸)

اور تم پر دین میں کوئی مشکل نہیں رکھی۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں...... اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ ...... یعنی دین آسان ہے۔ اور فرمایا...... يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا[۱] یعنی آسانی کرو اور دشواری نہ کرو کہ سخت گیری سے دین کو لوگوں پر مشکل بنا دو۔

اور جب سفر میں ایک شخص کے سر میں زخم ہوا اور اسے غسل کی ضرورت ہوئی تو ساتھیوں سے تیمم کی رخصت پر عمل کرنے کا مسئلہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ تیمم کی رخصت جب ہے کہ پانی نہ ملے اور تمہارے پاس پانی موجود ہے، اس لئے ہم تو اجازت نہیں دیتے۔ آخر اس نے غسل کیا اور مر گیا۔ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا۔ قَتَلُوْهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ[۲] یعنی خدا انہیں غارت کرے بیچارے کا

---

[۱] فتح الباری ۱۰/۵۲۴، ۱/۹۳، مسند احمد ۵/۶۹، مسلم ۳/۱۳۵۹، مصابیح ۳/۲۰۱

[۲] ابوداؤد ۱/۳۳۹۔ دار قطنی ۱/۱۸۹، ۱۹۰

خون کر دیا اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بُعِثْتُ بِالْحَنِيفِيَةِ۔[1] یعنی مجھے سہل شریعت کا حکم ہوا۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ پانی کے نہ پائے جانے کی قید سب کی طرف راجع ہے تو مرض کے صراحتہً ذکر کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ جب پانی مریض کو نقصان کرے بخلاف تندرست کے، تو پانی کی موجودگی کی حالت میں بھی تیمّم جائز ہے، اور یہ قید اس کے باری میں تب معتبر ہوگی کہ پانی کا استعمال ضرر نہ کرے۔ کیونکہ صرف مرض میں بھی اگر پانی نقصان نہ کرے اور پانی کی عدم دستیابی کا خطرہ ہے کہ مریض مرض کے ضعف کے سبب پانی کی تلاش سے عاجز ہوتا ہے۔ اور مسافر کے صریح ذکر کی وجہ تو ظاہر ہے، کیونکہ سفر میں بعض مقامات پر تو پانی ملتا ہی نہیں جو کہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔ انتہی کلامہ

واللہ اعلم

---

[1] طبرانی کبیر ۱۷۰/۸ المجمع الزوائد ۳۰۲/۴

طاعون و وبا میں ہر نماز میں دعائے قنوت پڑھنے کا جواز

سوال:

طاعون اور وبا ایک ہی چیز ہے یا مختلف ہیں؟ اور ان دونوں کی کیا حقیقت ہے؟ اور اسے دور کرنے کیلئے دعائے قنوت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:

طاعون کی لغوی تحقیق:

قاموس کی فصل ''طا'' اور باب ''نون'' میں لکھا ہے: الطاعون ، الوباء۔ اور باب ''ھمزہ'' اور فصل ''واؤ'' میں ہے کہ: الوباء ، الطاعون أو کل مرض عام یعنی وبا طاعون ہے یا ہر مرض عام۔ اور اس وبا کا نام ہے جو ہوا کے فساد کی وجہ سے اٹھے اور طبائع کے فاسد ہونے کا سبب بن جائے۔

اور صراح میں ہے: طاعون بضم عین مهملة۔ ''وبا کی موت'' کے معنی میں ہے۔ اور منتھی الارب میں ہے: ''وبامحرکة'' مقصور بھی آتا ہے اور ممدود بھی۔ عام بیماری یا طاعون کو کہتے ہیں۔

اور غیاث میں ہے: طاعون اور ورم ہے جو کہ خصیہ، پستان، بغل، یا ران کی جڑ میں زہریلے مادے سے عضو کو فاسد کر دیتا ہے، قے، متلی، بے ہوشی اور خفقان اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور نفائس اللغات میں ہے: جو مرگ انسانوں میں واقع ہو اسے طاعون اور وباء کہتے ہیں اور فارسی میں مرگا، مرگ اور مرگی کہتے ہیں اور مرگی، مرگ کی طرز نسبت ہے، صائب کہتا ہے۔

سفر نہ کر دن ازاں کشور از گراں جانی ست
کہ مرگے دل و قحط غذاے روحانی ست [1]

(فتح الباری ۱۰/۱۸۰/۱۹۳۔ مسلم ۳/۱۵۲۲، مصابیح ۱/۵۲۰)

اور اگر چوپایوں میں ہو تو عربی میں اس کو "مُوتان" بضم میم وسکون واو اور فارسی میں مرگا، مرگ ستوران اور ترکی میں "پوت" کہتے ہیں۔

طاعون کی تفسیر میں اطباء کے اقوال:

لیکن اس کی تفسیر میں اطباء کے اقوال میں یہ ہے: صاحب بحر الجواہر نے کہا کہ: چھوٹی سی پھنسی جو کہ سرخ یا سیاہ لوبیا کے دانہ کے برابر ہوتی ہے جس میں بہت جلن اور سوزش ہوتی ہے۔ حدود الامراض میں کہا: یہ جنگلی بیر کی مقدار نیلے رنگ کی ایک پھنسی ہوتی ہے نیز جلن اور وبائی تپ اس کے ساتھ لازم ہوتا ہے۔

اور بوعلی سینا نے کہا: طاعون ایک سمی مادہ ہے جس سے وِرم مہلک پیدا ہوتا ہے اور اکثر بغلوں کے نیچے یا کانوں کے پیچھے نکلتی ہے اور اس کا سبب ردی خون ہے جو زہریلا مادہ بن جاتا ہے اور عضو کو فاسد کر دیتا ہے اور اس کے سبب دل کی کیفیت بھی فاسد ہو جاتی ہے اور غشی اور خفقان کی حالت پیدا ہوتی ہے اور اُس عضو میں ورم ہوتا ہے جو بالطبع بہت ضعیف ہو۔ (المواھب اللدینۃ ۳/۴۹۰)

اور بڑا طاعون وہ ہے جو اعضائے رئیسہ میں پیدا ہو اور سیاہ رنگ والا غالبا مہلک ہے اور جس میں بچنا مشکل ہے اور سرخ رنگ والے میں اکثر بچ بھی جاتے ہیں اس کے بعد زرد رنگ والا ہے، اور طاعون اکثر وبا کے زمانہ میں پیدا ہوتا ہے اس لئے ایک کا نام دوسرے پر بولا جاتا ہے۔ (مواہب ۳/۴۹۰)

طاعون کے متعلق اہل شرع کے اقوال:

قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا کہ "طاعون ایسی بیماری ہے کہ اکثر روح کو

---

[1] ترجمہ: اس ملک سے سفر نہ کرنا جان سے وزنی ہے، روحانی غذا کا قحط دل کا مردہ ہونا ہے۔ (خلیق)

بجھا دیتی ہے اور اسے طاعون اس لئے کہتے ہیں کہ یہ عام ہوتی ہے اور جلدی قتل کر دیتی ہے۔ (مواہب ۳/۴۸۹)

اور قاضی عیاضؒ نے کہا کہ: یہ ایک پھڑیا (پھنسی) ہوتی ہے جو بدن میں نکلتی ہے اور عام ہونے کے ساتھ ساتھ مہلک بھی ہے اس کو ہلاک کرنے میں نیزہ مارنے کے ساتھ مشابہت دے کر طاعون بولتے ہیں۔

نوویؒ نے تہذیب میں کہا کہ: یہ ایسی پھنسی ہے جو گرمی کی وجہ سے بدن میں نکلتی ہے جس میں ورم سخت درد، سوزش اور جلن کے ساتھ اپنے آس پاس کو سیاہ سرخ اور سبز کر دیتی ہے جس کے ساتھ خفقان اور قے بھی ہوتی ہے اور کبھی ہاتھوں انگلیوں اور باقی جسم میں بھی نکلتی ہے۔ (مواہب ۳/۴۹۰)

اور حافظ ابن القیمؒ: نے ھدی نبوی (یعنی: زاد المعاد فی ھدی خیر العباد) میں کہا کہ طاعون لغت کی رو سے ایک وبا کی قسم ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ طاعون کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک غدود اونٹ کی غدود کے مشابہ ہوتی ہے جو گلے اور بغلوں میں نکلتی ہے اور چونکہ طاعون اکثر وباخیز شہروں میں ہوتا ہے اس لئے اس کو وبا بھی کہہ دیتے ہیں، جیسے خلیل نے کہا، وبا طاعون ہے۔ اور بعض نے کہا ہر مرض عام ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ: وبا اور طاعون عموم و خصوص ہے پس ہر طاعون تو وبا میں داخل ہے اور ہر وبا طاعون نہیں۔ اور اسی طرح دوسری عام امراض طاعون سے عام ہیں اور اسے شامل ہیں اور ''طواعین'' ان زخموں کو کہتے ہیں جو طاعون کے اثر سے ہوتے ہیں خود طاعون کو نہیں کہتے۔ لیکن اطباء جب ظاہر آثار کے بغیر اس کی حقیقت کو نہ پا سکے تو انہیں زخموں کو طاعون کہنے لگے۔

اور طاعون تین چیزوں سے عبارت ہے:

ایک: اثر ظاہر، جسے اطبا نے ذکر کیا۔

دوسرا: وہ مرگ جو اس کے سبب سے پیدا ہو۔ اور یہی حدیث صحیح سے مراد ہے،

''الطَّاعُونُ شَهَادَةٌ لِكُلِّ مُسْلِمٍ''یعنی طاعون ہر مسلمان کے لئے شہادت ہے۔

تیسرا: اس بیماری کی علت فاعلی۔(زادالمعاد۴/۳۹)

مواہب لدنیہ میں ہے کہ: اس امر کی دلیل کہ طاعون وبا کے علاوہ ہے، یہ ہے کہ، طاعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ میں نہیں آیا، اور حدیث شریف میں طاعون کی نسبت اس مقام شریف کی طرف واقع نہیں ہوئی، حالانکہ وبا کی نسبت اس کی طرف ہوئی ہے۔ اور بعض نے طاعون کی تفسیر ''موت کثیر'' کے ساتھ کی ہے۔(مواہب اللدنیہ۴/۲۹۱)

میں کہتا ہوں کہ:

حدیث کے الفاظ یہ ہیں ۔ إِنَّ الْمَدِينَةَ لاَ يَدْخُلُهَا الطَّاعُونُ......(فتح الباری ۴/۹۵،۱۰/۱۷۹)یعنی مدینہ منورہ میں طاعون داخل نہیں ہوگا۔ اور صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہتی ہیں''قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ وَهِيَ أَوْبَأُ أَرْضِ اللهِ......یعنی ہم مدینہ میں آئے اور وہ اللہ کی تمام زمین کی نسبت زیادہ وبا ناک تھی۔ اور صحیحین میں عُرَنِیِّین کی حدیث سے بھی مروی ہے: إِنَّهُمْ قَالُوا هٰذِهٖ أَرْضٌ وَبِيئَةٌ...... انہوں نے کہا یہ وبا ناک زمین ہے۔ اسی طرح حضرت امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں موت کثیر اور وبا واقع ہوئی مگر طاعون نہ ہوا۔

طاعون کی وبا کی حقیقت:

مواہب لدنیہ میں ہے کہ طاعون کی حقیقت یہ ہے کہ خون جوش میں آ کر کسی عضو پر گر کر اس کو بگاڑ دیتا ہے اور وہاں ورم ہو جاتا ہے اور دوسرے امراض جو عام اور ہوا کے فساد سے پیدا ہوتے ہیں۔ طاعون کا اطلاق عمومِ مرض اور کثرتِ موت کے علاقہ سے ان پر بطور مجاز کے ہے، اور وبا کی حقیقت ہوا کے جوہر کا بگڑ جانا ہے، جو مادۂ روح ہے۔(مواہب۴/۲۸۹)

میں کہتا ہوں!

احادیث سے جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ "طاعون جنوں کا نیزہ مارنا ہے" (فتح الباری ۱۰/۱۸۱) جیسا کہ حدیث میں ہے: وَخْزُ أَعْدَائِكُمْ مِنَ الْجِنِّ: یعنی تمہارے دشمن جنوں کا نیزہ مارنا ہے۔ (مسند احمد ۴/۳۹۵) اخرجہ احمد عن أبی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ۔ اور اس کی مثال طبرانی نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

"وخز" واؤ اور خائے معجمہ کے ساتھ، ایسی چوک کو کہتے ہیں کہ جو پار نہ نکل سکے اور یہ ایسا امر ہے کہ اس کو شارع علیہ السلام کی خبر دیئے بغیر جاننا ممکن نہیں، اور اس کی دریافت کی جانب عقل نہیں پہنچ سکتی۔ اس لئے اطباء نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اور بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کی حقیقت پوچھی تو آپ نے خبر دی کہ وہ ایک عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اسے بھیج دیتا ہے اور اسے مومنوں کے حق میں رحمت بنایا ہے۔ (فتح الباری ۱۰/۱۹۲، کتاب الطب) اور دوسری حدیث میں ہے: کہ

یہ ایک ایسے عذاب کا بقیہ ہے جو بنی اسرائیل پر بھیجا گیا تھا۔ اور مزید ایک دوسری میں ہے کہ: یہ ایک نبی کی بددعا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے کہا کہ: علماء کی ایک جماعت کی عبارت میں "أَعْدَائِكُمْ" کی جگہ لفظ "أَخْوَانِكُمْ" ہے جو کہ غیر معروف ہے۔ اور حدیث کے طرق میں سے، بڑی جستجو کے بعد مشہور کتابوں اور نامزد رسالوں میں سے یہ کسی طریق میں نہیں ملا، اور اگر ثابت بھی ہو جائے تو بھائی ہونے سے مراد "اخوت تقابل" ہو گی۔ جیسے کہا جاتا ہے "اللیل والنہار" "ای اخوان متقابلان" اور حدیث "زادُ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ" میں یہی معنی مراد ہے۔ انتہی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شرعاً اس کی حقیقت، جنوں کا نیزہ مارنا ہے۔ وخز، عذاب، نبی کی بددعا اور بقیہ حقائق پر حقیقت شرعی مقدم ہے۔

جنوں کا نیزہ ہونے سے متعلق ابن الجوزی کی رائے:

ابن الجوزی کہتے ہیں کہ جنوں کا نیزہ ہونے میں حکمت یہ ہے کہ شیطان اور شریر جن ہمارے دشمن ہیں۔ جس طرح کہ ان میں سے نیک اور اہل طاعت ہمارے بھائی ہیں، اور خدا تعالیٰ نے حکم کیا ہے کہ جنوں اور آدمیوں میں سے جو ہمارے دشمن ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے دشمنی اور لڑائی کریں۔ اور جب اکثر آدمیوں نے ان کی دشمنی سے انکار کیا اور ان سے صلح اور دوستی کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن جنوں کو تعذیب کے طور پر ان پر مسلط کیا کہ، ان کو نیزے ماریں جو پار نہ نکلیں کہ ایسا مارنے میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہ مسلط کرنا اس لئے ہے کہ انہوں نے ان کا کہا مانا اور ان کے کہنے سی زمین میں فساد اور گناہ کئے۔ سو حکمت الٰہی کا یہ مقتضی ہوا کہ ان کو ان پر مسلط کرے کہ وہ انہیں چوکے دیں اور نیزوں سے زخمی کریں۔ چنانچہ آدمیوں میں سے ان کے دشمنوں کو بھی ان پر مسلط کیا جب یہ فساد کریں اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈالیں یعنی اس پر عمل کرنا چھوڑ دیں۔

تو یہ طاعون جنوں کی لڑائی ہے جس طرح کہ جہاد انسانوں کی لڑائی ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ اس پر بطور عذاب کے جو مستحق عذاب ہے اور اس کے حق میں شہادت و رحمت ہے جو ثواب کا اہل ہے، اور عقوبات میں عام طور سے یہ سنت الٰہی ہے۔ پھر مومنوں کے لئے گناہوں سے پاک ہونے کا سبب ہو جاتی ہے اور کافروں سے بدلا لینا ہے، انتھی کلام ابن الجوزی مع زیادۃ۔

''ہوا کے جوہر کے فساد سے طاعون'' کہنے والوں کا رد:

جو اطباء اس کہتے ہیں کہ یہ ہوا کے جوہر کے فساد کا نام ہے اس کا رد چند وجوہ سے ہوسکتا ہے:

اول: یہ کہ معتدل موسموں اور آب و ہوا کی رو سے جو پاکیزہ اور عمدہ شہر ہیں ان میں بھی واقع ہوتا ہے تو جوہر ہوا کا فساد کس طرح ہوا۔

دوم: کہ اگر یہ ہوا کے فساد سے ہوتا تو چاہیئے تھا کہ عموماً آدمیوں اور حیوانات میں بھی پڑتا، حالانکہ بہت سے حیوانات و انسان ایسے ہیں کہ طاعون اور وبا ان کو پہنچتی ہے اور پھر وہ بچ جاتے ہیں، اور دوسرے اشخاص و حیوانات جو مزاج میں ان کے مشابہ ہوتے ہیں ان کو سرے سے اثر پہنچتا ہی نہیں۔

سوئم: کہ یہ ہوا کے فساد سے ہوتا تو چاہیے تھا کہ، سب اعضاء اور تمام بدن میں ہوا کرتی، کیونکہ ہوا تمام بدن کو لگتی ہے، حالانکہ یہ غالباً بدن کے ایک جزو خاص میں پیدا ہوا کرتا ہے اور دوسرے عضو تک تجاوز نہیں کرتا۔

چہارم: یہ کہ جو مرض اسباب طبعیہ سے پیدا ہوتے ہیں تو طبعی دواؤں میں سے ان کے لئے کوئی دوا بھی ہوتی ہے بخلاف طاعون و وباء کے، کہ اطباء اس کے علاج سے عاجز ہیں حتی کہ بڑے حاذق طبیب یہ اقرار کر چکے ہیں کہ اس بیماری کا کوئی علاج نہیں، نہ ہٹانے والا اور نہ ہی روکنے والا ہو، سوا اس خالق (حقیقی) سے جس کی بڑی حکمت ہے اور اس کو دور کرنا جانتا ہے۔

امام حافظ ابن حجرؒ کا اطباء پر ردّ:

حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں رقمطراز ہیں کہ:

اطباء کو اپنے اس قول کے موجب جو انہوں نے کہا یہ ہے کہ: اس امر کی دریافت کہ طاعون جنوں کا نیزہ مارنے سے ہے، شارع علیہ السلام کی خبر کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا اور عقل کو اس میں کوئی دخل نہیں اور جب ان کے پاس اس باب میں شارع علیہ السلام کا بتایا ہوا علم نہیں تھا تو انہوں نے یہ سمجھا کہ قریب تر یوں ہے کہ کہا جائے کہ، طاعون جو ہر ہوا کے فساد سے ہوتا ہے سو شرع وارد ہو گئی اور اللہ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی قطعی علم حاصل ہو گیا تو عقل کی تجویز و تخمین باطل ہو گئی۔ (فتح الباری ۱۰/۱۸۱)

امام ابن القیمؒ کا ردّ اور طاعون سے محفوظ رہنے کا طریقہ:

حافظ ابن القیمؒ نے زاد المعاد فی ھدی خیر العباد میں کہا کہ:

یہ علل اسباب جو شارع نے بتائے اطباء کے پاس کوئی ایسی حجت نہیں جو ان کو ردّ کر دے، جس طرح کہ ان کے پاس کوئی ایسا ثبوت بھی نہیں جس سے ان کو سمجھ سکیں، اور حضرت انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے معلوم کرانے سے ان چیزوں کی خبر دیتے ہیں جو لوگوں سے پوشیدہ ہیں اور طبیبوں نے طاعون کے جو آثار معلوم کئے ہیں ان میں بھی ان کی کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے اس امر کو منع کریں کہ یہ آثار ارواح کے ذریعہ سے ہیں، کیونکہ ارواح کی تاثیر طبیعت میں اور طبیعت کے امراض اور اس کی ہلاکت میں ایسا یقینی امر ہے کہ اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے نہ ارواح اور ان کی تاثیر، اجسام اور اجسام کے طبائع کے ارواح کا اثر قبول کرنے سے منکر ہے، ماسوائے اس شخص کے جو تمام لوگوں کی نسبت بڑا جاہل ہوگا۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارواح کو بنی آدم کے اجسام میں وبا پیدا ہونے اور ہوا کے فاسد ہونے کے وقت تصرف دیتا ہے جس طرح کہ ان کو بعض مواد ردیہ کے غالب ہونے خصوصاً خون، صفراء، سوداء اور منی کے غلبہ کے وقت تصرف دیتا ہے جو نفس میں ہیئت ردی کو پیدا کرتے ہیں اس لئے کہ شیطانی ارواح ان اہل عوارض کے ساتھ ان کے غیر نسبت زیادہ تاثیر کی طاقت رکھتے ہیں۔ (زاد المعاد: ۳۹/۴)

طاعون سے محفوظ رہنے کا طریقہ:

تو ان اسباب سے زیادہ طاقتور کسی دافع کی ضرورت ہے جو ان کا دفاع کر سکے وہ:

۱)...... ذکر (الٰہی)، دعا، اللہ تعالیٰ کی جناب پاک میں زاری، گڑ گڑانا (یعنی استغفار کرنا)

۲)...... صدقہ کرنا

۳)...... اور قرآن مجید کی تلاوت ہے

کیونکہ ان چیزوں کے سبب فرشتوں کے ارواح نازل ہوتے ہیں جو ارواحِ

خبیثہ کو مغلوب کر کے ان کا اثر باطل کر دیتے ہیں اور ان کی تاثیر دور کر دیتے ہیں۔ ہم نے اور ہمارے احباب نے اس کو اتنی بار آزمایا ہے جس کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (زاد المعاد ۴/۴۰)

اس عبارت میں اس بات پر دلالت ہے کہ طاعون جنوں کے نیزہ چوکنے سے ہوتا ہے اور ذکر، دعا اور صدقہ اس کا دافع ہے، لیکن فقیر نے شارع علیہ السلام سے ان چیزوں کی تصریح نہیں پائی مگر عموم ادلہ اس بلا کو بھی شامل ہے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر غضب اور عذاب ہوتا ہے اور حدیث شریف میں ہے:

اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ. (ترمذی/احمد شاکر ۳/۴۳ مصابیح ۱۲/۵۰)

یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے صدقہ وخیرات دینے سے خدا کا غضب فرو ہو جاتا ہے اور علی ھذا القیاس ذکر و استغفار بھی بلا کے ٹالنے کے موجب ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آفات میں قنوت کا مطلقاً پڑھنا منقول ہے تو اس آفت کو بھی شامل ہوگا۔ اسی لئے شیخ الاسلام رملی اور علماء کی ایک جماعت نے فتویٰ دیا ہے کہ طاعون دور کرنے کے لئے قنوت پڑھنا مستحب ہے، اس لئے کہ طاعون بھی بڑی آفات میں سے ہے اور ائمہ ہر بلا میں دعا کے مستحب ہونے کے قائل ہیں۔ اور شیخ رافعی اور نووی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ: قنوت کا حوادث کیلئے جیسے وبا وغیرہ، سب فرضوں میں پڑھنا مشروع ہے۔ اسی طرح ائمہ شافعیہ نے دشمنوں پر غلبہ کے لئے قنوت کے مستحب ہونے کا ذکر کیا ہے، حالانکہ اعدائے دین شہادت کا سبب ہیں، پس طاعون میں بطریق اولیٰ مستحب ہونا چاہئے اور دعائے مذکور سے یہ نہیں لازم آتا کہ یہ دعاء صحت و شہادت کے دور کرنے کے لئے ہے، کیونکہ اس دعا کا حاصل یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ ہمارے دشمن جنوں کو ہم پر مسلط نہ کرے، بلکہ ان پر غالب کر دے۔

اور سیوطیؒ کی شرح ابیات التثبیت میں ہے کہ: طاعون اور وبا کو دور کرنے کیلئے آنحضرت ﷺ پر کثرت سے درود پڑھنا مجرب ہے۔

غنیۃ الطالبین میں اصحاب ابوحنیفہؒ کو فرقہ مرجیۂ میں ذکر کرنے کا مفہوم

سوال نمبر:

غنیۃ الطالبین[1] وغیرہ میں اصحاب ابوحنیفہ نعمان رحمہ اللہ کو مرجیۂ میں ذکر کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:

شاہ ولی اللہ محدث دھلویؒ نے تفہیمات میں لکھا ہے کہ ''ارجا'' دو قسم کا ہے:
ایک تو وہ ارجا ہے کہ قائل کو اہل سنت سے نکال دیتا ہے دوسرا وہ ہے کہ قائل کو اہل سنت

---

[1] شیخ عبدالقادر جیلانی کا شمار کبار صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ شیخ صاحب صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ عالمِ دین اور مجتہد انسان تھے۔ بعض لوگوں نے ان کے متعلق بہت سی خرافات ان کے ذمے لگا دی ہیں۔ جیسا کہ امام ذہبی نے اپنی کتاب سیر اعلام النبلاء میں ذکر کیا ہے۔
اگرچہ شیخ صاحب نے اصحاب ابوحنیفہؒ کو فرقہ مرجیۂ میں شمار کر دیا تو حقیقت میں ان کا یہی موقف تھا۔ بعض الناس نے غنیۃ الطالبین شیخ صاحب کی کتاب ہونے کا انکار کیا ہے۔ ہم دلائل سے ان کی کتاب ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔
امام ابن تیمیہؒ جو اسلام کے ایک عظیم مصلح گزرے ہیں، انہوں ہر دور کے فتنے کا مقابلہ کیا۔ اپنی کتاب الفتوىٰ الحمویۃ الکبریٰ میں اللہ تعالیٰ کی صفت کے سلسلہ میں حضرت جیلانیؒ کی کتاب کا حوالہ دے کر نقل کرتے ہیں کہ تفصیل غنیۃ الطالبین میں عربی صفحہ ۴۸ اردو صفحہ ۱۴۵ نفیس اکیڈمی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ''من متاء خریھم الشیخ الامام ابومحمد عبدالقادر بن ابی صالح جیلانیؒ قال فی کتابہ الغنیۃ'' وغیرہ، اگر یہ کتاب حضرت شیخ کی نہ ہوتی تو امام بن تیمیہؒ کبھی اس کا حوالہ نہ دیتے بلکہ اس کی تردید کرتے کہ کتاب فلاں بزرگ کی ہے کیونکہ ان کی تحقیق اہل سنت کے نزدیک مسلمہ ہے تحقیق کا سلسلہ میں حیات ابن تیمیہؒ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ امام ذہبیؒ جو رجال میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور ان کی بات تقریباً حرف آخر گردانی جاتی ہے وہ میزان الاعتدال جلد اول میں پیر صاحب کی کتاب العینیۃ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۱/ ۲۰۰ ہندی مصری وطبع اثریہ ۱/ ۴۳۱)

سے نہیں نکالتا۔

''کیف لواراى الغنية للشيخ عبدالقادر ''(صفحہ ۴۳۱ اول جلد میزان) اسی طرح مورخ اسلام حافظ ابن کثیرؒ تحریر کرتے ہیں کہ ''صنف كتاب الغنية وفتوح الغيب ومنها اشياء حسنة'' اور ابن عماد حنبلی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں'' كان عبدالقادر متمسكا فی مسائل الصفات والقدر ونحوهما بالسنة مبالغا فی الرد على من خالفها قال فی كتابه الغنية المشهور ''شیخ عبدالقادرؒ صفات وقدر میں کتاب وسنت پر عمل پیرا تھے اور انہوں نے قدریہ جہمیہ وغیرہ فرقوں کا سختی سے رد لکھا ہے اپنی مشہور کتاب الغنیۃ میں (کتاب شذرات الذہب ۴/۲۰۱)

کشف الظنون جو مصنفین کی ایک فہرست کا نام ہے ''غنية الطالبين لطريق الحق'' ''للشيخ عبدالقادر الكيلانى الحنفی المتوفى سنة'' تو اس سے ثابت ہوا کہ یہ کتاب حضرت صاحب کی ہے۔ (کشف الظنون ص ۲/۱۲۱۱) دائرہ معارف بستانی تحریر کرتے ہیں'' ذكر بعض من كتب فی مناقبه انه الف كتباً مفيده وليس بين الايدى من هذه الكتب الاكتاب المعروف بالغنية والفتح الربانی وفتوح الغيب '' حضرت کی کتب کی تعداد تو بہت زیادہ ہے بعض نے ایک ہزار تک تعداد شمار کی ہے مگر غنیۃ وفتوح الغیب بہت زیادہ معروف ہے (دائرہ المعارف بستانی ۱۱/۶۲۲)

اس طرح العلوم میں لکھا ہے کہ'' له كتب منها الغنية مطالب لطريق الحق والفتح الربانی وفتوح الغيب ''(ج ۴/ ۴۷) حضرت جیلانیؒ کا کیونکہ حنبلی لوگوں میں شمار ہوتا ہے بلکہ بعض نے تو لکھا ہے کہ حضرت نے ان سے اپنا تعلق توڑ لیا تھا بہرحال حنبلی کتب ان کو امام احمد کی طرف نسبت قرار دیتے ہیں جیسے ذیل ابن رجب میں لکھا ہے کہ'' له كتاب الغنية وهومعروف ''(ذیل ۱/۲۹۶)

رضا کحالہ:۔ اپنی تصنیف میں انکی کتب کا تذکرہ کرتے ہیں'' جلاء الخاطر فی الباطن والظاهر والغنية'' (معجم المصنفین ۵/ ۳۰۷)

معجم المطبوعات العربیہ:۔ کے مرتب تحریر کرتے ہیں کہ'' الغنية الطالبى طريق الحق'' ساتھ اور بھی کتب کے نام ہیں فقہ اکبر جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف نسبت کی جاتی ہے مگر حقائق اس بات کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ مولانا شبلیؒ نے سیرت نعمان میں اس کا انکار کیا ہے بہرحال اس کے شارح ملاں علی قاری جو حنفی مکتبہ فکر کے ایک ستون مانے جاتے ہیں انہوں نے لکھا ہے'' اماماوقع فی الغنية للشيخ عبدالقادر جيلانى '' انہوں نے اس جگہ فرقہ ناجیہ کا ذکر کیا ہے اور ابوحنیفہ اور اہل اصحاب کو فرقہ قدریہ میں شمار کیا ہے۔ (شرح فقہ اکبر ص ۸۹-۸۸)

مولانا محمد معین سندھی:۔ جو حضرت شاہ ولی اللہ کے ہم عمر ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ'' قوله فی الغنية'' (دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنہ: ۳۵۲)

امام نواب صدیق حسنؒ:۔ اگرچہ نواب صاحب کے پہلے اور دوسرے دور میں بہت فرق ہے۔ آخری دور میں تو وہ

اول:۔

یہ ہے کہ اس بات کا معتقد ہونا کہ جس نے زبان سے شہادتین کا اقرار کیا دل

خالص اہل حدیث فکر کی ترویج میں مصروف ہو گئے تھے فتح الباری ان کی وجہ سے ہندوستان میں طبع ہوئی اور مفت تقسیم ہوئی۔ اسی طرح بے شمار کتب انہوں نے طبع کروا کر اہل علم میں مفت تقسیم کیں۔ وہ خود بھی ۲۲۳ کتب کے مصنف تھے جن میں فتح البیان تفسیر ۱۰ جلد، لطائف البیان اردو گویا انہوں نے ہر فن میں کتب تحریر کیں ارجح المطالب بھی ان کی ایک اہم تصنیف ہے۔ انہوں نے اس میں فرقہ قدر یہ کے تعارف میں حضرت شیخ عبدالقادر کی کتاب الغنیۃ کا نام تحریر کیا ہے کہ اس میں اس کا رد ہے مزید تفصیل اس میں دیکھ لیں۔ (ارجح المطالب فارسی ص ۱۶۵/ تقصار جیوالا احرار صفحہ ۶۸)

الغنیہ:۔ عربی زبان میں ہے اس کا ترجمہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے فارسی زبان میں جو جامعہ سلفیہ کا لائبریری میں موجود ہے اس کے متعلق دائرہ معارف لاہور لکھتا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور عالم تصنیف ہے عبدالحکیم نے اس کا فارسی ترجمہ اپنے زمانہ کے نامور صوفی شیخ بلاول قادری لاہور کی فرمائش پر کیا۔ فارسی ترجمہ کے آغاز میں عبداللہ اللسیب کا خطبہ بھی ہے جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ ترجمہ شیخ جیلانی کی روحانی اجازت سے کیا گیا ہے۔ (دائرہ معارف لاہور ۲/ ۸۴۰)

اور اس کتاب میں لکھا ہے کہ ان کی تصنیف ''غنیۃ الطالبین لطریق الحق'' کی حیثیت ایک معلم دینیات کی ہے اس کتاب کے شروع میں ایک سنی مسلمان کے اخلاق اور معاشرتی فرائض کی وضاحت کی گئی ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا لاہور (دائرہ معارف) ۱۲/ ۹۲۶)

روحانی اجازت:۔ یہ تصوف ہے جس سے روحانیت کے روپ میں لوگوں کے عقائد وافکار کر تباہ کر دیا جاتا ہے بلکہ دنیا میں گمراہی کا سبب ایک تقلید اور دوسرا تصوف ہے۔ جناب من جب آپ نے حضرت شیخ عبدالقادرؒ سے روحانی طور پر اجازت طلب کر لی اور اجازت مل بھی گئی پھر کوئی سر پھرا دعویٰ کرے یہ تصنیف شیخ کی نہیں ہے، تو پھر

تم نہ کسی کی آہ نہ فغان سنتے ہو
اپنے ہی مطلب کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو

یہ بھی یاد رہے دائرہ معارف میں شیخ پر ایک مشہور مقالہ بریلوی مولوی عبدالنبی کوکب کا ہے اس نے بھی اس کتاب کو حضرت کی شمار کیا ہے اسی طرح اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ غنیۃ ان کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے اس میں شریعت اور طریقت کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ (لاہور سید محمد قاسم ص ۱۰۴۲)

بابائے اردو عبدالحق مرحوم کراچی:۔ جن کا شمار پاک وہند کے عظیم سکالروں میں ہوتا اردو ادب کے ساتھ ساتھ

سے تصدیق کی اس کو کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا۔

وہ کتب کے متعلق بہت زیادہ معلومات رکھتے تھے وہ شیخ جیلانی کے حالات میں لکھتے ہیں کہ آپ کا مذہب کیا تھا انہوں نے کامل کے حوالہ سے حنبلی لکھا ہے۔ (کامل ۱۱/ ۱۲۱) اور ساتھ اور بھی حوالے نقل کئے ہیں انہوں نے تحریر کیا کہ شیخ صاحب خود غنیۃ میں کئی جگہ فرمایا "عند امامنا احمد" تو ثابت ہوا کہ غنیۃ ان کی ہی کتاب ہے اور ان کی تصانیف میں غنیۃ الطالبین، فتوح الغیب الفتح الربانی وغیرہ کو شمار کیا ہے (صفحہ ۱۹، ۲۷، غنیۃ الطالبین مترجم کراچی مکتبہ سعودیہ)

اسی طرح مترجم غنیۃ الطالبین نفیس اکیڈمی کراچی کی طرف سے طبع شدہ میں شفیق بریلوی جو بریلوی حضرات کے اہم شمار کئے جاتے ہیں، اس نے حضرت جیلانیؒ مرحوم کے شروع میں حالات لکھے ہیں اور ان کی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے غوث اعظم کی تصانیف میں غنیۃ الطالبین اور فتوح الغیب بہت مشہور ہے اسی طرح نفیس اکیڈمی کے مالک محمد سلیم نے بھی ان کے حالات پر کچھ لکھا ہے۔ (غنیۃ الطالبین ۱/ ۴)

ان کی تصانیف بہت ہیں مگر ان کی تعداد آٹھ تک ملتی ہیں ۔۱۔ غنیۃ الطالبین ۔۲۔ فتوح الغیب ۔ ۳۔ جلاء الخاطر ۔۴۔ مواہب الربانیۃ وغیرہ) (غنیۃ الطالبین ۱/ ۶)

دائرہ معارف میں حضرت پیر جیلانی کی تفسیر کا بھی ذکر کیا ہے بنام "عمدہ تفسیر" کا قلمی نسخہ جو حضرت کی طرف منسوب ہے مگر بستانی کے قول کے مطابق درست نہیں ہے۔ (دائرہ ۱۲/ ۹۳۲)

شفیق بریلوی جو بریلوی مکتبہ فکر کے آدمی ہیں۔

وہ خود تحریر کرتے ہیں کہ

غوث الاعظم کے ملفوظات تصانیف و تالیفات کی تعداد بہت ہے ان میں الفتح الربانی، فتوح الغیب اور غنیۃ الطالبین بہت مشہور ہیں اسی صفحہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظم نے غنیۃ الطالبین میں پیدائش سے موت اور ازل سے ابد تک پیش آنے والے تمام ضروری مسائل و امور کے بارے میں مکمل ہدایات مرتب فرمادی ہیں۔ (غنیۃ الطالبین مترجم کراچی نفیس اکیڈمی ۲/ ۱)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی :۔ جو پاک و ہند کے بہت بڑے مصنف و مفسر اور صاحب قلم گزرے ہیں انہوں نے حضرت شیخ کا تعارف لکھا ہے وہ تحریر کرتے ہیں کہ انہوں نے متعدد تصانیف چھوڑیں جن میں سے غنیۃ الطالبین ۔۲۔ فتوح الغیب ۳/ الفتح ربانی ۳/ جلاء الخاطر ۵/ یواقیت والحکم وغیرہ۔

انہوں نے لکھا ہے کہ یہ سب نام پروفیسر مار گو-تھ نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۔ آرٹیکل عبدالقادر کے تحت درج کئے ہیں۔ (غنیۃ الطالبین مترجم ۱/ ۷)

بریلوی مولوی جس کی زبان اور قلم کفر میں بہت تیز تھی جس نے محمد علی جناح، حالی و نظامی، علامہ اقبال وغیرہ کو کافر قرار دیا وہ اپنی تصنیف میں لکھتا ہے کہ شیخ صاحب نے غنیۃ الطالبین شریف تصنیف فرمائی اور مسلمان کہلوانے والوں میں جس قدر گمراہ، بدمذہب، مرتد فرقے اس وقت تک پیدا ہو چکے تھے ان سب کے عقائد

دوسرا:۔

یہ اعتقاد رکھنا کہ عمل ایمان کا جز نہیں لیکن ثواب اور عقاب اس پر مرتب ہے

کفر وضلال کو نقل کیا ہے۔ (تجانب اہل سنت صفحہ ۲۳۳)

غنیۃ کے مختلف تراجم میں شیخ جیلانیؒ کا تعارف لکھا ہوا ہے ہر ایک نے غنیۃ کو حضرت کی کتاب قرار دیا ہے امان اللہ خان ارمان سرحدی نے لکھا ہے کہ آپ کی تصانیف میں غنیۃ الطالبین کے علاوہ اور بھی چند کتابیں ہیں (غنیۃ مترجم امان اللہ خان سرحدی مطبوعہ دہلی: ۴۸)

اسی کتاب کے صفحہ ۵۰ پر لکھا ہے "آغاز کتاب" شیخ جیلانیؒ لکھتے ہیں کہ میں نے کار ثواب سمجھ کر اور اخروی کامیابی کی امید پر ایسی کتاب لکھنے کا پختہ ارادہ کیا اور غنیۃ الطالبین اس کا نام رکھا۔ (صفحہ ۵۰ دہلی کراچی صفحہ ۱۹)

غنیۃ الطالبین کا دوسرا ایک مترجم لکھتا ہے اور اس میں شمس صدیقی بریلوی کا تعارف حضرت شیخ پر ہے کہ تحریر کرتے ہیں کہ حضرت غوث اعظم کی اہم تصنیف غنیۃ الطالبین جو ۱۲۸۸ھ کو پہلی بار مصر میں طبع ہوئی، اس کا فارسی ترجمہ سب سے پہلے عبدالحکیم سیالکوٹی نے کیا جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے معاصرین میں سے ایک ممتاز مقام رکھتے تھے اردو میں غنیۃ کا ترجمہ سب سے پہلے نول کشور نے عربی اردو کے ساتھ طبع کیا اس کے مترجم مولانا محبوب الدین و جمال احمد صاحبان تھے۔ (غنیۃ مترجم: ص ۳۳، ۳۴ طبع انڈیا دہلی)

اسی طرح کراچی سے غنیۃ کا ترجمہ سید عبدالدائم جلالی کا طبع ہوا اس میں شیخ کا تعارف کچھ یوں لکھا ہے کہ یہ پوری کتاب حضرت شیخ عبدالقادر کی تصنیف ہے اہل تحقیق نے اس پر اتفاق نہیں کیا لیکن یہ بات بہر حال محقق ہے کہ حضرت شیخ کی طرف اس کتاب کا انتساب بالکل غلط نہیں سیاق عبارت ترتیب معانی پر حکمت بے باکانہ موعظت اور زور خطابت شیخ کا ہے ہاں باعث مباحث خصوصاً دوزخ کی تفصیل و حالت کے متعلق احادیث منقولہ کو الحاقی اور موضوع کہا جا سکتا ہے اتباع امام ابوحنیفہ کو گمراہ فرقوں میں شمار کرنا بھی اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے کیونکہ آپ کا مسلک فقہ حنبلی اور عقائد محدثین تھے (غنیۃ دار الاشاعت کراچی ص ۱۵ مترجم جلالی طبع: ۱۹۹۰ء)

مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی غنیۃ الطالبین کا ترجمہ کیا ہے اس میں ہے کہ غنیۃ شیخ عبدالقادر کی تصنیف ہے اور اس میں مختلف دینی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ منجملہ دیگر مباحث کے ۷۳ اسلامی فرقوں کی تفصیل بہت دلچسپ ہے۔ شیخ محدث نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا تھا جو اب دستیاب نہیں ہے مولوی عبدالحیی فرنگی محلی نے اپنی بعض تصانیف میں اس ترجمہ کا حوالہ دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ان کے پیش نظر تھا۔ (حیات شیخ عبدالحق دہلوی: ص ۱۷۸)

یہ بھی یاد رہے کہ تقریباً اول ترجمہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ہے اسی دور میں شیخ عبدالحق دہلوی صاحب نے بھی ترجمہ کیا کیونکہ شیخ عبدالحق کی وفات ۱۰۵۰ھ ۱۶۴۲ء اور سیالکوٹی بعد میں

اور دونوں میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کا مرجیہ کے خطا کار ہونے پر اجماع ہے کہ ثواب و عذاب عمل پر مرتب ہوتا ہے پس صحابہ و تابعین کا مخالف بے شک گمراہ اور مبتدع ہے اور دوسرے مسئلہ پر سلف کا اجماع ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ دلائل متعارض ہیں۔ بعض آیات واحادیث اور آثار اس معنی پر دلالت کرتے ہیں کہ ایمان غیر عمل ہے بہت سے دلائل اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ: ایمان کا اطلاق قول و عمل کے مجموعہ پر آتا ہے اور یہ نزاع لفظی معلوم ہوتا ہے کہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ: عاصی ایمان سے خارج نہیں ہوتا اگرچہ عذاب کا مستحق ہے اور جو دلائل اس پر دال ہیں کہ ایمان چیزوں کے

۱۰۶۷ھ۔ ۱۶۵۶ء فوت ہوئے گویا یہ دونوں معاصر ہیں جبکہ شیخ عبدالحق محدث نے غنیتہ کا ترجمہ بھی کیا اور شیخ جیلانیؒ کی کتاب کا انکار بھی کیا ہم کہتے ہیں جب ان کی تصنیف ہی نہ تھی تو کیا ضرورت تھی ترجمہ کرنے کی اور ملاں عبدالحکیم نے کسی جگہ بھی انکار نہیں کیا۔

شیخ عبدالحق کا یہ کہنا کہ یہ تصنیف حضرت جیلانیؒ کی نہیں حقائق اس کا ساتھ دیتے نظر نہیں آتے احناف کا شروع سے یہ وطیرہ رہا ہے بلکہ اب تو ایک قاعدہ کی شکل اختیار کر چکا ہے ہر وہ بات جو ہمارے مذہب کے خلاف ہو یا تو ہم اس کی تاویل کریں گے یا منسوخ سمجھیں گے۔ پاک و ہند کے احناف نے تو سرے سے بعض کتب کا انکار ہی کر دیا مثلاً مولوی احمد رضا صاحب جو بریلوی مشرب کے بہت بڑے عالم تصور کئے جاتے ہیں وہ انگریز کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ اہل حدیث (وہابی) سے سخت حسد رکھتے تھے انہوں نے ہر وہ بات کی کہ جس سے اہل حدیث ختم ہو کے رہ جائیں مگر اللہ تعالیٰ جس کو قائم دائم رکھنا چاہے کون ختم کر سکتا ہے مولوی احمد رضا کی ایک کتاب جس کا نام کلمۃ حق ہے اس میں انگریز کو خراج تحسین پیش کیا گیا اب یہ حضرات اس کتاب کا انکار کرتے ہیں کہ ان کی کتاب ہی نہیں بلکہ فہرست بھی خارج کر دی گئی ہے ہم یہ باور کروانا چاہتے ہیں کہ اس کتاب کا حوالہ بریلوی مرحوم اور مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم میں خیالات و عقائد کے لحاظ سے بعد المشرقین تھا مگر جھد حریت کے خلاف تحریک خلافت کے دور میں دونوں بزرگ متفق ہو گئے تھے کلمۃ حق میں مولانا نے اسی پر تبصرہ فرمایا ہے (باغی ہندوستان ص ۲۲۴) آج کل بھی بریلوی حضرات غنیتہ کا انکار کرتے نظر آئیں گے مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی حضرت شیخ عبدالقادر حنبلی مسلک رکھتے تھے بلکہ بعض نے تو لکھا ہے وہ اس مسلک سے بھی کنارہ کش ہو گئے تھے ان کا مقام مجتہد کا ہو گیا تھا بریلوی حضرات کیوں اس کو خواہ مخواہ اپنے کھاتے میں ڈالتے ہیں اگر وہ لکھتے ہیں کہ حنفیہ فرقہ مرجیہ ہے تو چیخ و پکار کرتے نظر آتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے یہ سب کچھ پیٹ کا دھندہ ہے اللہ بچائے رکھے آج کل تو حنفی حضرات نے بڑے شور و غل سے اس بات کا انکار کیا ہے کہ یہ غوث صاحب کی کتاب نہیں ہے ہم عرض کرتے ہیں جناب من جب پیر صاحب کا تعلق حنبلی مشرب سے ہے آپ کیوں ان کی وکالت کرتے ہیں۔ [جاوید]

مجموعے ہے کا نام ہے تھوڑی سی توجہ سے ان کو ظاہر سے پھیرنا ممکن ہے۔ انتہی

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ علیہ رحمۃ اللہ کی اصحاب ابوحنیفہ سے مرجہ ہونے کی مراد شق ثانی ہے اور اس پر کچھ غبار نہیں۔ اگرچہ دلائل میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل حدیث کا مذہب راجح ہے یعنی ایمان[1]، اقرار و تصدیق اور عمل کے مجموعے کا نام ہے، یہی قول قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ کا مالابد میں ہے سو کوئی اشکال باقی نہ رہا۔

واللہ اعلم

[1] جامعہ سلفیہ بنارس (ہند) کے استاد جناب رئیس احمد ندوی حفظہ اللہ نے اللمحات الباری الی ما انواری الباری من الظلمات کے نام سے کتاب تحریر کی ہے جس میں احناف کا چہرہ دکھایا گیا ہے یہ کتاب ہر اہل علم کے علاوہ مفید عام ہے۔ [جاوید]

حضر میں جمع بین الصلوٰتین کا حکم

سوال:

جمع بین الصلوٰتین فی الحضر کی حدیث صحیح ہے یا نہیں اور اس جمع کا کیا حکم ہے؟

جواب:۔

امام ترمذیؒ نے کہا: تمام روایات جو اس کتاب میں ہیں وہ معمول بہا ہیں اور ماسوا روایتوں کے علماء نے اسے اختیار کیا اور ان پر عمل کیا ہے۔

ایک حدیث:۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ظہر اور عصر، مغرب وعشاء کو بغیر خوف اور سفر کے جمع کیا۔[1]

دوسری حدیث:۔

إِذَا شَرِبَ الْخَمْرَ فَاجْلِدُوْهُ فَإِنْ عَادَ فِي الرَّابِعَةِ فَاقْتُلُوْهُ۔

یعنی جب کوئی شراب پئے تو اسے کوڑے مارو اور جب چوتھی بار پئے تو اسے قتل کر ڈالو۔[2]

اور اس حدیث پر اہل علم کا عمل نہ کرنا اس لئے ہے کہ اس کا منسوخ ہونا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے۔ اس لئے کہ ترمذی نے حدیث مذکور کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ، ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا اس نے چوتھی بار شراب پی تھی تو آپ نے اسے مارا اور قتل نہ کیا۔ اور

---

[1] مسلم ۱/۴۹۱ [2] تحفۃ الاشراف ۲/۳۷۳۔ ترمذی ۴/۴۹۔ والبانی/۱۴۸۴۔ ابن ماجہ ۲/۸۵۹ فوائد عبدالباقی مصابیح السنۃ ۲/۵۴۴۔ حاکم ۴/۳۷۳۔ کنز العمال ۵/۳۵۵

اسی کی مثل ابوداؤد اور ترمذی نے قبیصہ بن ذویب کی حدیث سے نقل کیا اور اس میں ہے کہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہی شخص لایا گیا یعنی چوتھی بار، تو آپ نے اسے کوڑے مارے اور قتل کو منسوخ کر دیا۔ اور امام احمد کی روایت میں حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یوں آیا ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نشے والا لایا گیا تو چوتھی بار آپ نے اس کا رستہ چھوڑ دیا۔

اہل علم کے اتفاق سے منسوخ حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں۔ رہی پہلی حدیث وہ اس لفظ سے بھی وارد ہوئی ہے "مِن غَيرِ خَوفٍ وَلَا سَفَر" یعنی بغیر خوف اور سفر کے۔ اور اس لفظ سے بھی آئی ہے "مِنْ غَيْرِ خَوْفٍ وَلَا مَطَر" یعنی بلا خوف اور بغیر بارش کے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے کہا کہ تینوں (لفظ) اکٹھے (یعنی خوف، مطر اور سفر) کسی حدیث کی کتاب میں ایک ہی روایت میں نہیں آئے بلکہ مشہور "مِنْ غَيرِ خَوْفٍ ولاسَفَر" ہے۔ انتہی۔

اور حدیث کا آخر یہ ہے کہ: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جمع کرنے سے کیا مراد تھی؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ کیا کہ امت کو حرج نہ ہو۔ اور اس حدیث کو طبرانی نے اوسط اور کبیر میں، ہیثمی نے مجمع الزوائد میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی ان الفاظ سے نقل کیا ہے:

جَمَعَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم بَيْنَ الظُّهرِ وَالْعَصْرِ وَالْمَغرِبِ وَالعِشَاءِ - فَقِيلَ لَهُ فِي ذٰلِكَ قَالَ: صَنَعْتُ ذٰلِكَ لِئَلَّا يَحْرُجَ أُمَّتِي۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر، مغرب اور عشاء کو جمع کیا تو آپ سے اس کا سبب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ میری امت پر حرج نہ ہو۔

---

[1] فتح الباری ۵۲۳/۱۳۔ مسلم ۴۹۰/۱۔ نصب الرایہ ۱۹۳/۲

جمع بین الصلوٰتین والی حدیث کی اسنادی حیثیت :۔

مذکورہ بالا حدیث کی سند میں عبدالقدوس کا بیٹا ضعیف ہے لیکن اس کا ضعف اس وجہ سے مدفوع ہے کہ اس میں کلام اس سبب سے ہے کہ وہ ضعفاء سے روایت کرتا ہے، اور دوسرا اس وجہ سے کہ وہ شیعہ ہے۔ پہلے سبب کا کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اس حدیث کو ضعیف سے روایت نہیں کیا بلکہ اعمش سے روایت کیا ہے، جیسا کہ ہیثمی نے کہا، اور دوسری وجہ کا بھی کچھ اندیشہ نہیں ہے جب تک حد معتبر سے تجاوز نہ کرے اور یہ بات اس سے منقول نہیں۔ حالانکہ بخاریؒ نے اس کے حق میں کہا کہ: وہ بڑا سچا ہے اور ابن ابی حاتم نے کہا اس کا کوئی ڈر نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب یہ حدیث صحیح مسلم اور ابن ماجہ وغیرہ ہما میں مروی ہے تو اس کی صحت میں کلام نہیں۔ اور جو لوگ اس حدیث کی دلیل سے مطلقاً جمع کے جواز کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں جمع اس شرط سے جائز ہے کہ، عادت نہ ڈالے۔ فتح الباری میں ہے: اس کے قائلین میں سے ابن سیرینؒ، ربیعہؒ، ابن منذرؒ اور قفالؒ کبیر ہیں اور خطابی نے اہل حدیث کی ایک جماعت سے اس کو نقل کیا ہے۔ اور جمہور کہتے ہیں کہ جمع بلا عذر جائز نہیں، اور بحر میں بعض اہل علم سے بیان کیا ہے کہ، یہ اجماع ہے۔

حدیث جمع کی توجیہات :۔

اور اس حدیث جمع کے کئی جواب دیئے ہیں:

اول:۔ کہ یہ جمع مرض کے سبب سے تھی اور امام نوویؒ نے اس کو قوی کہا۔ اور حافظ (ابن حجرؒ) نے کہا، کہ اس میں نظر ہے۔ اس لئے کہ یہ اگر مرض سے ہوتی تو چاہئے تھا کہ اس نماز میں مریض کے سوا کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہ ہوتا، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ اصحاب کے ساتھ تھا۔ اور ابن عباسؓ نے اپنی روایت میں اس کی تصریح کی ہے۔

دوم:۔ کہ یہ جمع کرنا ابر میں تھا، جب ظہر ادا کر چکے تو ابر کھل گیا۔ سو معلوم ہوا کہ عصر

کا وقت آ گیا تو عصر بھی پڑھ لی۔ امام نوویؒ نے کہا کہ یہ باطل ہے، کیونکہ اگر اس میں کچھ احتمال ہو سکتا ہے تو بھی وہ ظہر اور عصر میں ہے نہ کہ مغرب اور عشاء میں۔ (مسلم مع نووی طبع کراچی ۲۴۵/۱) لیکن حافظ نے کہا کہ، دوسرے میں احتمال کا نہ ہونا اس امر پر مبنی ہے کہ مغرب کا ایک ہی وقت ہے، حالانکہ مذہب مختار اس کے خلاف ہے، یعنی مغرب کا وقت عشاء کے وقت تک باقی رہتا ہے اور اس تقدیر پر احتمال قائم ہے۔

سوم:۔ کہ یہ جمع صوری تھی کہ ظہر کو اخیر وقت میں اور عصر کو اول وقت میں ادا کیا۔ امام نوویؒ نے کہا کہ یہ احتمال ضعیف ہے یا باطل، اس لئے کہ ظاہر کے مخالف ہے۔ حافظؒ نے کہا: قرطبی نے اس احتمال کو پسند نہیں کیا، اور امام الحرمین نے اسے ترجیح دی۔ اور قدما میں سے ابن ماجشونؒ اور طحاویؒ نے اس کے ساتھ جزم کیا اور امام ابن سید الناسؒ نے اسے قوی کہا۔ اس لئے کہ ابوالشعثاء حسنیؒ نے اس حدیث کو ابن عباس سے روایت کیا وہ اسی کا قائل ہے۔

بدر تمام شرح بلوغ میں کہا: اس حدیث سے حضر میں جمع کے جواب پر حجت لینا جائز نہیں کیونکہ اس حدیث میں کوئی تعیین نہیں کہ جمع تاخیر مراد ہے یا جمع تقدیم، چنانچہ امام مسلمؒ کی روایت سے بھی یہی ظاہر ہے اور دونوں میں سے ایک کو خود معین کر لینا تحکم ہے، سو اس سے اعراض واجب ہے۔

اور حدیث اوقات کو معذور اور غیر معذور کیلئے عام رکھنا واجب ہے، اور مسافر کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس کا مخصص ثابت ہو گیا ہے اور یہی جواب اعتراض کو اصل سے اکھیڑنے والا ہے۔ اور جو کچھ صحابہ و تابعین سے مروی ہے وہ حجت نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔

راجح مذہب:۔

بعض حضرات نے اس کی تاویل ~~جمع صوری سے~~ کی ہے ~~اور~~ یہ تاویل درست

اور متعین ہے، کیونکہ نسائی نے ابن عباسؓ کی اصل حدیث میں اس کی تصریح کی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمِ بِالْمَدِيْنَةِ ثَمَانِيًا جَمْعًا وَسَبْعًا أَخَّرَ الظُّهْرُ وَ عَجَّلَ الْعَصْرَ وَأَخَّرَ الْمَغْرِبَ وَعَجَّلَ الْعِشَاءَ۔[1]

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ میں آٹھ رکعت، ظہر وعصر، اور سات رکعت مغرب وعشاء کی جمع کر کے پڑھی، ظہر کو مؤخر کیا اور عصر کو معجل، مغرب کو موخر اور عشاء کو معجل کیا۔

پس خود ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو اس حدیث کے راوی ہیں، گویا اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ جمع صوری تھی۔ اور عجب ہے کہ امام نوویؒ نے اس تاویل کو ضعیف کہا اور مروی حدیث کے متن سے غافل رہے، اور جب ایک قصہ میں ہو، مطلق روایت میں مقید محمول ہوتا ہے جیسا کہ یہاں ایک ہی واقعہ میں ہے۔ انتہی کلام البدر۔

اور سبل السلام شرح بلوغ المرام میں کہا: یہ کلام قوی ہے اور ہم نے اس کے قریب قریب اپنے رسالے ''الیواقیت فی المواقیت'' میں ذکر کیا۔ انتہی[2]

حافظ ابن حجرؒ نے کہا: یہ بات جمع صوری کی تقویت دیتی ہے کہ اس حدیث کے سب طرق میں وقت جمع کا کوئی ذکر نہیں، یا مطلق پر محمول ہوگی تو اس سے نماز کا وقت محدود سے نکال دینا لازم آتا ہے یا اس صفت مخصوص پر محمول کیا جائے جس سے نماز کا وقت سے نکالنا لازم نہیں آتا، اور متفرق احادیث کو اس تاویل سے جمع کیا جائے تو اس لحاظ سے جمع صوری پر منطبق کرنا بہتر ہے۔ واللہ اعلم، انتہی

شوکانی نے دراری مضیہ میں کہا: اگر جمع صوری پر محمول کیا جائے تو درحقیقت جمع نہیں، اس لئے کہ ہر نماز اپنے وقت مقررہ میں پڑھی گئی، بلکہ صورت میں جمع ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ میں بغیر بارش[3] اور سفر کے جمع کرنے

---

۱ مسلم ۱/۲۹۱، نسائی سلفیہ ۱/۶۹ ۲ سبل السلام ۲/۴۴ ۳ مسلم ۱/۲۴۶، موطا ۱/۱۴۴، نیل ۳/۲۲۹، ۲۲۶

سے متعلق بعض روایات میں اس کی تصریح آئی ہے کہ یہ جمع صوری تھی۔اور ہم نے ایک مستقل رسالہ میں اس کی توضیح کی۔

اور بلا عذر جمع کے جواز میں اختلاف ہے،اور حق یہ ہے کہ جائز نہیں اور وقت پر ادا کرنا واجب ہے،اس لئے کہ نماز وقت پر ادا کرنے کے بارے میں صحیح امر آ چکے ہیں اور غیر وقت محدود میں پڑھنے میں نہی وارد ہو چکی ہے۔انتہی

نیل الاوطار میں ہے کہ:ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث جمع صوری پر محمول کرنے کی تائید کرتی ہے جسے امام مالکؒ نے مؤطا میں،بخاری،ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا کہ:میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر وقت میں نماز پڑھتے نہیں دیکھا ماسوا مزدلفہ میں جہاں دو نمازیں،مغرب و عشاء جمع کیں اور اس دن کی فجر اپنے پہلے ہی (یعنی معتاد) وقت پر ادا کی۔

اس حدیث میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مطلق جمع کی نفی کی،اور مزدلفہ کی جمع میں حصر کیا۔حالانکہ خود ابن مسعود رضی اللہ عنہ مدینہ میں جمع کرنے کی حدیث کے رواۃ میں سے ہیں۔سو اس میں اس امر پر دلالت ہے کہ جو جمع مدینہ میں واقع ہوئی وہ صوری تھی اور اگر وہ جمع حقیقی ہیں تو دونوں روایتیں متعارض ہو جائیں گی،اور قاعدہ یہ ہے کہ جب تک جمع ممکن ہو اس کی طرف رجوع واجب ہے۔اور اس کی مؤید ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جس کو ابن جریر نے روایت کیا۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آتے تو ظہر کی تعجیل اور عصر کی تاخیر کر کے دونوں کو جمع کر لیتے اور اسی طرح مغرب میں دیر کر کے عشاء کو جلدی کر کے ان دونوں کو جمع کر لیتے اور یہ جمع صوری ہے۔اور ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی انہیں حضرات میں سے ہیں جنہوں نے مدینہ میں جمع کرنے کو روایت کیا۔

چنانچہ مصنف عبدالرزاق نے یہ بات انہیں سے روایت کی،اور لفظ جمع سے جو معنی مراد ہیں یہ روایات اس کی تعیین کرتی ہیں،اس لئے کہ اصول میں یہ ثابت ہو چکا

ہے کہ لفظ جمع بین الظہر والعصر دونوں کے وقتوں میں عام نہیں۔ چنانچہ مختصر المنتہی اور اس کی شرح غایت اور اس کی شرح وغیرہ اصول کی کتابوں میں ہے، بلکہ اس کا مدلول لغت کی رو سے ہیئت اجتماعیہ ہے اور یہ جمع تقدیم، جمع تاخیر اور جمع صوری میں موجود ہے، مگر یہ نہیں کہ یہ سب کو یا دو دو شامل ہو، کیونکہ فعل سب اقسام میں عام نہیں ہوتا، چنانچہ ائمہ اصول نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ سو ان مذکورہ صورتوں سے ایک صورت بلا دلیل متعین نہیں ہو سکتی اور یہ دلیل اس بات پر قائم ہے کہ جمع جو اس حدیث میں مذکور ہے وہ جمع صوری ہے تو اس کی طرف رجوع لازمی ہے۔ انتہی۔[1]

اس کے بعد حافظ ابن حجر اور متاخرین کا بسط سے جواب دیا ہے (جنہوں نے کہا کہ جمع صوری شرع میں نہیں آئی اور راوی کا قول "لایحرج امته" جمع صوری پر محمول کرنے سے مانع ہے) اس کے بعد کہا کہ: ان دلائل میں سے جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ متنازع فیہ جمع بلا عذر جائز نہیں۔ ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ جَمَعَ بَيْنَ الصَّلٰوتَيْنِ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ فَقَدْاَتٰى بَابًا مِنَ الْكَبَائِرِ[2]

جس نے دو نمازوں کو بغیر عذر کے جمع کیا تو وہ کبیرہ گناہوں کے دروازوں میں سے ایک دروازے میں داخل ہوا۔

---

[1] نیل الاوطار ۳/۲۱۹ [2] حاکم ۱/۲۷۵۔ بیہقی ۳/۱۶۹۔ تمہید ۵/۷۷۔ طبرانی ۱۱/۱۷۲۔ قال دارقطنی حنش هذا ابو علی الرجی متروک ۱/۳۹۵) ابن کثیر ۱/۴۸۴۔ قال ترمذی وهو حنش بن وهو ضعیف عنداهل الحدیث ضعفه احمد وغیره قال البخاری احادیثه منکره ولا یکتب حدیثه۔ ترمذی احمد شاکر ۱/۳۵۶۔ امام شوکانی اس حدیث کو موضوع میں شمار کیا ہے۔ فوائد۔ ۱۵ اور عقیلی نے ولہ غیر حدیث لا یتابع علیه ولا یصرف الابه۔ عقیلی ۱/۲۴۸۔

نصب الروایہ میں حنش بن قیس کے متعلق لکھا ہے کہ امام احمدؒ نے متروک اور ابن حبان نے ضعفاء میں شمار کیا ہے۔ نصب الرایہ ۲/۱۹۶۔ ابن حبان ۱/۲۴۳ امام ذہبی نے میزان میں لکھا کہ حسین بن قیس۔ ابو علی و لقبہ حنش۔

قال ابوزرعہ وابن معین ضعیف۔ وقال نسائی = لیس بثقة۔ قال مرة متروک۔ قال السعدی احادیثه منکره جدا ومن مناکیره عن عکرمة، عن ابن عباسؓ تہذیب ۲/۳۶۴ = المیزان ۱/۵۴۶ [جاوید]

اس کی اسناد میں حنش بن قیس ہے اور وہ ضعیف ہے اور انہی دلائل میں سے ترمذی کا قول سنن کے اخیر کتاب العلل میں ہے آلخ یعنی اس کتاب کی تمام روایات دو کے علاوہ معمول بہا ہیں۔ پھر شوکانی نے کہا کہ: تجھ پر مخفی نہ رہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اور جمہور کے اس پر عمل نہ کرنے سے اس کی صحت میں تو کوئی نقصان نہیں مگر اس سے استدلال قائم نہیں ہو سکتا۔ اور بعض علماء نے اس پر عمل کیا ہے جو ذکر ہو چکا ہے اگرچہ ترمذی کے کلام سے یہ ظاہر ہے کہ: اس پر کسی نے عمل نہیں کیا لیکن دوسروں کی کلام سے بعض اہل علم کا عمل کرنا ثابت ہوتا ہے، مثبت نافی پر مقدم ہوتا ہے۔

سو اولی یہ ہے کہ اعتماد اس پر کیا جائے جس کو ہم نے پہلے ذکر کیا، یعنی جمع سے مراد جمع صوری ہے بلکہ اسی کا قائل ہونا لازمی ہے جیسا کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں۔ اور ہم نے اس سے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام "**تشنیف السمع بابطال أدلة الجمع**" رکھا جو اس پر واقف ہونا چاہیے، اس کی طرف رجوع کرے۔

اور علامہ ابوالبرکات مجد الدین ابن تیمیہ حرانیؒ نے **المنتقی**[1] میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث کے بعد کہا:

میں کہتا ہوں: اس حدیث کے مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بارش، خوف اور مرض کے لئے جمع جائز ہے اور اس حدیث کے ظاہر منطوق پر باقی رہے گا اور مستحاضہ کے لئے جمع کے جائز ہونے میں صحیح حدیث وارد ہوئی ہے جبکہ مستحاضہ بھی ایک قسم کا مرض ہے۔ موطا میں امام مالکؒ نے نافع سے روایت کیا کہ جب امیر بارش کی وجہ سے مغرب اور عشاء کو جمع کرتے تو ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ جمع کر لیتے۔ اور اثرم نے اپنی سنن میں ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا کہ: یہ سنت سے ہے کہ بارش

---

[1] طبع پاکستان، لاہور ص ۹۷۷، یہ کتاب اب ۲ جلدوں میں ترجمہ کے ساتھ مکتبہ سلفیہ لاہور نے طبع کر دی ہے اس کے مترجم مولانا محمد داود راغب رحمانی م ۱۹۷۷ء مرحوم ہیں۔ [جاوید]

کے روز مغرب اور عشاء کو جمع کر لیا جائے۔ انتہی۔

حاصل کلام:۔

غرضیکہ اس باب کی احادیث کو جمع کرنے اور علماء کے مذاہب کی تتبع کے بعد یہ امر ثابت اور منقح ہوا کہ:

حضر میں بلا عذر جمع بین الصلوتین کرنا بالاجماع ناجائز ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو منقول ہے وہ جمع صوری پر محمول ہے، اور جن علماء نے حضر میں بلا عذر جمع کو جائز کہا ان کے نزدیک یہ شرط ہے کہ اس کو عادت نہ بنایا جائے۔ سو مذہب جمہور پر عمل کرنا ہی لازم و متعین ہوا۔ واللہ اعلم

(واللہ الموفق)

زمان ومکان اور حال کے اختلاف کے باعث فتویٰ میں تبدیلی کرنا

سوال:

کسی جگہ لکھتے ہیں کہ: نصوص شرعیہ کے خلاف حکم اور فتویٰ دینا حرام ہے، اور نص کی موجودگی میں اجتہاد و تقلید ساقط اور بے اعتبار ہے۔ اور کسی جگہ لکھتے ہیں کہ: باعتبار اختلاف زمان و مکان اور حال کے فتوی میں تغیر روا ہے کہ شریعت کی بنا مصالح اور حکمتوں پر ہے۔(وضاحت مطلوب ہے)

جواب:

نص شرعی کے خلاف فتویٰ دینا حرام ہے:

شق اول جمہور علمائے دین کے نزدیک متفق علیہ ہے اور اس باب میں بہت سی کتابیں اور رسالے تصنیف ہوئے ہیں جیسا کہ حافظ ابن القیم کی بڑی بڑی دو جلدوں میں تصنیف "اعلام الموقعین من رب العالمین"[1] فلانی کی "ایقاظ ھمم اولی الابصار" سید احمد قنوجی کی "حدیث الاذکیاء" شیخ محمد حیات سندھی مدنی کی "تحفۃ الانام" سید محمد امیر یمنی کی "ارشاد النقاد" اور "قول مفید" امام شوکانی کی "ادب الطلب" اور "منتہی الارب" نیز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی "عقد الجید" اور "انصاف" اور ان کے سوا مزید کتابیں بھی ہیں۔

---

[1] اب یہ کتاب چار جلد میں مکتبہ قدوسیہ سے مطبوع ہے اور اس کا ترجمہ بھی بازار سے عام مل رہا ہے مترجم خطیب الہند مولانا محمد جونا گڑھی ہیں جو تفسیر ابن کثیر کے اولین مترجم ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ جات میں اختیار ہے:

دوسری شق ساقط ہے، مگر یہ کہ تغیرِ فتویٰ سے مراد، قضا میں باعتبار احوال و زمان کے تغیر ہو۔ چنانچہ تفہیمات میں کہا کہ ''مجھے یہ بات معلوم کرائی گئی کہ شریعت میں رائے دینا تحریف اور قضا میں عمدہ ہے۔ انتہی

اور اس میں شک نہیں کہ اگر اس باب میں نص صریح موجود نہیں تو جھگڑوں کے فیصلہ کرنے میں قضا، قاضی کی رائے پر ہے۔ حجۃ اللہ البالغۃ[1] میں مصالح اور شرائع کے مابین فرق کے بیان میں ایک مستقل باب باندھا اور اس کی مثالیں ذکر کی گئی ہیں، اس مقام کی تفصیل وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ اور امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا امت کے بعض امور میں دخل دینا اپنی طرف سے حکم معین کرنے کے لئے نہ تھا بلکہ مشورہ کے طور پر تھا اور وہ بھی نزول وحی اور صدورِ حکم نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے تھا۔ چنانچہ موافقات عمر رضی اللہ عنہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں سو جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدوینِ نصوص اور صحت کے بعد، معارضۂ نسخ کے بغیر اس کی مخالفت میں مصلحت دیکھے اور ان کے برخلاف حکم کرے وہ کھلا منافق ہے۔ ہاں! البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشاد جو بطریق مشورہ اور مصلحت کے تھے ان میں اتباع کرنا واجب نہیں۔ اسی لئے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مخالفت کرنے والے پر انکار نہیں کیا جیسا کہ بریرۃ رضی اللہ عنہا کے قصہ میں ہے کہ جب اس نے اپنے شوہر مغیث کو آزاد کے بعد ترک کر دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارش اور مصلحت کے طور پر اس سے کہا: وہ تیرے بیٹے کا باپ ہے۔ تو بریرۃ نے جواباً کہا کہ، اگر آپ امر و حکم کے طور پر فرماتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں ورنہ میں اسے نہیں چاہتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں! میں سفارش کے طور پر کہتا ہوں اور احادیث کے تتبع کرنے والے پر اس قصہ کی نظریں مخفی نہیں۔

نیز امت کے سلف اور ائمہ سے اس قسم کی مصلحت بینی، احوال، زمان و مکان

[1] حجۃ اللہ مترجم کراچی ۲۳۵۱ پر یہ بحث ہے۔

کی تغیر سے جس سے سنن صریحہ اور نصوص صحیحہ نبویہ کے فتوی میں تغیر کرنے کی مخالفت لازم آئے منقول نہیں ہے، بلکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہتی تھیں کہ: اگر اس زمانہ کی عورتوں کا حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے تو ان کے مسجدوں میں نکلنے کا حکم ہرگز نہ دیتے۔ او کما قال۔ یعنی اس زمانہ میں عورتوں کا مسجدوں میں آنے سے بڑا فساد ہے اور دل نہیں چاہتا کہ یہ آئیں اور فتنہ فساد پیدا ہو، مگر کیا کیا جائے کہ شارع علیہ السلام کا حکم یہی ہے اور اس مسئلہ کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

زمین کے طبقات اور ہر طبقہ میں نوع انسانی اور انبیاء کی بعثت کی حقیقت

سوال:

ایک شخص کہتا ہے کہ زمین کے سات طبقے ہیں اور ہر طبقے میں سات طبقوں میں سے نوع انسان اور ان کے پیغمبر اس پہلے طبقے کے پیغمبروں کی طرح آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک موجود ہیں اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اوپر والے طبقے کے پیغمبروں کے خاتم ہیں اسی طرح چھ خاتم الانبیاء اور زمین کے چھ طبقات میں موجود ہیں۔ اور دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے لیتا ہے جو "اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (طلاق:۱۲)" کی تفسیر میں ان سے مروی ہے:

فِی كُلِّ اَرْضٍ اٰدَمُ كَاٰدَمِكُمْ وَنُوْحٌ كَنُوْحِكُمْ وَاِبْرَاهِيْمُ كَاِبْرَاهِيْمِكُمْ وَعِيْسٰى كَعِيْسَاكُمْ وَنَبِيٌّ كَنَبِيِّكُمْ۔[1]

یعنی ہر زمین میں تمہارے آدم کی طرح ایک آدم ہے اور تمہارے نوح کی طرح ایک اور نوح ہے اور تمہارے ابراہیم کی طرح ایک ابراہیم ہے اور تمہارے عیسیٰ کی طرح ایک عیسیٰ ہے اور ایک نبی تمہارے نبی کی طرح ہے۔[2]

اور تفسیر جلالین کی اس عبارت سے جو آیت "يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ" کے

---

[1] فتح الباری ۲۹۳/۶ ... ابن کثیر ... ۳۸۵/۴

ذیل میں امر کی تفسیر وحی کے ساتھ کر کے لکھی ہے وہ عبارت یہ ہے: "يَنْزِلُ بِهٖ جِبْرِيْلَ مِنَ السَّمَاءِ السَّابِعَةِ إِلَى الْأَرْضِ السَّابِعَةِ"[1] یعنی جبرائیل علیہ السلام وحی لیکر ساتویں آسمان سے ساتویں زمین تک اترتے ہیں۔ اور کہتا ہے کہ: اصول فقہ کے اس قاعدے کہ "خبر احاد سے آیت کی تخصیص جائز ہے یہ آیت " وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" کی مخصص ہے یہ مسئلہ کس طرح سے ہے بیان فرمائیں؟

جواب:

زمین کے سات طبقات کی دلیل:

زمین کا آسمانوں کی طرح سات طبقے ہونا آیت مذکورہ سے بلاشبہ ثابت ہے، اور مکمل آیت قرآن مجید کے اٹھائیسویں پارے کی سورہ طلاق میں اس طرح ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (طلاق:۱۲)

اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور اس کے مثل زمین بھی۔ اس کا حکم ان کے درمیان اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو باعتبارِ علم گھیر رکھا ہے۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع حدیث جو بخاری میں ہے:

مَنْ ظَلَمَ قِيْدَ شِبْرٍ مِنَ الْاَرْضِ طُوِّقَهُ مِنْ سَبْعِ اَرَضِيْنَ[2]

جو کوئی کسی کی زمین سے بالشت بھر ظلم سے لے گا ساتوں زمینوں میں سے اتنی زمین اسکے گلے میں طوق بنا کر ڈال دی جائے گی۔

اور سالم کی حدیث اپنے باپ سے مروی ہے انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] جلاء العینین ص ۴۷۶ [2] فتح الباری: ۲۹۲/۶، مسلم: ۳۳/۱۲، ابن کثیر ۳۹۴/۴

مَنْ أَخَذَ شَيْئًا مِنَ الْأَرْضِ بِغَيْرِ حَقِّهِ خُسِفَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى سَبْعِ أَرَضِيْنَ[1]

جو شخص زمین سے کچھ ناحق حاصل کر لے تو قیامت کے دن اس کو ساتوں زمینوں تک دھنسایا جائے گا۔

یہ دونوں حدیثیں بھی زمین کے سات طبقات ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

طبقات ارض کی کیفیت:

امام شوکانی نے تفسیر[2] آیت مذکورہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ: اس آیت میں اس بات کی تصریح ہے کہ آسمان سات ہیں لیکن زمین کی تعداد میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے "وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ" تو بعض نے کہا "مثلھن" سے مراد تعداد میں آسمان کی مانند ہونا ہے۔ اور بعض نے کہا: موٹائی زمین، آسمان کی مثل ہونا مراد ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ زمینیں بھی آسمان کی طرح سات ہیں۔ اور یہ مضمون صحیح حدیث سے ثابت ہو چکا ہے ۔امام رازی کہتے ہیں: حق یہ ہے کہ عدد مخصوص کا ذکر کرنا زائد پر دلالت نہیں کرتا۔[3]

اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جسے حکماء نے ذکر کیا ہے کہ، زمینیں سات سے زیادہ ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول سے ہمارے اس ساتھ کے عدد کے سوا کچھ ثابت نہیں سو ہم اسی پر اقتصاد کرتے ہیں اور اضافے کو اس وقت تک نہیں مانتے جب تک شروع کے طریق سے ثابت نہ ہو اور شرع میں زائد کا کچھ ذکر نہیں، کلام الشوکانی، اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔

ضحاک اور بعض متکلمین نے کہا کہ: یہ سات طبقے آپس میں ملے ہوئے ہیں ان میں فاصلہ نہیں ہے اور ساتوں زمینیں تو برتو ہیں۔ اور بعض نے سات زمیوں کی تاویل سات ولائتوں اور سات سیاروں وغیرہ سے کی۔ چنانچہ فتح الباری میں ابن تین سے نقل کیا۔[4] اور قسطلانی اور کمالین میں انہی اقوال کو ذکر کیا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ

---

[1] فتح الباری ۲۹۳/۶، مسلم ۳۳/۱۲ [2] فتح القدیر ۲۴۰/۴ [3] تفسیر رازی ۲۳۰/۸ [4] فتح الباری ۲۹۳/۶

ساتوں طبقے جدا جدا ہیں اور ہر زمین میں اتنی اتنی مسافت ہے جتنی زمین اور آسمان میں ہے ۔چنانچہ امام احمد ،ترمذی اور نسائی کی روایات اس پر دلالت کرتی ہیں ور تاویلات مذکورہ کا قول قرآن و حدیث سے مردود ہے۔[1] جیسے ابن تین اور قرطبی وغیرہ ائمہ نے کہا ہے۔

زمین کے طبقات میں نوع بشر اور انبیاء کا عدم وجود:۔

لیکن آیت اور احادیث مذکورہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زمین کے طبقات میں سے ہر طبقہ میں نوع بشر اور ان کے انبیاء موجود ہیں۔ بلکہ قرآن مجید اور حدیث شریف میں جو کہ مدارِ اثبات ونفی ، ردّ و قبول اور ہر چیز سے متعلق عقیدہ و عمل وغیرہ، اور انہیں میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش جن کی ہم اولاد ہیں ان کے بہشت میں داخل کرنے زمین پر بھیجنے اور فرشتوں کا ان سے سجدہ کروانے کا واقعہ مذکور ہے، اور دوسرے آدموں، ان کی ذریت ، باقی طبقات کے پیغمبروں اور ان کی امتوں کے حالات و قصے مذکور نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ دوسرے نوع انسان ، ان کے آدموں اور خواتین العلمین کی بو تک قرآن و حدیث کی دلالۃ النص تو کیا بلکہ اشارۃ النص سے بھی نہیں پائی جاتی ۔اور حدیث کی تمام کتب ،صحاح ،سنن ، معاجم اور مسانید وغیرہ، ان عالموں اور آدموں کے بیان سے خالی ہیں۔کوئی ضعیف حدیث بلکہ موضوع بھی اس باب میں اس تفصیل سے جو سوال میں گزری ہے اسلام کی معتبر کتب میں نہیں پائی جاتی ،مرفوع حدیث کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

اگرچہ بمضمون آیت :" وَمَایَعْلَمُ جُنُودَرَبِکَ اِلَّا ھُو o" (مدثر:۳۱)اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔اس مخلوقات موجودہ محسوسہ میں عالم کا حصر نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ بموجب فرمان واجب الاذعان "اَوَلَیْسَ الَّذِی خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقَادِرٍ عَلٰی اَنْ یَخْلُقَ مِثْلَھُمْ بَلٰی وَھُوَ الْخَلَّاقُ

---

[1] تفسیر قرطبی ۲۸ /۱۷۵

الْعَلِيْمُ" (یٰسین:۸۱) ترجمہ: کیا جس (اللہ) نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس میں اتنی قدرت نہیں کہ ان جیسے (آدمی دوبارہ پیدا کر دے کیوں نہیں وہ بڑا پیدا کرنے والا بڑے علم والا ہے۔

اور بحکم

إِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا۔ (انسان:۲۸)

اور ہم جب چاہیں ان کے عوض ان جیسے اوروں کو بدل لائیں۔

یعنی اس عالم جیسے صد جہاں بلکہ کل ممکنات کے پیدا کرنے پر قادر ہے. جمل حاشیہ جلالین میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (طلاق:۱۲) کے ذیل میں جو آیت مذکورہ کی جز ہے، لکھا ہے: یعنی اللہ تعالیٰ، قدیر، کامل قدرت والا ہے، پس اس جہاں جیسا اور جہان، اور اس سے بھی عجیب جہاں اور بے انتہاء عوالم عمدہ سے عمدہ پیدا کر سکتا ہے، اور اس دعویٰ کی دلیل اس جہاں کا پیدا کرنا ہے کیونکہ جو ذات ایک ذرہ کو عدم سے پیدا کرنے پر قادر ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اس سے ادنیٰ چیز اور اسی جیسی اور اس سے عمدہ اور عمدہ سے عمدہ بے انتہاء چیزیں پیدا کر لے اس لئے پیدا کرنے میں تھوڑے اور بہت، اچھے اور برے میں فرق نہیں۔

مَا تَرٰى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۝ (ملک:۳)

"کیا رحمن کے بنانے میں کچھ فرق دیکھتا ہے۔"

لیکن قدرت کے عام ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ بالفعل خارج میں واقع ہوں۔ کیونکہ ماتریدیہ کے نزدیک قدرت اور تکوین متغائر دو صفتیں ہیں اور قدرت کا اثر یہ ہے کہ مقدور کا قادر سے بالنظر الی ذاتہ صادر ہونا ممکن ہے، یہ ضروری نہیں کہ مقدور بالفعل واقع بھی ہو، اور تکوین کا اثر مکون کا بالفعل واقع اور موجود ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ زمین کے باقی چھ طبقات میں اس جہاں کی مثل اور جہانوں کے خارج میں موجود ہونے کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر نہیں دی اور جس چیز پر کلام الٰہی اور سنت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ناطق نہیں تو ایک مومن مسلمان کے اس کو اپنی طرف سے ثابت

کرنے کے کیا معنی؟ سو جو اس کا مخالفت دلائل رکھتا ہو وہ اس کی وضاحت کرے۔ وَدُوْنَهٗ خَرْطُ الْقَتَادِ۔

اور اجماع و قیاس جو کہ اکثر اہل علم کے نزدیک اصول اربعہ میں سے ہیں اس مسئلہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں اس لئے کہ یہ مسئلہ "بلب بدء الخلق" سے ہے اور اس میں قیاس و اجتہاد کا کوئی دخل نہیں۔ قیاس اور تخمین بلکہ خود اجماع و اجتہاد ان جیسے مسائل میں کسی حکم کا اثبات نہیں کرسکتے، کیونکہ ان کے لئے بھی قرآن و سنت سے کوئی سہارا درکار ہے بلکہ قرآن مجید میں سموات کی جمع اور ارض کے مفرد لانے سے اس فرمان الٰہی کی مثل: "خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ" کو چھوڑ کر ساتوں زمینوں میں دوسرے عالموں، آدموں اور خواتیم کے نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے، سو اس مسئلہ کا ثبوت شرع کے چاروں دلائل میں سے کسی دلیل سے نہیں ہوسکتا۔

حضرت ابن عباس کی طرف منسوب روایت کے دس جوابات:

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو کہ سوال میں مذکور ہے:

اول:

تو اس میں کلام ہے کہ: یہ حدیث نہیں بلکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اثر ہے یعنی ان کا قول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں۔ اور مانحن فیہ میں حجت پیغمبر معصوم اور مخبر صادق کا قول محکم ہوسکتا ہے نہ کہ صحابہ و مَن بعدھم کے اقوال! خصوصاً جبکہ نص صحیح پر کتاب و سنت سے اس کا اعتماد نہ ہو۔

دوم:

یہ کہ صرف ابن عباس رضی اللہ عنہ اس تفسیر میں متفرد ہیں، صحابہ و تابعین میں سے اس قول میں ان کا کوئی موافق نہیں اور کبھی حکم شرعی کی بنا متفرد روایت اور قول شاذ پر نہیں ہوسکتی۔

سوم:

یہ کہ قرآن مجید کی تفسیر جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے اکثر کی سند ان کی بارگاہِ بلند تک متصل اور مسلسل نہیں پہنچتی۔ اکثر میں یہ بات ہے کہ ان کی طرف صرف منسوب ہے اور حقیقت میں یہ کسی اور کی تفسیر ہے، اسی لئے محققین اہل تفسیر اس پر پورا اعتماد نہیں کرتے، اور دوسرے ائمہ فن کی شہادت کے بغیر اسے قبول نہیں کرتے۔ ہاں! جو ابن عباسؓ سے صحیح بخاری وغیرہ میں صحیح سندوں سے ثابت ہو گیا وہ بہرحال مقبول ہے اور اس اثر کا ان کتب صحاح اور سنن میں کوئی پتہ ونشان نہیں۔

چہارم:

یہ کہ اس اثر کا متن مضطرب ہے جو سوال میں مذکور ہے، وہ حاکم کے نزدیک اس اثر سے مروی ہے اور عبد بن حمید اور ابن المنذر کے نزدیک اس لفظ سے ہے:

مایومنک ان اخبرک بھا فتکفر۔

یعنی تجھے کس چیز نے اس سے بے خوف کیا کہ اگر میں تجھے اس آیت کی تفسیر کردوں تو تو انکار کردے۔

اور ابن خزیمہ کے نزدیک اس لفظ سے مروی ہے:

لو حدثتکم بتفسیر ھا لکفرتم و کفرکم تکذیبکم بھا۔

اگر تم کو اس کی تفسیر سناؤں تو تم منکر ہو جاؤ اور تمہارا انکار اس کا نہ ماننا ہے۔

اور اضطراب روایت بھی اکثر اہل علم کے نزدیک جرح کا سبب ہے۔

پنجم:

یہ کہ اس اثر کے روایت کرنے والوں سے کسی نے اس کو صحیح نہیں کہا بجز حاکم کے مستدرک میں۔ اور حاکم کی تصحیح دوسرے فن کے اماموں کی شہادت کے سوا علمائے حدیث کے نزدیک مقبول نہیں۔ بستان المحدثین میں ہیکہ: بہت سی وہ احادیث جن کو

حاکم نے مستدرک میں ان کی صحت کا حکم لگایا اور صحیحین کی احادیث کی مانند سمجھا اس کو بڑے علماء نے خطا کی جانب منسوب کیا اور اس کا انکار کیا۔ اس لئے امام ذہبی نے کہا: کہ کسی کو یہ جائز نہیں کہ حاکم کی تصحیح پر مغرور ہو جب تک وہ میرے تعقبات اور تلحیقات نہ دیکھ لے۔ انتہی

یہ حاکم کی مرفوع روایات کا حال ہے صحابہ کے آثار کا تو ذکر ہی کیا۔ اور خصوصاً اس اثر کے بارے میں سیوطی نے تدریب الراوی شرح تقریب النووی میں کہا کہ: حاکم کے اس اثر کو صحیح کہنے سے مجھے ہمیشہ تعجب آتا رہا، یہاں تک کہ میں نے بیہقی کو دیکھا کہ اس نے بھی اس کے حق میں کہا کہ: اس کی اسناد صحیح ہے لیکن نہایت شاذ ہے۔ انتہی۔ غالباً بیہقی نے حاکم کے اعتماد پر اس کو صحیح کہہ دیا ہوگا مع ہذا اس میں شذوذ کی علت کو ثابت کر دیا اور کہا کہ مجھے اس روایت میں ابوالضحی کا کوئی متابع معلوم نہیں۔

اور اسی کی مثل شوکانی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا، تو شذوذ اور عدم متابعت کی وجہ سے اس اثر کی قوت کمزور ہوگئی اور بطورِ احتجاج کے ناقابلِ حجت رہا۔

ششم:

یہ کہ محققین اہل تفسیر اور اہل حدیث کے نزدیک یہ اثر اسرائیلیات سے ماخوذ ہے جیسا کہ ابن کثیر نے کہا۔ اور اسرائیلی روایت تصدیق اور قبول کے قابل نہیں اور اس پر ایسے احکام کی بنا نہیں ہو سکتی۔

ہفتم:

یہ کہ بہت کم مفسرین نے اس اثر کو آیت کریمہ کی تفسیر میں نقل کیا اور اکثر مفسرین نے اس کی پرواہ نہیں کی اور یہ دلیل اس اثر کے غیر مقبول اور غیر معتبر ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ اور کچھ مفسرین نے اس کو ذکر بھی کیا اور انہوں نے بھی اس سے اَوَادِم[1] اور خَوَاتم کے وجود پر دلیل نہیں لی، بلکہ صرف زمین کے سات طبقے ہونے کی تائید میں

---

[1] آ، وادم آدم کی جمع خواتم، خاتم کی جمع جو کہ خاتم النبیین میں ہے۔ [خلیق]

لائے ہیں پس مطلوب ثابت نہ ہوا اور جو ثابت ہے وہ مطلوب نہیں۔

ہشتم:

یہ کہ اگر اس اثر کو صحیح بھی مان لیں، تب بھی مجمل غیر مبین ہے، اس سے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ چھ طبقوں کے اوادم وخواتم زمانہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام اور زمانہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر تھے یا ان کے زمانہ یا ان کے زمانہ کے بعد ہوں گے اور مجمل روایت بدون بیان محل قبول اور با اعتماد نہیں۔

نہم:

یہ کہ اس کو صحیح تسلیم کرنے کے بعد بھی علماء نے اس کی تاویل کی ہے۔

قسطلانی کی رائے:

ارشاد الساری شرح صحیح البخاری میں بیہقی کا قول نقل کر کے رقمطراز ہیں کہ:

اس میں یہ بحث ہے کہ اسناد کی صحت سے متن کی صحت لازم نہیں آتی۔ جیسا کہ اس فن کے ماہرین کے ہاں معروف ہے۔ سو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سند صحیح ہوتی ہے اور متن میں شذوذ ہوتا ہے، یا ایسی علت جو اس کی صحت میں خارج ہے اور ایسے (یعنی عقائد کے) مسائل ضعیف احادیث سے ثابت نہیں ہو سکتے۔ اور اگر اس کی نقل کو صحیح مانا جائے تو اس پر محمول ہوگا کہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے اسرائیلیات سے اخذ کیا ہے۔ اور اگر اس کے ثبوت کو مان لیا جائے تو احتمال ہے کہ اس کا یہ معنی ہو کہ، وہاں جن لوگوں کی اقتداء کی جاتی ہے وہ ان ناموں سے موسوم ہیں اور وہ رسولوں کے رسول ہیں جو جنوں کو اللہ کے پیغمبروں کی طرف سے تبلیغ احکام کرتے ہیں اور ہر ایک اس نبی کے نام سے بلایا جاتا ہے جس کی طرف سے تبلیغ کرتے ہیں۔ انتھی کلام القسطلانی

تو جب یہ ثابت ہوگیا کہ اس اثر، یعنی اس کے متن کے صحیح ہونے میں، بلکہ سند کے صحیح ہونے میں بھی کلام ہے تو اس سے استدلال درست نہ ہوا اور ایسے مسائل کے ثابت کرنے کے لئے روشن دلیل اور نصِ جلی چاہیے، ایسی جگہ مظنونات اور محتملات

سے کام نہیں چلتا۔ اسی لئے ابن کثیر نے اس اثر کو امام ابنِ جریرؒ کی طرف منسوب کر کے کہا: کہ یہ اور اس کی امثال جب ان کی سند معصوم (صلی اللہ علیہ وسلم) تک صحیح طور سے نہ پہنچے، تو انہیں مسترد کر دیا جاتا ہے، انتھی۔ ابن کثیر

دہم:

کہ روایت کی صحت میں شرط ہے کہ راوی ضابط ہو۔ اور عطاء بن سائب جس اثر کو ابوالضحیٰ سے ابن عباس سے روایت کرتا ہے نوویؒ نے شرح مسلم کے خطبہ میں اس کو اہل اختلاط سے شمار کیا۔ غرض کہ اس اثر میں جرح کے اسباب جیسے شذوذ اور عدمِ متابعت اور راوی کا اختلاط وغیرہ کثرت سے موجود ہیں، اور اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ ایک ضعیف اثر ہے جسے فحول علماء نے قبول نہیں کیا۔ پس ایسے بے پتے اثر پر کسی حکم کی بنا نہیں ہو سکتی، لیکن صاحب جلالین کا قول:

يَنْزِلُ بِهِ جِبْرَئِيْلُ مِنَ السَّمَاءِ السَّابِعَةِ اِلَى الْاَرْضِ السَّابِعَةِ۔[1]

''جرائیل علیہ السلام وحی کو لے کر ساتویں آسمان سے ساتویں زمین تک اترتے ہیں۔''

جس سے ظاہر میں تو اثر مذکور کی طرف کچھ اشارہ نکلتا ہے سو شیخ سلیمان جمل نے جلالین کے حاشیہ میں قول مذکور کے تحت لکھا ہے کہ ملا علی قاری نے کہا: ہم نے مفسرین میں سے اور کسی کا یہ قول نہیں پایا، جس نے اس امر کی تفسیر ''وحی'' کے ساتھ کی، اس نے ''بینھن'' کی تفسیر میں کہا: (اس اوپر کے درمیان جو پہلی ہے اور ساتویں آسمان کے درمیان جو سب سے اوپر ہے۔ اور ملا علی قاری کا یہ کہنا اس پر مبنی ہے کہ وحی تکلیف بالا حکام ہو اور وحی سے یہی معنی مراد لینا ضروری نہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ وحی سے وحی النصرف فی الکائنات مراد لیں، خطیب اور اکثر کی عبارت اس پر دلالت کرتی ہے کہ: وحی سے مراد ''قضا اور قدر'' ہے تو اس تفسیر پر ''بینھن'' سے اقصیٰ زمین کے

---

[1] جلالین: ۲/ ۴۷۶ طبع مصر، سورت طلاق

درمیان جو سب سے نیچے ہے اور ساتویں آسمان کے درمیان جو سب سے اوپر ہے) مراد ہے۔ سو اللہ تعالیٰ کا امر اور قضا ان میں جاری ہے اور اس کا حکم ان کے درمیان نافذ ہے۔ انتھی۔[1]

اور اسی طرح قتادہؒ نے کہا، اس کی زمینوں میں سے ہر زمین میں اور آسمانوں سے ہر آسمان میں اس کی مخلوقات میں سے ایک نوع کی مخلوق ہے اور اس کے امر میں سے ایک امر ہے اور اس کی قضا میں سے ایک قضا ہے۔[2]

امام بغوی کی تفسیر میں ہے: امر سے مراد وہ ہے، اللہ تعالیٰ جو ان کے درمیان عجائبات تدبیرات کو ایجاد کرتا ہے۔ مثلاً بارش اتارتا ہے، گھاس اگاتا ہے، دن اور رات لاتا، گرمی و جاڑا ظاہر کرتا، حیوانات مختلف صورتوں میں پیدا کرتا اور ان کو ایک حال سے دوسرے حال میں نقل کرتا ہے۔ انتھی۔

تفسیر رازی اور خازن میں بھی اس کی مثل لکھا ہے۔ اور یہی جمہور مفسرین کا قول ہے۔[3]

تو خلق و امر، قضا و قدر اور مختلف شکلوں والے حیوانات کے ہونے سے یہ متعین نہیں ہوتا کہ خلق اور حیوان بھی نوع انسان اور ان کے پیغمبر ہیں، بلکہ اگر ''امر'' کی تفسیر وحی کے ساتھ ثابت ہو جائے تو وحی سے مراد ''الہام'' ہو گا چنانچہ آیت:

وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ۔ (نحل:٦٨)

''اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو حکم بھیجا۔''

کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے وہ وحی اصطلاحی مراد نہیں۔ اور آیت کریمہ سے یہ بات صریح ثابت ہوتی ہے کہ اس سے آسمان اور زمین کی تخلیق اور ان میں اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کا جاری ہونا، ان میں عرشِ الٰہی سے لیکر نیچے کی زمین تک اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عام ہونے اور اس کے علم کا تمام مخلوقات کو محیط ہو جانے کا بیان مقصود ہے، نہ کہ وجود نوع انسانی اور ان کے پیغمبروں کا زمین کے طبقات کے

---

[1] خازن ۴/۳۷۷، ۳۷۸ [2] خازن ۴/۳۷۸ [3] قرطبی ۲۸/۱۷۶، تفسیر بغوی مع ابن کثیر ۸/۲۰۱

نیچے ہونا مراد ہے۔

اس لئے متقدمین اور متاخرین میں سے کسی نے آیت مذکورہ کی یہ تفسیر نہیں کی۔ بجز ابن عباس رضی اللہ عنہ کے جس کی سند اور متن کا حال اوپر معلوم ہو چکا ہے اور اثر کی کیا حقیقت ہے کہ اس سے ایسے حکم اخذ کئے جائیں۔ ایسے مقام میں تو پیغمبر معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث درکار ہے نہ کہ اثر موقوف جس کا اعتبار نہ ہو۔

خبرِ احاد سے آیت کی تخصیص کا مفہوم:

اور جو سوال میں مذکور ہے کہ آیت کی تخصیص خبر احاد سے جائز ہے اس کا جواب یہ ہے کہ: خبر احاد سے مراد جو آیت کی مخصص ہو سکتی ہے وہ مرفوع صحیح حدیث ہے نہ کہ اثر موقوف ضعیف، اسی لئے اصول فقہ کی کتابوں میں خبر احاد کی بحث کو، احتجاج بہ سنت کی قسم میں جو کتاب کے مقابل ہے، ذکر کرتے ہیں اور اس کی مثال میں صحیحین کی احادیث کا پتہ دیتے ہیں اور اس اثر کا سنن کی کسی کتاب میں نشان تک نہیں، چہ جائیکہ صحیحین میں ہوں۔ اور بالفرض اگر تسلیم کر بھی لیا جائے تو تب بھی اس اثر میں اور آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ (احزاب/۴۳) میں کوئی اختلاف نہیں، تاکہ اسے اس کا مخصص مان لیا جائے۔ اسی لئے کہ زمین کے اوپر کے طبقہ کے رسولوں کا ثبوت آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم النبیین صلی اللہ علیہم و آلھم و اصحابھم اجمعین تک جمہور اہل علم بلکہ سب اہل اسلام کے نزدیک متفق علیہ ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طبقہ کے سب رسولوں کا خاتم ہونا نص مذکور کے حکم سے ثابت ہے چنانچہ جمع کا صیغہ یعنی ''نبیین'' اور اس پر الف لام استغراق کا داخل ہونا اس معنی کا فائدہ پہنچاتا ہے، اور دوسرے آدموں اور خاتموں کا وجود ثابت نہیں۔ اور نص مذکور کے مدلول پر سب مجتہدین کا بلکہ تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے پس آدموں اور خاتموں کا زمین کے باقی طبقوں میں ثابت کرنا شرح کا حکم نہیں اور اس قول پر کوئی علمی دلیل موجود نہیں ہے۔

اور اہل اصول میں سے کوئی اس بات کا قائل نہیں کہ نصوص کی تخصیص آثار

موقوف سے ہو سکتی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ایسے مسائل میں خوض و تعمق کرنا غلو ممنوع بلکہ فضول کلام، لغو قول اور حدیث خرافہ کے باب سے ہے۔ سو اس کا قائل اور اس میں خوض کرنے والا قابل التفات نہیں ہے۔[1]

و باللہ التوفیق و ھو المستعان ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم وھو اعلم بالصواب و فوق کل ذی علم علیم۔

---
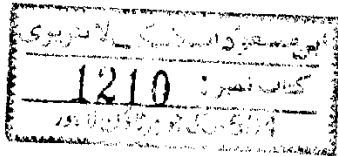
[1] مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ تحریر کرتے ہیں کہ دینی مسائل بھی اکثر خبر واحد سے ہم تک پہنچے ہیں۔ اور دنیا کے بیشتر اطلاعات میں بھی خبر واحد ہی کارفرما ہے۔
حکومت سے لیکر عوام الناس تک اگر خبر واحد پر اعتماد کرنا ترک کر دیں تو کاروبار کا پورا کارخانہ برباد اور تباہ ہو کر رہ جائے۔
دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ اگر خبر واحد شرعاً معتبر نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر ضرور کوئی نہ کوئی پابندی لگائی جاتی۔ (حجیت حدیث ص ۱۱۲-۱۱۱)
مولانا مناظر احسن گیلانی نے خبر واحد کو حجت قرار دیا ہے۔ (مذہبی افسانہ بندیاں)
امام ابن حزم نے لکھا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں خبر واحد بلا انکار قبول کی جاتی تھی، اہل سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ سب اسے قبول کرتے تھے۔ پہلی صدی کے بعد متکلمین اور معتزلہ نے اس میں اجماع امت کی مخالفت کی۔ (الاحکام الاحکام ۱/۱۱۳) [جاوید]